اُمُّ الکتاب

تفسیر سورۃ فاتحہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۝ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۝
مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ۝ اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ
نَسْتَعِیْنُ۝ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ۝ صِرَاطَ
الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ۝ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ
عَلَیْھِمْ۝ وَلَا الضَّآلِّیْنَ۝

مولانا ابوالکلام آزاد

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱﴾ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿۲﴾ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ﴿۳﴾ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ﴿۴﴾ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ﴿۵﴾ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ﴿۷﴾

مولانا ابوالکلام آزادؒ

لاہور

باذوق لوگوں کے لئے
پیاری کتابیں
خوبصورت کتابیں

نام کتاب : اُمّ الکتاب تفسیر سورۃ فاتحہ
مصنف : مولانا ابوالکلام آزادؒ
اہتمام : میاں وقار احمد کھٹانہ
ناشر : مکتبہ جمال • لاہور
مطبع : تایا سنز پرنٹرز • لاہور
اشاعت : 2013ء
قیمت : 300 روپے

مکتبۂ جمال
تیسری منزل حسن مارکیٹ اردو بازار لاہور
Cell: 0300-8834610 Ph: 042-37232731
maktabajamal@yahoo.co.uk
mjamal09@gmail.com

انتساب

غالباً دسمبر ۱۹۱۸ء کا واقعہ ہے کہ میں رانچی میں نظر بند تھا، عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر مسجد سے نکلا تو محسوس ہوا کوئی شخص پیچھے آ رہا ہے، مڑ کر دیکھا تو ایک شخص کمل اوڑھے کھڑا تھا۔

آپ مجھ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں؟

ہاں جناب! میں بہت دور سے آیا ہوں۔

کہاں سے؟

سرحد پار سے۔

یہاں کب پہنچے؟

آج شام کو پہنچا، میں بہت غریب آدمی ہوں، قندھار سے پیدل چل کر کوئٹہ پہنچا، وہاں چند ہم وطن سوداگر مل گئے تھے، انہوں نے نوکر رکھ لیا اور آگرہ پہنچا دیا۔ آگرے سے یہاں تک پیدل چل کر آیا ہوں۔

افسوس تم نے اتنی مصیبت کیوں برداشت کی؟

اس لئے کہ آپ سے قرآن مجید کے بعض مقامات سمجھ لوں۔ میں نے ''الہلال'' اور ''البلاغ'' کا ایک ایک حرف پڑھا ہے۔

یہ شخص چند دنوں تک ٹھہرا اور پھر یکا یک واپس چلا گیا۔ وہ چلتے وقت اس لئے نہیں ملا کہ اسے اندیشہ تھا میں اسے واپسی کے مصارف کے لئے روپیہ دوں گا اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کا بار مجھ پر ڈالے۔ اس نے یقیناً واپسی میں بھی مسافت کا بڑا حصہ پیدل طے کیا ہوگا۔ مجھے اس کا نام یاد نہیں (۱) مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ زندہ ہے یا نہیں، لیکن اگر میرے حافظے نے کوتاہی نہ کی ہوتی تو میں یہ کتاب اس کے نام سے منسوب کرتا۔

۱۲ر ستمبر سنہ ۱۹۳۱ء

کلکتہ

ابوالکلام

---

(۱) مولوی دین محمد قندھاری

اِنتساب

غالباً دسمبر ۱۹۱۸ء کا واقعہ ہے کہ میں رانچی میں نظر بند تھا۔ عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر مسجد سے نکلا تو مجھے محسوس ہوا، کوئی شخص پیچھے آرہا ہے۔ مڑ کر دیکھا تو ایک شخص کمبل اوڑھے کھڑا تھا:

"آپ مجھ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں؟"

"ہاں جناب، میں بہت دور سے آیا ہوں۔"

"کہاں سے؟"

"سرحد پار سے"

"یہاں کب پہنچے؟"

"آج ہی شام کو پہنچا۔ میں بہت غریب آدمی ہوں۔ قندھار سے پیدل چل کر کوئٹہ پہنچا۔ وہاں چند ہم وطن سوداگر مل گئے تھے۔ انہوں نے نوکر رکھ لیا، اور آگرہ پہنچا دیا۔ آگرہ سے یہاں تک پیدل چل کر آیا ہوں۔"

"افسوس، تم نے اتنی مصیبت کیوں برداشت کی؟"

"اس لیے کہ آپ سے قرآن مجید کے بعض مقامات سمجھ لوں۔ میں نے الہلال اور البلاغ کا ایک ایک حرف پڑھا ہے۔"

یہ شخص چند دنوں تک ٹھہرا، اور پھر یکایک واپس چلا گیا۔ وہ چلتے وقت اس لیے نہیں ملا کہ اسے اندیشہ تھا، میں اسے واپسی کے مصارف کے لیے روپیہ دوں گا، اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کا بار مجھ پر ڈالے۔ اس نے یقیناً واپسی میں بھی مسافت کا بڑا حصہ پیدل طے کیا ہوگا۔

مجھے اس کا نام یاد نہیں۔ مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ زندہ ہے یا نہیں۔ لیکن اگر میرے حافظہ نے کوتاہی نہ کی ہوتی، تو میں یہ کتاب اس کے نام سے منسوب کرتا۔

۱۲ ستمبر ۱۹۳۱ء

فہرست مضامین

عرض ناشر

قرآن مولانا ابوالکلام آزادؒ کے مطالعہ کا محور و مرکز رہا ہے۔ آپ کی تفسیر ترجمان القرآن جدید تفسیری ادب میں ایک ممتاز و منفرد مقام رکھتی ہے۔ آپ کی زندگی میں یہ دو جلدوں میں شائع ہوئی تھی۔ جلد اول سورۃ فاتحہ کی تفسیر ہے۔ سورۃ فاتحہ کو قرآن کا قلب کہا جاتا ہے۔ یہ تفسیر ام الکتاب کے نام سے الگ بھی شائع ہوتی رہی ہے۔

سات آیات کی یہ سورت انسان کو اللہ کی حمد و ثنا سکھانے کے بعد اس کے ذہن میں ''رب العالمین'' کی پروردگاری، رحمت اور عدالت کا تصور پیدا کرتی ہے۔ پھر انسان ''عبادت و استعانت کو صرف ایک ہی ذات سے وابستہ کر کے'' سیدھی راہ چلنے کی توفیق مانگتا ہے۔ وہ راہ جو گمراہوں کی نہیں ہے اور نہ کسی خاص نسل و قوم سے تعلق رکھتی ہے۔ گویا وہ تمام انسانیت کی راہ ہوگی۔ یہ سورۃ فاتحہ کی تفسیر کا خلاصہ ہے اور دعوت قرآنی کی اصل روح یہی ہے۔

ام الکتاب کی مقبولیت کی وجہ سے مختلف ناشر اسے اپنے اپنے انداز میں شائع کرتے رہے ہیں۔ ستم ظریفی تو یہ ہے کہ بعضوں نے تسہیل و تفہیم کے نام پر حضرت مولاناؒ کی تحریر میں ترامیم اور اضافے بھی کیے ہیں جو یقیناً قابل تحسین نہیں۔

مکتبہ جمال کا یہ مشن ہے کہ حضرت مولانا ؒ کی تصانیف اور دیگر تحریروں کو پورے اہتمامِ صحت کے ساتھ دلکش انداز میں قارئین کی خدمت میں پیش کرے۔ چنانچہ موجودہ ایڈیشن میں مولانا ؒ کی اصل تحریر کو برقرار رکھا گیا ہے، قرآنی آیات کو اعراب کے ساتھ پیش کیا گیا ہے اور آخر میں اشاریہ دیا گیا ہے تاکہ اس کی افادیت میں اضافہ ہو۔ انسانی کاموں میں ہمیشہ بہتری کی گنجائش رہتی ہے۔ قارئین کرام ہمیں ہماری کوتاہیوں سے مطلع فرما سکیں تو ادارہ بے حد شکر گزار ہوگا اور ان شاء اللہ آئندہ ایڈیشن کو مزید بہتر بنانے کا اہتمام کر سکے گا۔

(میاں مختار احمد کھٹانہ)

۱-الفاتحہ

مکیة وھی سبع آیات

سورۃ فاتحہ - مکی - سات آیتیں

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اللہ کے نام سے جو الرحمٰن اور الرحیم ہے

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۝ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝

ہر طرح کی ستایشیں[۱] اللہ ہی کے لئے ہیں جو تمام کائنات خلقت کا پروردگار ہے[۲] جو رحمت والا ہے اور جس کی رحمت تمام مخلوقات کو اپنی بخششوں سے مالا مال کر رہی ہے جو اس دن کا مالک ہے جس دن کاموں کا بدلا لوگوں کے حصے میں آئے گا[۳]۔ (خدایا!) ہم صرف تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور صرف تو ہی ہے جس سے (اپنی ساری احتیاجوں میں) مدد مانگتے ہیں[۴]۔ (خدایا!) ہم پر (سعادت کی) سیدھی راہ کھول دے۔ وہ راہ جو ان لوگوں کی راہ ہوئی جن پر تو نے انعام کیا۔ ان کی نہیں جو پھٹکارے گئے اور نہ ان کی جو راہ سے بھٹک گئے[۵]

تفسیر سورہ فاتحہ

(۱)

سورت کی اہمیت اور خصوصیات

یہ قرآن کی سب سے پہلی سورت ہے، اس لئے "فاتحۃ الکتاب" کے نام سے پکاری جاتی ہے۔ جو بات زیادہ اہم ہوتی ہے قدرتی طور پر پہلی اور نمایاں جگہ پاتی ہے۔ یہ سورت قرآن کی تمام سورتوں میں خاص اہمیت رکھتی تھی، اس لئے قدرتی طور پر اس کی موزوں جگہ قرآن کے پہلے صفحے ہی میں قرار پائی۔ چنانچہ خود قرآن نے اس کا ذکر ایسے لفظوں میں کیا ہے جس سے اس کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے۔

وَلَقَدْ اٰتَیْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِیْمَ (۱۵:۸۷)

اے پیغمبر یہ واقعہ ہے کہ ہم نے تمہیں سات دہرائی جانی والی چیزیں عطا فرمائیں اور قرآن عظیم۔

احادیث وآثار سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ اس آیت میں "سات دہرائی جانے والی چیزوں" سے مقصود یہی سورت ہے، کیونکہ یہ سات آیتوں کا مجموعہ ہے اور ہمیشہ نماز میں دہرائی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس سورت کو "السبع المثانی" بھی کہتے ہیں[۱]۔

احادیث وآثار میں اس کے دوسرے نام بھی آئے ہیں، جن سے اس کی خصوصیات کا پتہ چلتا ہے، مثلاً ام القرآن، الکافیہ، الکنز، اساس القرآن[۲]۔

عربی میں "ام" کا اطلاق تمام ایسی چیزوں پر ہوتا ہے جو ایک طرح کی جامعیت رکھتی ہوں یا بہت سی چیزوں میں مقدم اور نمایاں ہوں۔ یا پھر کوئی ایسی اوپر کی چیز ہو جس کے نیچے اس کے بہت سے توابع ہوں۔ چنانچہ سر کے درمیانی حصے کو ام الراس کہتے ہیں، کیونکہ وہ

دماغ کا مرکز ہے۔ فوج کے جھنڈے کو ام کہتے ہیں، کیونکہ تمام فوج اسی کے نیچے جمع ہوتی ہے۔ مکہ کو ام القریٰ کہتے تھے، کیونکہ خانہ کعبہ اور حج کی وجہ سے عرب کی تمام آبادیوں کے جمع ہونے کی جگہ تھی۔ پس اس سورت کو ام القرآن کہنے کا مطلب یہ ہوا کہ یہ ایک ایسی سورت ہے جس میں مطالب قرآنی کی جامعیت اور مرکزیت ہے۔ یا جو قرآن کی تمام سورتوں میں اپنی نمایاں اور مقدم جگہ رکھتی ہے۔

اساس القرآن کے معنی ہیں قرآن کی بنیاد۔ الکافیہ کے معنی ہیں ایسی چیز جو کفایت کرنے والی ہو۔ الکنز خزانہ کو کہتے ہیں۔

علاوہ بریں ایک سے زیادہ حدیثیں موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سورت کے یہ اوصاف عہد نبوت میں عام طور پر مشہور تھے۔ ایک حدیث میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ابی بن کعب کو یہ سورت تلقین کی اور فرمایا ''اس کے مثل کوئی سورت نہیں'' ایک دوسری روایت[۸] میں اسے ''سب سے بڑی سورت'' اور ''سب سے بہتر سورت'' بھی فرمایا ہے۔

سورہ فاتحہ میں دین حق کے تمام مقاصد کا خلاصہ موجود ہے

چنانچہ اس سورت کے مطالب پر نظر ڈالتے ہی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس میں اور قرآن کے بقیہ حصے میں اجمال اور تفصیل کا سا تعلق پیدا ہو گیا ہے۔ یعنی قرآن کی تمام سورتوں میں دین حق کے جو مقاصد بہ تفصیل بیان کئے گئے ہیں، سورہ فاتحہ میں انہی کا بہ شکل اجمال بیان موجود ہے۔ اگر ایک شخص قرآن میں سے اور کچھ نہ پڑھ سکے صرف اس سورت کے مطالب ذہن نشین کر لے، جب بھی وہ دین حق اور خدا پرستی کے بنیادی مقاصد معلوم کر لے گا اور یہی قرآن کی تمام تفصیلات کا ماحصل ہے۔

علاوہ بریں جب اس پہلو پر غور کیا جائے کہ سورت کا پیرایہ دعائیہ ہے اور اسے روزانہ عبادت کا ایک لازمی جزء قرار دیا گیا ہے تو اس کی یہ خصوصیت اور زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے اور واضح ہو جاتا ہے کہ اس اجمال و تفصیل میں بہت بڑی مصلحت پوشیدہ تھی۔ مقصود یہ تھا کہ قرآن کے مفصل بیانات کا ایک مختصر اور سیدھا سادہ خلاصہ بھی ہو جسے ہر انسان بہ آسانی

ذہن نشین کر لے اور پھر ہمیشہ اپنی دعاؤں اور عبادتوں میں دہراتا رہے۔ یہ اس کی دینی زندگی کا دستور العمل، خدا پرستی کے عقائد کا خلاصہ روحانی تصورات کا نصب العین ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے اس سورت کا ذکر کرتے ہوئے "سَبۡعًا مِّنَ الۡمَثَانِیۡ" کہہ کر اس کی خصوصیت کی طرف اشارہ کر دیا، یعنی ہمیشہ دہرائے جانے اور وردِ رکھنے ہی میں اس کے نزول کی حکمت پوشیدہ ہے۔ کوئی شخص کتنا ہی نادان اوران پڑھ ہو، لیکن ان چار سطروں کا یاد کر لینا اور ان کا سیدھا سادہ مطلب سمجھ لینا اس کے لئے کچھ دشوار نہیں ہوسکتا۔ اگر ایک انسان اس سے زیادہ قرآن میں سے کچھ نہ پڑھ سکا، جب بھی اس نے دینِ حق کا بنیادی سبق حاصل کر لیا۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان کے لئے اس سورت کا سیکھنا اور پڑھنا ناگزیر ہوا اور نماز کی دعا اس کے سوا کوئی نہ ہو سکی کہ " لا صلاۃ الا بفاتحۃ الکتب" (صحیحین)[9]۔ اور اسی لئے صحابہ کرام اسے "سورۃ الصلاۃ" کے نام سے پکارتے تھے، یعنی وہ سورت جس کے بغیر نماز نہیں پڑھی جاسکتی۔ ایک انسان اس سے زیادہ قرآن میں سے جس قدر پڑھے اور سیکھے مزید معرفت و بصیرت کا ذریعہ ہوگا، لیکن اس سے کم کوئی چیز نہیں ہوسکتی۔

دینِ حق کا ماحصل [10]

دینِ حق کا تمام تر ماحصل کیا ہے؟ جس قدر غور کیا جائے گا، ان چار باتوں سے باہر کوئی بات دکھائی نہ دے گی۔

(۱) خدا کی صفات کا ٹھیک ٹھیک تصور۔ اس لئے کہ انسان کو خدا پرستی کی راہ میں جس قدر ٹھوکریں لگی ہیں، صفات ہی کے تصور میں لگی ہیں۔

(۲) قانونِ مجازات کا اعتقاد۔ یعنی جس طرح دنیا میں ہر چیز کا ایک خاصہ اور قدرتی تاثیر ہے، اسی طرح انسانی اعمال کے بھی معنوی خواص اور نتائج ہیں۔ نیک عمل کا نتیجہ اچھائی ہے بُرے کا برائی۔

(۳) معاد کا یقین۔ یعنی انسان کی زندگی اسی دنیا میں ختم نہیں ہو جاتی، اس کے بعد بھی زندگی ہے اور جزاء کا معاملہ پیش آنے والا ہے۔

(۴) فلاح وسعادت کی راہ اور اس کی پہچان۔

سورہ فاتحہ کا اسلوب بیان[۱]

اب غور کرو ان باتوں کا خلاصہ اس سورت میں کس خوبی کے ساتھ جمع کر دیا گیا ہے! ایک طرف زیادہ سے زیادہ مختصر حتی کہ گنے ہوئے الفاظ ہیں۔ دوسری طرف ایسے جچے تلے الفاظ کہ ان کے معانی سے پوری وضاحت اور دل نشینی پیدا ہو گئی ہے۔ ساتھ ہی نہایت سیدھا سادا بیان ہے، کسی طرح کا پیچ وخم نہیں، کسی طرح کا الجھاؤ نہیں۔

یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ دنیا میں جو چیز جتنی زیادہ حقیقت سے قریب ہوتی ہے، اتنی ہی زیادہ سہل اور دل نشین بھی ہوتی ہے۔ اور خود فطرت کا یہ حال ہے کہ کسی گوشے میں بھی الجھی ہوئی نہیں ہے۔ الجھاؤ جس قدر بھی پیدا ہوتا ہے بناوٹ اور تکلف سے پیدا ہوتا ہے۔ پس جو بات سچی اور حقیقی ہوگی ضروری ہے کہ سیدھی سادی اور دل نشین بھی ہو۔ دل نشینی کی انتہا یہ ہے کہ جب کبھی کوئی ایسی بات تمہارے سامنے آجائے تو ذہن کو کسی طرح کی اجنبیت محسوس نہ ہو، وہ اس طرح قبول کرلے گویا پیشتر سے سمجھی بوجھی ہوئی بات تھی۔ اردو کے ایک شاعر نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے:

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

اب غور کرو! جہاں تک انسان کی خدا پرستی اور خدا پرستی کے تصورات کا تعلق ہے اس سے زیادہ سیدھی سادی باتیں اور کیا ہوسکتی ہیں جو اس سورت میں بیان کی گئی ہیں، اور پھر اس سے زیادہ سہل اور دل نشین اسلوب بیان کیا ہوسکتا ہے؟ سات چھوٹے چھوٹے بول ہیں، ہر بول چار پانچ لفظوں سے زیادہ کا نہیں، اور ہر لفظ صاف اور دل نشین معانی کا نگینہ ہے جو اس انگوٹھی میں جڑ دیا گیا ہے۔ اللہ کو مخاطب کر کے ان صفتوں سے پکارا گیا ہے جن کا جلوہ شب و روز انسان کے مشاہدے میں آتا رہتا ہے، اگرچہ اپنی جہالت و غفلت سے ان میں غور و تفکر نہیں کرتا۔ پھر اس کی بندگی کا اقرار ہے، اس کی مددگاریوں کا اعتراف ہے اور زندگی کی لغزشوں

سے بچ کر سیدھی راہ لگ چلنے کی طلب گاری ہے۔ کوئی مشکل خیال نہیں، کوئی انوکھی بات نہیں، کوئی عجیب وغریب راز نہیں۔ اب کہ ہم بار بار یہ سورت پڑھتے رہتے ہیں اور صدیوں سے اس کے مطالب نوع انسانی کے سامنے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے گویا ہمارے دینی تصورات کی ایک بہت ہی معمولی سی بات ہے، لیکن یہی معمولی بات جس وقت تک دنیا کے سامنے نہیں آئی تھی، اس سے زیادہ کوئی غیر معلوم اور ناقابل حل بات بھی نہ تھی دنیا میں حقیقت اور سچائی کی ہر بات کا یہی حال ہے۔ جب تک سامنے نہیں آتی، معلوم ہوتا ہے اس سے زیادہ مشکل بات کوئی نہیں۔ جب سامنے آجاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے اس سے زیادہ صاف اور سہل بات اور کیا ہوسکتی ہے؟ عرفی نے یہی حقیقت ایک دوسرے پیرایے میں بیان کی ہے۔

ہر کس نہ شناسندہ راز ست و گرنہ

اینہا ہمہ راز ست کہ معلوم عوام ست!

[12] دنیا میں جب کبھی وحی الٰہی کی ہدایت نمودار ہوئی ہے اس نے یہ نہیں کیا ہے کہ انسان کو نئی نئی باتیں سکھا دی ہوں، کیونکہ خدا پرستی کے بارے میں کوئی انوکھی بات سکھائی ہی نہیں جا سکتی۔ اس کا کام صرف یہ رہا ہے کہ انسان کے وجدانی عقائد کو علم واعتراف کی ٹھیک ٹھیک تعبیر بتا دے اور یہی سورہ فاتحہ کی خصوصیت ہے۔ اس سورت نے نوع انسانی کے وجدانی تصورات ایک ایسی تعبیر سے سنوار دیئے کہ ہر عقیدہ، ہر فکر، ہر جذبہ، اپنی شکل ونوعیت میں نمودار ہو گیا اور چونکہ یہ تعبیر حقیقت حال کی سچی تعبیر ہے، اس لئے جب کبھی ایک انسان راست بازی کے ساتھ اس پر غور کرے گا، بے اختیار پکار اٹھے گا کہ اس کا ہر بول اور ہر لفظ اس کے دل ودماغ کی قدرتی آواز ہے!

دین حق کی مہمات

پھر دیکھو! اگرچہ اپنی نوعیت میں وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ ایک خدا پرست انسان کی سیدھی سادی دعاء ہے، لیکن کس طرح اس کے ہر لفظ اور ہر اسلوب سے دین حق کا کوئی نہ کوئی اہم مقصد واضح ہو گیا ہے اور کس طرح اس کے الفاظ نہایت اہم معانی ودقائق کے

نگرانی کر رہے ہیں۔

۱۔ خدا کے تصور کے بارے میں انسان کی ایک بڑی غلطی یہ رہی ہے کہ اس تصور کو محبت کی جگہ خوف و دہشت کی چیز بنالیتا تھا۔ سورہ فاتحہ کے سب سے پہلے لفظ نے اس گمراہی کا ازالہ کر دیا۔ اس کی ابتداء "حمد" کے اعتراف سے ہوتی ہے "حمد" ثناء جمیل کو کہتے ہیں، یعنی اچھی صفتوں کی تعریف کرنے کو۔ ثناء جمیل اُسی کی کی جا سکتی ہے جس میں خوبی و جمال ہو پس "حمد" کے ساتھ خوف و دہشت کا تصور جمع نہیں ہو سکتا۔ جو ذات محمود ہو گی وہ خوفناک نہیں ہو سکتی۔

پھر "حمد" کے بعد خدا کی عالم گیر ربوبیت، رحمت اور عدالت کا ذکر کیا ہے اور اس طرح صفات الٰہی کی ایک ایسی مکمل شبیہ کھینچ دی ہے جو انسان کو وہ سب کچھ دے دیتی ہے جس کی انسانیت کے نشو و ارتقاء کے لئے ضرورت ہے اور ان تمام گمراہیوں سے محفوظ کر دیتی ہے جو اس راہ میں اسے پیش آسکتی ہیں۔[۱۴]

۲۔ "رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ" میں خدا کی عالم گیر ربوبیت کا اعتراف ہے جو ہر فرد، ہر جماعت، ہر قوم، ہر ملک، ہر گوشہ وجود کے لئے ہے۔ اور اس لئے یہ اعتراف ان تمام تنگ نظریوں کا خاتمہ کر دیتا ہے جو دنیا کی مختلف قوموں اور نسلوں میں پیدا ہو گئی تھیں اور ہر قوم اپنی جگہ سمجھنے لگی تھی کہ خدا کی برکتیں اور سعادتیں صرف اسی کے لئے ہیں، کسی دوسری قوم کا ان میں حصہ نہیں۔

۳۔ "مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ" میں الدین کا لفظ جزاء کے قانون کا اعتراف ہے اور جزاء کو "دین" کے لفظ سے تعبیر کر کے یہ حقیقت واضح کر دی ہے کہ جزاء انسانی اعمال کے قدرتی نتائج و خواص ہیں۔ یہ بات نہیں ہے کہ خدا کا غضب و انتقام بندوں کو عذاب دینا چاہتا ہو، کیونکہ "الدین" کے معنی بدلے و مکافات کے ہیں۔

۴۔ ربوبیت اور رحمت کے بعد "مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ" کے وصف نے بھی یہ حقیقت آشکارا کر دی کہ اگر کائنات میں صفات رحمت و جمال کے ساتھ قہر و جلال بھی اپنی نمود رکھتی ہیں تو یہ اس لئے نہیں کہ پروردگار عالم میں غضب و انتقام ہے، بلکہ اس لئے ہے کہ وہ عادل ہے اور اس کی حکمت نے ہر چیز کے لئے اس کا ایک خلاصہ اور نتیجہ مقرر کر دیا ہے۔ عدل

منافی رحمت نہیں ہے بلکہ عین رحمت ہے۔

۵۔''عبادت'' کے لئے نہیں کہا کہ ''نَعْبُدُكَ'' بلکہ کہا''اِیَّاكَ نَعْبُدُ'' یعنی یہ نہیں کہا کہ''تیری عبادت کرتے ہیں'' بلکہ حصر کے ساتھ کہا''صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں''اور پھر اس کے ساتھ ''ایاك نستعین''کہہ کر''استعانت'' کا بھی اسی حصر کے ساتھ ذکر کر دیا۔اس سلوب بیان نے توحید کے تمام مقاصد پورے کر دیئے اور شرک کی ساری راہیں بند ہو گئیں۔

٦۔سعادت وفلاح کی راہ کو '' الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ ''یعنی سیدھی راہ سے تعبیر کیا جس سے زیادہ بہتر اور قدرتی تعبیر نہیں ہو سکتی،کیونکہ کوئی نہیں جو سیدھی راہ اور ٹیڑھی راہ میں امتیاز نہ رکھتا ہو اور پہلی راہ کا خواہش مند نہ ہو۔

۷۔ پھر اس کے لئے ایک ایسی سیدھی سادی اور جانی بوجھی ہوئی شناخت بنا دی جس کا اذعان قدرتی طور پر ہر انسان کے اندر موجود ہے اور جو محض ایک ذہنی تعریف ہونے کی جگہ ایک موجود ومشہود حقیقت نمایاں کر دیتی ہے،یعنی وہ راہ جو انعام یافتہ انسانوں کی راہ ہے۔کوئی ملک،کوئی قوم،کوئی زمانہ،کوئی فرد ہو،لیکن انسان ہمیشہ دیکھتا ہے کہ زندگی کی دو راہیں یہاں صاف موجود ہیں۔ایک راہ کامیاب انسانوں کی راہ ہے،ایک ناکام انسانوں کی۔پس ایک واضح اور آشکارا بات کے لئے سب سے بہتر علامت یہی ہو سکتی تھی کہ اس کی طرف انگلی اٹھا دی جائے۔اس سے زیادہ کچھ کہنا ایک معلوم بات کو مجہول بنا دینا تھا۔

چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اس سورت کے لئے دعاء کا پیرایہ اختیار کیا گیا ہے،کیونکہ اگر تعلیم وامر کا پیرایہ اختیار کیا جاتا تو اس کی نوعیت کی ساری تاثیر جاتی رہتی۔دعائیہ اسلوب ہمیں بتاتا ہے کہ ہر راست باز انسان کی جو خدا پرستی کی راہ میں قدم اٹھاتا ہے،صداء حال کیا ہوتی ہے اور کیا ہونی چاہئے؟ یہ گویا خدا پرستی کے فکر و وجدان کا سر جوش ہے جو ایک طالب صادق کی زبان پر بے اختیار اُبل پڑتا ہے۔

(۲)

الحمد للّٰہ

حمد

عربی میں "حمد" کے معنی ثناء جمیل کے ہیں، یعنی اچھی صفتیں بیان کرنے کے۔ اگر کسی کی بری صفتیں بیان کی جائیں تو یہ "حمد" نہ ہوگی۔ حمد پر الف لام ہے۔ یہ استغراق کے لئے بھی ہو سکتا ہے، جنس کے لئے بھی۔ پس "الحمد للہ" کے معنی یہ ہوئے کہ حمد وثناء میں سے جو کچھ اور جیسا کچھ بھی کہا جا سکتا ہے وہ سب اللہ کے لئے ہے، کیونکہ خوبیوں اور کمالوں میں سے جو کچھ بھی ہے اسی سے ہے اور اسی میں ہے۔ اور اگر حسن موجود ہے تو نگاہ عشق کیوں نہ ہو، اور اگر محمودیت جلوہ افروز ہے تو زبان حمد وستایش کیوں خاموش رہے؟

آئینہ ما روی ترا عکس پذیر است
گر تو نہ نمائی گنہ از جانب ما نیست

"حمد" سے سورت کی ابتداء کیوں کی گئی؟ اس لئے کہ معرفت الٰہی کی راہ میں انسان کا پہلا تاثر یہی ہے، یعنی جب کبھی ایک صادق انسان اس راہ میں قدم اٹھائے گا تو سب سے پہلی حالت جو اس کے فکر ووجدان پر طاری ہوگی وہ قدرتی طور پر وہی ہوگی جسے یہاں تحمید وستایش سے تعبیر کیا گیا ہے۔

انسان کے لئے معرفت حق کی راہ کیا ہے؟ قرآن کہتا ہے صرف ایک ہی راہ ہے اور وہ یہ ہے کہ کائنات خلقت میں تفکر وتدبر کرے۔ مصنوعات کا مطالعہ اسے صانع

تک پہنچا دے گا۔

اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۳:۱۹۱)

اب فرض کرو ایک طالب صادق اس راہ میں قدم اٹھاتا ہے اور کائنات خلقت کے مظاہر و آثار کا مطالعہ کرتا ہے تو سب سے پہلا اثر جو اس کے دل و دماغ پر طاری ہوگا وہ کیا ہوگا؟ وہ دیکھے گا کہ خود اس کا وجود اور اس کے وجود سے باہر کی ہر چیز ایک صانع حکیم اور مدبر قدیر کی کارفرمائیوں کی جلوہ گاہ ہے اور اس کی ربوبیت اور رحمت کا ہاتھ ایک ایک ذرہ خلقت میں صاف نظر آرہا ہے۔ پس قدرتی طور پر اس کی روح جوش ستائش اور محویت جمال سے معمور ہو جائے گی۔ وہ بے اختیار پکار اٹھے گا کہ "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ! ساری حمد و ستائش اسی کے لئے ہے جو اپنی کارفرمائی کے ہر گوشے میں سرچشمہ رحمت و فیضان اور معنی حسن و کمال ہے۔!

اس راہ میں فکر انسانی کی سب سے بڑی گم راہی یہ رہی ہے کہ اس کی نظریں مصنوعات کے جلووں میں محو ہو کر رہ جاتیں، آگے بڑھنے کی کوشش نہ کرتیں، وہ پردوں کے نقش و نگار کو دیکھ کر بے خود ہو جاتا مگر اس کی جستجو نہ کرتا جس نے اپنے جمال صنعت پر یہ دل آویز پردے ڈال رکھے ہیں۔ دنیا میں مظاہر فطرت کی پرستش کی بنیاد اسی کوتاہ نظری سے پڑی۔ پس "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ" کا اعتراف اس حقیقت کا اعتراف ہے کہ کائنات ہستی کا تمام فیضان و جمال خواہ کسی گوشے اور کسی شکل میں ہو، صرف ایک صانع حقیقی کی صفتوں ہی کا ظہور ہے۔ اس لئے حسن و جمال کے لئے جتنی بھی شیفتگی ہوگی، خوبی و کمال کے لئے جتنی بھی مدحت طرازی ہوگی، بخشش و فیضان کا جتنا بھی اعتراف ہوگا مصنوع و مخلوق کے لئے نہیں ہوگا، صانع و خالق ہی کے لئے ہوگا۔

عبارا تناشتي و حسنك واحد

و كل الى ذاك الجمال يشير!

اللہ

نزول قرآن سے پہلے عربی میں "اللہ" کا لفظ خدا کے لئے بطور اسم ذات کے مستعمل تھا، جیسا کہ شعراء جاہلیت کے کلام سے ظاہر ہے۔ یعنی خدا کی تمام صفتیں اس کی طرف منسوب کی جاتی تھیں۔ یہ کسی خاص صفت کے لئے نہیں بولا جاتا تھا۔ قرآن نے بھی یہی لفظ بطور اسم ذات کے اختیار کیا ہے اور تمام صفتوں کو اس کی طرف نسبت دی۔

وَلِلّٰهِ الْاَسْمَاءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا۔ (۷:۱۸۰)

اور اللہ کے لئے حسن وخوبی کے نام ہیں (یعنی صفتیں ہیں) پس چاہئے کہ اسے ان صفتوں کے ساتھ پکارو!

قرآن نے یہ لفظ محض اس لئے اختیار کیا کہ لغت کی مطابقت کا مقتضیٰ یہی تھا یا اس سے بھی زیادہ کوئی معنوی موزونیت اس میں پوشیدہ ہے؟

جب ہم اس لفظ کی معنوی دلالت پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے اس غرض کے لئے سب سے زیادہ موزوں لفظ یہی تھا۔

نوع انسانی کے دینی تصورات کا ایک قدیم عہد جو تاریخ کی روشنی میں آیا ہے مظاہر فطرت کی پرستش کا عہد ہے۔ اسی پرستش نے بتدریج اصنام پرستی کی صورت اختیار کی۔ اصنام پرستی کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ مختلف زبانوں میں بہت سے الفاظ دیوتاؤں کے لئے پیدا ہو گئے اور جوں جوں پرستش کی نوعیت میں وسعت ہوتی گئی، الفاظ کا تنوع بھی بڑھتا گیا، لیکن چونکہ یہ بات انسان کی فطرت کے خلاف تھی کہ ایک ایسی ہستی کے تصور سے خالی الذہن رہے جو سب سے اعلیٰ اور سب کی پیدا کرنے والی ہستی ہے، اس لئے دیوتاؤں کی پرستش کے ساتھ ایک سب سے بڑی اور سب پر حکمران ہستی کا تصور بھی کم وبیش ہمیشہ موجود رہا۔ اور اس لئے جہاں بے شمار الفاظ دیوتاؤں اور ان کی معبودانہ صفتوں کے لئے پیدا ہو گئے، وہاں کوئی نہ کوئی لفظ ایسا بھی ضرور مستعمل رہا جس کے ذریعے اس ان دیکھی اور اعلیٰ ترین

ہستی کی طرف اشارہ کیا جاتا تھا۔

چنانچہ سامی زبانوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ حروف واصوات کی ایک خاص ترکیب ہے جو معبودیت کے معنی میں مستعمل رہی ہے اور عبرانی، سریانی، آرامی، کلدانی، حمیری عربی وغیرہ تمام زبانوں میں اس کا یہ لغوی خاصہ پایا جاتا ہے۔ یہ الف، لام، اور ہ کا مادہ ہے اور مختلف شکلوں میں مشتق ہوا ہے۔ کلدانی وسریانی کا ''الاھیا'' عبرانی کا ''الوہ'' اور عربی کا ''الہٰ'' اسی سے ہے اور بلاشبہ یہی ''الہٰ'' ہے جو حرف تعریف کے اضافے کے بعد ''اللہ'' ہو گیا ہے اور تعریف نے اسے صرف خالق کائنات کے لئے مخصوص کر دیا ہے۔

لیکن اگر ''اللہ'' ''الہٰ'' سے ہے تو ''الہٰ'' کے معنی کیا ہیں؟ علماء لغت واشتقاق کے مختلف اقوال ہیں، مگر سب سے زیادہ قوی قول یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کی اصل ''الہٰ'' ہے۔ اور ''الہٰ'' کے معنی تحیر اور درماندگی کے ہیں۔ پس خالق کائنات کے لئے یہ لفظ اس لئے اسم قرار پایا کہ اس بارے میں انسان جو کچھ جانتا اور جان سکتا ہے وہ عقل کے تحیر اور ادراک کی درماندگی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ وہ جس قدر بھی اس ذات مطلق کی ہستی میں غور وخوض کرے گا اس کی عقل کی حیرانی اور درماندگی بڑھتی ہی جائے گی، یہاں تک کہ وہ معلوم کر لے گا کہ اس کی راہ کی ابتداء بھی عجز وحیرت سے ہوتی ہے اور انتہا بھی عجز وحیرت ہی ہے۔

ای برون از وہم وقال وقیل من
خاک بر فرق من و تمثیل من!

اب غور کرو! خدا کی ذات کے لئے انسان کی زبان سے نکلے ہوئے لفظوں میں اس سے زیادہ موزوں لفظ اور کون سا ہو سکتا ہے؟ اگر خدا کو اس کی صفتوں سے پکارنا ہے تو بلاشبہ اس کی صفتیں بے شمار ہیں، لیکن اگر صفات سے الگ ہو کر اس کی ذات کی طرف اشارہ کرنا ہے تو وہ اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ ایک متحیر کر دینے والی ذات ہے اور جو کچھ اس کی نسبت کہا جا سکتا ہے وہ عجز ودرماندگی کے اعتراف کے سوا کچھ نہیں ہے۔ فرض کرو نوع انسانی نے اس وقت تک خدا کی ہستی یا خلقت کائنات کی اصلیت کے بارے میں جو کچھ سوچا اور سمجھا ہے،

وہ سب کچھ سامنے رکھ کر ہم ایک موزوں سے موزوں لفظ تجویز کرنا چاہیں تو وہ کیا ہوگا؟ اس سے زیادہ اور اس سے بہتر کوئی لفظ تجویز کیا جا سکتا ہے؟

یہی وجہ ہے کہ جب کبھی اس راہ میں عرفان و بصیرت کی کوئی بڑی سے بڑی بات کہی گئی وہ یہی تھی کہ زیادہ سے زیادہ خود رفتگیوں کا اعتراف کیا گیا اور ادراک کا منتہی مرتبہ یہی قرار پایا کہ ادراک کی نارسائی کا ادراک حاصل ہو جائے۔ عرفاء کے دل و زبان کی صدا ہمیشہ یہی رہی۔ "رَبِّ زِدْنِي فِيكَ تَحَيُّرًا"[14] اور حکماء کی حکمت و دانش کا فیصلہ بھی ہمیشہ یہی ہوا ہے کہ

"معلوم شد کہ ہیچ معلوم نہ شد"

چونکہ یہ اسم خدا کے لئے بطور اسم ذات کے استعمال میں آیا۔ اس لئے قدرتی طور پر ان تمام صفتوں پر حاوی ہو گیا جن کا خدا کی ذات کے لئے تصور کیا جا سکتا ہے۔ اگر ہم خدا کا تصور اس کی کسی صفت کے ساتھ کریں، مثلاً "الرب" یا "الرحیم" کہیں تو یہ تصور صرف ایک خاص صفت ہی میں محدود ہوگا، یعنی ہمارے ذہن میں ایک ایسی ہستی کا تصور پیدا ہو جائے گا جس میں ربوبیت یا رحمت ہے، لیکن جب ہم "اللہ" کا لفظ بولتے ہیں تو فوراً ہمارا ذہن ایک ایسی ہستی کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جو ان تمام صفات حسن و کمال سے متصف ہے جو اس کی نسبت بیان کئے گئے ہیں اور جو اس میں ہونے چاہئیں۔

(۳)

رب العلمین

ربوبیت

"حمد" کے بعد بالترتیب چار صفتیں بیان کی گئی ہیں۔

"رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ" "الرَّحْمٰنِ" "الرَّحِيْمِ" "مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ"۔

چونکہ "الرَّحْمٰنِ" اور "الرَّحِيْمِ" کا تعلق ایک ہی صفت کے دو مختلف پہلوؤں سے ہے، اس لئے دوسرے لفظوں میں انہیں یوں تعبیر کیا جا سکتا ہے کہ ربوبیت، رحمت، عدالت تین صفتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔

"الله" کی طرح "رب" بھی سامی زبانوں کا ایک کثیر الاستعمال مادہ ہے۔ عبرانی، سریانی، اور عربی تینوں زبانوں میں اس کے معنی پالنے کے ہیں اور چونکہ پرورش کی ضرورت کا احساس انسانی زندگی کے بنیادی احساسات میں سے ہے، اس لئے اسے بھی قدیم ترین سامی تعبیرات میں سے سمجھنا چاہئے۔ پھر چونکہ معلم، استاد اور آقا کسی نہ کسی اعتبار سے پرورش کرنے والے ہی ہوتے ہیں، اس لئے اس کا اطلاق ان معنوں میں بھی ہونے لگا۔ چنانچہ عبرانی اور آرامی کا "ربی" اور "رباہ" پرورش کنندہ، معلم اور آقا تینوں معنی رکھتا تھا اور قدیم مصری اور خالدی زبان کا ایک لفظ "رابو" بھی انہیں معنوں میں مستعمل ہوا ہے اور ان ملکوں کی قدیم ترین سامی وحدت کی خبر دیتا ہے۔[۱۵]

بہر حال عربی میں "ربوبیت" کے معنی پالنے کے ہیں، لیکن پالنے کو اس کے وسیع اور کامل معنوں میں لینا چاہئے۔ اسی لئے بعض ائمہ لغت نے اس کی تعریف ان لفظوں میں کی ہے۔

"ھو انشاء الشئی حالا فحالاً الٰی حد التمام"[16]

یعنی کسی چیز کو یکے بعد دیگرے اس کی مختلف حالتوں اور ضرورتوں کے مطابق

اس طرح نشو ونما دیتے رہنا کہ اپنی حد کمال تک پہنچ جائے۔

اگر ایک شخص بھوکے کو کھانا کھلا دے یا محتاج کو روپیہ دے دے تو یہ اس کا کرم ہوگا، جُود ہوگا، احسان ہوگا، لیکن وہ بات نہ ہوگی جسے ربوبیت کہتے ہیں۔ ربوبیت کے لئے ضروری ہے کہ پرورش اور نگہداشت کا ایک جاری اور مسلسل اہتمام ہو اور ایک وجود کو اس کی تکمیل وبلوغ کے لئے وقتاً فوقتاً جیسی کچھ ضرورتیں پیش آتی رہیں، ان سب کا سروسامان ہوتا رہے۔ نیز ضروری ہے کہ یہ سب کچھ محبت وشفقت کے ساتھ ہو۔ کیونکہ جو عمل محبت وشفقت کے عاطفہ سے خالی ہوگا ربوبیت نہیں ہوسکتا۔

ربوبیت کا ایک ناقص نمونہ ہم اس پرورش میں دیکھ سکتے ہیں جس کا جوش ماں کی فطرت میں ودیعت کر دیا گیا ہے۔ بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو محض گوشت پوست کا ایک متحرک لوتھڑا ہوتا ہے اور زندگی اور نمو کی جتنی قوتیں بھی رکھتا ہے سب کی سب پرورش وتربیت کی محتاج ہوتی ہیں یہ پرورش محبت وشفقت، حفاظت ونگہداشت اور بخشش واعانت کا ایک طول طویل سلسلہ ہے اور اسے اس وقت تک جاری رہنا چاہئے جب تک بچہ اپنے جسم وذہن کے حد بلوغ تک نہ پہنچ جائے۔ پھر پرورش کی ضرورتیں ایک دو نہیں، بے شمار ہیں۔ ان کی نوعیت ہمیشہ بدلتی رہتی ہے اور ضروری ہے کہ ہر عمر اور ہر حالت کے مطابق محبت کا جوش، نگرانی کی نگاہ اور زندگی کا سروسامان ملتا رہے۔ حکمت الٰہی نے ماں کی محبت میں ربوبیت کے یہ تمام خدوخال پیدا کر دیئے ہیں یہ ماں کی ربوبیت ہے جو پیدائش کے دن سے لے کر بلوغ تک بچے کو پالتی، بچاتی، سنبھالتی اور ہر وقت اور ہر حالت کے مطابق اس کی ضروریات پرورش کا سروسامان مہیا کرتی رہتی ہے۔

جب بچے کا معدہ دودھ کے سوا کسی غذا کا متحمل نہ تھا تو اسے دودھ ہی پلایا جاتا تھا۔ جب دودھ سے زیادہ قوی غذا کی ضرورت ہوئی تو ویسی ہی غذا دی جانے لگی۔ جب اسکے پاؤں میں کھڑے ہونے کی سکت نہ تھی تو ماں اسے گود میں اٹھائے پھرتی تھی۔ جب کھڑے ہونے کے قابل ہوا تو انگلی پکڑ لی اور ایک ایک قدم چلانے لگی۔ پس یہ بات کہ ہر حالت اور ضرورت کے مطابق ضروریات مہیا ہوتی رہیں اور نگرانی وحفاظت کا ایک مسلسل اہتمام جاری رہا، وہ صورت حال ہے جس سے ربوبیت کے مفہوم کا تصور کیا جاسکتا ہے۔

مجازی ربوبیت کی یہ ناقص اور محدود مثال سامنے لاؤ اور ربوبیت الٰہی کی غیر محدود حقیقت کا تصور کرو۔ اس کے ''رب العالمین'' ہونے کے معنی یہ ہوئے کہ جس طرح اس کی خالقیت نے کائنات ہستی اور اس کی ہر چیز پیدا کی ہے، اسی طرح اس کی ربوبیت نے ہر مخلوق کی پرورش کا سروسامان بھی کر دیا ہے اور یہ پرورش کا سروسامان ایک ایسے عجیب و غریب نظام کے ساتھ ہے کہ ہر وجود کو زندگی اور بقا کے لئے جو کچھ مطلوب تھا، وہ سب کچھ مل رہا ہے اور اس طرح مل رہا ہے کہ ہر حالت کی رعایت ہے، ہر ضرورت کا لحاظ ہے، ہر تبدیلی کی نگرانی ہے اور ہر کمی بیشی ضبط میں آچکی ہے۔ چیونٹی اپنے بل میں رینگ رہی ہے، کیڑے مکوڑے کوڑے کرکٹ میں ملے ہوئے ہیں، مچھلیاں دریا میں تیر رہی ہیں، پرند ہوا میں اڑ رہے ہیں، پھول باغ میں کھل رہے ہیں، ہاتھی جنگل میں دوڑ رہا ہے اور ستارے فضا میں گردش کر رہے ہیں، لیکن فطرت کے پاس سب کے لئے یکساں طور پر پرورش کی گود اور نگرانی کی آنکھ ہے اور کوئی نہیں جو فیضان ربوبیت سے محروم ہو۔ اگر مثالوں کی جستجو میں تھوڑی سی کاوش جائز رکھی جائے تو مخلوقات کی بے شمار قسمیں ایسی ملیں گی جو اتنی حقیر اور بے مقدار ہیں کہ غیر مسلح [1] آنکھ سے ہم انہیں دیکھ بھی نہیں سکتے۔ تاہم ربوبیت الٰہی نے جس طرح اور جس نظام کے ساتھ ہاتھی جیسی جسیم اور انسان جیسی عقیل مخلوق کے لئے سامان پرورش مہیا کر دیا ہے، ٹھیک اسی طرح اور ویسے ہی نظام کے ساتھ ان کے لئے بھی زندگی اور بقا کی ہر چیز مہیا کی ہے۔ اور پھر یہ جو کچھ بھی انسان کے وجود سے باہر ہے۔ اگر انسان اپنے

وجود کو دیکھیے تو خود اس کی زندگی اور زندگی کا ہر لمحہ ربوبیت الٰہی کی کرشمہ سازیوں کی ایک پوری کائنات ہے۔

وَفِی الْاَرْضِ اٰیٰتٌ لِّلْمُوْقِنِیْنَ o وَفِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ o (۵۱:۲۰-۲۱)

ان لوگوں کے لئے جو (سچائی پر) یقین رکھنے والے ہیں، زمین میں (خدا کی کارفرمائیوں کی) کتنی ہی نشانیاں ہیں۔ اور خود تمہارے وجود میں بھی، پھر کیا تم دیکھتے نہیں؟

نظام ربوبیت

لیکن سامان زندگی کی بخشایش میں اور ربوبیت کے عمل میں جو فرق ہے اسے نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔ اگر دنیا میں ایسے عناصر، عناصر کی ایسی ترکیب اور اشیاء کی ایسی بناوٹ موجود ہے جو زندگی اور نشو ونما کے لئے سود مند ہے تو محض اس کی موجودگی ربوبیت سے تعبیر نہیں کی جاسکتی۔ ایسا ہونا قدرت الٰہی کی رحمت ہے، بخشش ہے، احسان ہے، مگر وہ بات نہیں جسے ربوبیت کہتے ہیں۔ ربوبیت یہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں دنیا میں سود مند اشیاء کی موجودگی کے ساتھ ان کی بخشش و تقسیم کا بھی ایک نظام موجود ہے اور فطرت صرف بخشتی ہی نہیں، بلکہ جو کچھ بخشتی ہے ایک مقررہ انتظام اور ایک منضبط ترتیب و مناسبت کے ساتھ بخشتی ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں ہر وجود کو زندگی اور بقا کے لئے جس جس چیز کی ضرورت تھی اور جس جس وقت اور جیسی جیسی مقدار میں ضرورت تھی، ٹھیک ٹھیک اسی طرح، انہیں وقتوں میں اور اسی مقدار میں اسے مل رہی ہے اور اس نظم و انضباط سے تمام کارخانہ حیات چل رہا ہے۔

پانی کی بخشش اور تقسیم کا نظام

زندگی کے لئے پانی اور رطوبت کی ضرورت ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ پانی کے وافر ذخیرے ہر طرف موجود ہیں لیکن اگر صرف اتنا ہی ہوتا تو یہ زندگی کے لئے کافی نہ تھا۔ کیونکہ زندگی کے لئے صرف یہی ضروری نہیں کہ پانی موجود ہو بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ ایک خاص

انتظام، ایک خاص ترتیب اور ایک خاص مقررہ مقدار کے ساتھ موجود ہو۔ پس یہ جو دنیا میں پانی کے بننے اور تقسیم ہونے کا ایک خاص انتظام پایا جاتا ہے اور فطرت صرف پانی بناتی ہی نہیں، بلکہ ایک خاص ترتیب و مناسبت کے ساتھ بناتی اور ایک خاص اندازے کے ساتھ بانٹتی رہتی ہے۔ تو یہی ربوبیت ہے اور اسی سے ربوبیت کے تمام اعمال کا تصور کرنا چاہئے۔ قرآن کہتا ہے یہ اللہ کی رحمت ہے جس نے پانی جیسا جوہر حیات پیدا کر دیا، لیکن یہ اس کی ربوبیت ہے جو پانی کو ایک ایک بوند کر کے ٹپکاتی، زمین کے ایک ایک گوشے تک پہنچاتی، ایک خاص مقدار اور حالت میں تقسیم کرتی، ایک خاص موسم اور محل میں برساتی اور پھر زمین کے ایک ایک تشنہ ذرے کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر سیراب کر دیتی ہے۔

وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً بِقَدَرٍ فَاَسْكَنّٰهُ فِي الْاَرْضِ وَاِنَّا عَلٰى ذَهَابٍ بِهٖ لَقٰدِرُوْنَ ۝ فَاَنْشَاْنَا لَكُمْ بِهٖ جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ لَكُمْ فِيْهَا فَوَاكِهُ كَثِيْرَةٌ وَّمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ۝ (۲۳:۱۸-۱۹)

اور (دیکھو!) ہم نے آسمان سے ایک خاص اندازے کے ساتھ پانی برسایا، پھر اسے زمین میں ٹھہرائے رکھا اور ہم اس پر بھی قادر ہیں کہ (جس طرح برسایا تھا اسی طرح) اسے واپس لے جائیں۔ پھر (دیکھو!) اسی پانی سے ہم نے کھجوروں اور انگوروں کے باغ پیدا کر دیئے جن میں بے شمار پھل لگتے ہیں اور انہیں سے تم اپنی غذا بھی حاصل کرتے ہو۔

تقدیر اشیاء

یہی وجہ ہے کہ قرآن نے جا بجا اشیاء کی قدر اور مقدار کا ذکر کیا ہے، یعنی اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ فطرت کائنات جو کچھ بخشتی ہے ایک خاص اندازے کے ساتھ بخشتی ہے اور یہ اندازہ ایک خاص قانون کے ماتحت ٹھہرایا ہوا ہے۔

وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ وَمَا نُنَزِّلُهٗۤ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ۝ (الحجر ۱۵-۲۱)

اور کوئی شے نہیں جس کے ہمارے پاس ذخیرے موجود نہ ہوں (لیکن ہمارا طریق کار یہ ہے کہ) جو کچھ نازل کرتے ہیں، ایک مقررہ مقدار میں نازل کرتے ہیں۔

وَكُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهٗ بِمِقْدَارٍ ○ (الرعد ۱۳:۸)

اور اللہ کے نزدیک ہر چیز کا ایک اندازہ مقرر ہے۔

اِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ (القمر ۵۴:۴۹)

ہم نے جتنی چیزیں بھی پیدا کی ہیں ایک اندازے کے ساتھ پیدا کی ہیں۔

یہ کیا بات ہے کہ دنیا میں صرف یہی نہیں ہے کہ پانی موجود ہے، بلکہ ایک خاص نظم وترتیب کے ساتھ موجود ہے؟ یہ کیوں ہے کہ پہلے سورج کی شعاعیں سمندر سے ڈول بھر بھر کر فضا میں پانی کی چادریں بچھا دیں، پھر ہواؤں کے جھونکے انہیں حرکت میں لائیں اور پانی کی بوندیں بنا کر ایک خاص وقت اور خاص محل میں برسا دیں؟ پھر یہ کیوں ہے کہ جب کبھی پانی برسے تو ایک خاص ترتیب اور مقدار ہی سے برسے اور اس طرح برسے کہ زمین کی بالائی سطح پر اس کی ایک خاص مقدار بہنے لگے اور اندرونی حصوں تک ایک خاص مقدار میں نمی پہنچے؟ کیوں ایسا ہوا کہ پہلے پہاڑوں کی چوٹیوں پر برف کے تودے جمتے ہیں، پھر موسم کی تبدیلی سے پگھلنے لگتے ہیں، پھر ان کے پگھلنے سے پانی کے سرچشمے ابلنے لگتے ہیں، پھر چشموں سے دریا کی جدولیں بہنے لگتی ہیں، پھر یہ جدولیں پیچ وخم کھاتی ہوئی دور دور تک دوڑ جاتی ہیں اور سینکڑوں ہزاروں میلوں تک اپنی وادیاں شاداب کر دیتی ہیں؟

کیوں یہ سب کچھ ایسا ہی ہوا؟ کیوں ایسا نہ ہوا کہ پانی موجود ہوتا مگر اس انتظام اور ترتیب کے ساتھ نہ ہوتا؟

قرآن کہتا ہے: اس لئے کہ کائنات ہستی میں ربوبیت الٰہی کارفرما ہے اور ربوبیت کا مقتضی یہی تھا کہ پانی اسی ترتیب سے بنے اور اسی ترتیب ومقدار سے تقسیم ہو۔ یہ رحمت و حکمت تھی جس نے پانی پیدا کیا، مگر یہ ربوبیت ہے جو اسے اس طرح کام میں لائی کہ پرورش اور رکھوالی کی تمام ضرورتیں پوری ہوگئیں۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ یُرْسِلُ الرِّیٰحَ فَتُثِیْرُ سَحَابًا فَیَبْسُطُهٗ فِی السَّمَآءِ كَیْفَ یَشَآءُ وَ یَجْعَلُهٗ كِسَفًا فَتَرَى الْوَدْقَ یَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ فَاِذَآ اَصَابَ بِهٖ مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖۤ اِذَا هُمْ یَسْتَبْشِرُوْنَ ۝ (۳۰:۴۸)

یہ اللہ ہی کی کارفرمائی ہے کہ ہوائیں چلتی ہیں، پھر ہوائیں بادلوں کو چھیڑ کر حرکت میں لاتی ہیں، پھر وہ جس طرح چاہتا ہے انہیں فضا میں پھیلا دیتا ہے اور انہیں ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے۔ پھر تم دیکھتے ہو کہ بادلوں میں سے مینہ نکل رہا ہے۔ پھر جن لوگوں کو بارش کی یہ برکت ملنی تھی، مل چکتی ہے تو وہ اچانک خوش وقت ہو جاتے ہیں۔

عناصر حیات

پھر اس حقیقت پر بھی غور کرو کہ زندگی کے لئے جن چیزوں کی سب سے زیادہ ضرورت تھی، انہیں کی بخشایش سب سے زیادہ اور عام ہے اور جن کی ضرورت خاص خاص حالتوں اور گوشوں کے لئے تھی، انہیں میں اختصاص اور مقامیت پائی جاتی ہے۔ ہوا سب سے زیادہ ضروری تھی، کیونکہ پانی اور غذا کے بغیر کچھ عرصہ تک زندگی ممکن ہے، مگر ہوا کے بغیر ممکن نہیں پس اس کا سامان اتنا وافر اور عام ہے کہ کوئی جگہ، کوئی گوشہ، کوئی وقت نہیں جو اس سے خالی ہو۔ فضا میں ہوا کا بے حد و کنار سمندر پھیلا ہوا ہے۔ جب کبھی اور جہاں کہیں سانس لو، زندگی کا یہ سب سے زیادہ ضروری جوہر تمہارے لئے خود بخود مہیا ہو جائے گا۔ ہوا کے بعد دوسرے درجے پر پانی ہے۔ وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ (۲۱:۳۰) اس لئے اس کی بخشایش کی فراوانی و عمومیت ہوا سے کم مگر ہر چیز سے زیادہ ہے۔ زمین کے نیچے آب شیریں کی سوتیں بہہ رہی ہیں۔ زمین کے اوپر بھی ہر طرف دریا رواں ہیں۔ پھر ان دونوں ذخیروں کے علاوہ فضائے آسمانی کا بھی کارخانہ ہے جو شب و روز سرگرم کار رہتا ہے۔ وہ سمندر کا شوراب کھینچتا ہے، اسے صاف و شیریں بنا کر جمع کرتا رہتا ہے، پھر حسب ضرورت زمین کے حوالے کر دیتا ہے۔ پانی کے بعد غذا کی ضرورت تھی۔ غذا ہوا اور پانی سے کم، مگر اور تمام چیزوں سے زیادہ اس کا دستر خوان کرم بھی خشکی اور تری میں بچھا ہوا ہے۔ اور کوئی مخلوق نہیں

جس کے گرد وپیش اس کی غذا کا ذخیرہ موجود نہ ہو۔

نظام پرورش

پھر سامان پرورش کے اس عالم گیر نظام پر غور کرو جو اپنے ہر گوشہ عمل میں پروردگی کی گود اور بخشش حیات کا سرچشمہ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا یہ تمام کارخانہ صرف اسی لئے بنا ہے کہ زندگی بخشے اور زندگی کی ہر استعداد کی رکھوالی کرے۔ سورج اس لئے ہے کہ روشنی کے لئے چراغ کا اور گرمی کے لئے تنور کا کام دے اور اپنی کرنوں کے ڈول بھر بھر کر سمندر سے پانی کھینچتا رہے۔ ہوائیں اس لئے ہیں کہ اپنی سردی اور گرمی سے مطلوبہ اثرات پیدا کرتی رہیں اور کبھی پانی کے ذرات جما کر ابر کی چادریں بچھا دیں، کبھی ابر کو پانی بنا کر بارش بنا دیں۔ زمین اس لئے ہے کہ نشوونما کے خزانوں سے ہمیشہ معمور رہے اور ہر دانے کے لئے اپنی گود میں زندگی اور ہر پودے کے لئے اپنے سینے میں پروردگی رکھے۔ مختصر یہ کہ کارخانہ ہستی کا ہر گوشہ صرف اسی کام میں لگا ہوا ہے، ہر قوت استعداد ڈھونڈھ رہی ہے اور ہر تاثیر اثر پذیری کے انتظار میں ہے۔ جونہی کسی وجود میں بڑھنے اور نشوونما پانے کی استعداد پیدا ہوتی ہے، معاً تمام کارخانہ ہستی اس کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ سورج کی تمام کارفرمائیاں، فضا کے تمام تغیرات، زمین کی تمام قوتیں، عناصر کی تمام سرگرمیاں صرف اس انتظار میں رہتی ہیں کہ کب چیونٹی کے انڈے سے ایک بچہ ہوتا ہے اور کب دہقان کی جھولی سے زمین پر ایک دانہ گرتا ہے۔

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ
اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ○ (۴۵:۱۳)

اور آسمان و زمین میں جو کچھ بھی ہے سب کو اللہ نے تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے۔ بلاشبہ ان لوگوں کے لئے جو غور و فکر کرنے والے ہیں، اس بات میں (معرفت حقیقت کی) بڑی ہی نشانیاں ہیں!

نظام ربوبیت کی وحدت

سب سے زیادہ عجیب مگر سب سے زیادہ نمایاں حقیقت نظام ربوبیت کی یکسانیت اور

ہم آہنگی ہے۔ یعنی ہر وجود کی پرورش کا سروسامان جس طرح اور جس اسلوب پر کیا گیا ہے، وہ ہر گوشے میں ایک ہی ہے اور ایک ہی اصل وقاعدہ رکھتا ہے۔ پتھر کا ایک ٹکڑا تمہیں گلاب کے شاداب اور عطر بیز پھول سے کتنا ہی مختلف دکھائی دے، لیکن دونوں کی پرورش کے اصول واحوال پر نظر ڈالو گے تو صاف نظر آجائے گا کہ دونوں کو ایک ہی طریقے سے سامان پرورش ملا ہے اور دونوں ایک ہی طرح پالے پوسے جارہے ہیں۔ انسان کا بچہ اور درخت کا پودا تمہاری نظروں میں کتنی بے جوڑ چیزیں ہیں! لیکن اگر ان کی نشوونما کے طریقوں کا کھوج لگاؤ گے تو دیکھ لو گے کہ قانون پرورش کی یکسانیت نے دونوں کو ایک ہی رشتے میں منسلک کردیا ہے۔ پتھر کی چٹان ہو یا پھول کی کلی، انسان کا بچہ ہو یا چیونٹی کا انڈا، سب کے لئے پیدائش ہے، اور قبل اس کے کہ پیدائش ظہور میں آئے سامان پرورش مہیا ہوجاتا ہے، پھر طفولیت کا دور ہے اور اس دور کی ضروریات ہیں۔ انسان کا بچہ بھی اپنی طفولیت رکھتا ہے، درخت کے مولود نباتی کے لئے بھی طفولیت ہے، اور تمہاری چشم ظاہر بین کے لئے کتنا ہی عجیب کیوں نہ ہو، لیکن پتھر کی چٹان کا تو وہ بھی اپنی طفولیت رکھتا ہے۔ پھر طفولیت رشد وبلوغ کی طرف بڑھتی ہے اور جوں جوں بڑھتی جاتی ہے، اس کی روز افزوں حالت کے مطابق یکے بعد دیگرے سامان پرورش میں بھی تبدیلیاں ہوتی جاتی ہیں، یہاں تک کہ ہر وجود اپنے سن کمال تک پہنچ جاتا ہے اور جب سن کمال تک پہنچ گیا تو ازسرنو ضعف وانحطاط کا دور شروع ہوجاتا ہے۔ پھر اس ضعف وانحطاط کا خاتمہ بھی سب کے لئے ایک ہی طرح ہے کسی دائرے میں اسے مرجانا کہتے ہیں، کسی میں مرجھا جانا اور کسی میں پامال ہوجانا۔ الفاظ متعدد ہوگئے مگر حقیقت میں تعدد نہیں ہوا۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضُعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ ضُعْفٍ قُوَّةً ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ ضُعْفًا وَّ شَیْبَةً ؕ یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ ۚ وَ هُوَ الْعَلِیْمُ الْقَدِیْرُ ۝ (۳۰:۵۴)

یہ اللہ ہی کی کارفرمائی ہے کہ اس نے تمہیں اس طرح پیدا کیا کہ پہلے ناتوانی کی حالت

ہوتی ہے، پھر ناتوانی کے بعد قوت آتی ہے، پھر قوت کے بعد دوبارہ ناتوانی اور بڑھاپا ہوتا ہے۔ وہ جو کچھ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔ وہ علم اور قدرت رکھنے والا ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَلَكَهٗ يَنَابِيْعَ فِي الْاَرْضِ ثُمَّ يُخْرِجُ بِهٖ زَرْعًا مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَجْعَلُهٗ حُطَامًا ط اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِاُولِي الْاَلْبَابِ ۝ (۳۹:۲۱)

کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ نے آسمان سے پانی برسایا، پھر زمین میں اس کے چشمے رواں ہو گئے، پھر اسی پانی سے رنگ برنگ کی کھیتیاں لہلہا اٹھیں، پھر ان کی نشوونما میں ترقی ہوئی اور پوری طرح پک کر تیار ہو گئیں۔ پھر (ترقی کے بعد زوال طاری ہوا اور) تم دیکھتے ہو کہ ان پر زردی چھا گئی، پھر بالآخر خشک ہو کر چورا چورا ہو گئی، بلاشبہ دانش مندوں کے لئے اس صورت میں بڑی ہی عبرت ہے!

جہاں تک غذا کا تعلق ہے، حیوانات میں ایک قسم ان جانوروں کی ہے جن کے بچے دودھ سے پرورش پاتے ہیں اور ایک ان کی ہے جو عام غذاؤں سے پرورش پاتے ہیں۔ غور کرو! نظام ربوبیت نے دونوں کی پرورش کے لئے کیسا عجیب سروسامان مہیا کر دیا ہے۔ دودھ سے پرورش پانے والے حیوانات میں انسان بھی داخل ہے۔ سب سے پہلے انسان اپنی ہی ہستی کا مطالعہ کرے۔ جوں ہی وہ پیدا ہوتا ہے، اس کی غذا اپنی خاصیتوں مناسبتوں اور شرطوں کے ساتھ خود بخود مہیا ہو جاتی ہے، اور ایسی جگہ مہیا ہوتی ہے جو حالت طفولیت میں اس کے لئے سب سے قریب تر اور سب سے موزوں جگہ ہے۔ ماں بچے کو جوش محبت میں سینے سے لگا لیتی ہے اور وہیں اس کی غذا کا سرچشمہ بھی موجود ہوتا ہے۔ پھر دیکھو! اس غذا کی نوعیت اور مزاج میں اس کی حالت کا درجہ بہ درجہ کس قدر لحاظ رکھا گیا ہے اور کس طرح یکے بعد دیگرے اس میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے! ابتدا میں بچے کا معدہ اتنا کمزور ہوتا ہے کہ اسے بہت ہی ہلکے قوام کا دودھ ملنا چاہئے۔ چنانچہ نہ صرف انسان میں بلکہ تمام حیوانات میں ماں کا دودھ بہت ہی پتلے قوام کا ہوتا ہے، لیکن جوں جوں بچے کی عمر بڑھتی جاتی ہے اور معدہ

قوی ہوتا جاتا ہے، دودھ کا قوام بھی بدلتا جاتا ہے اور مائیت کے مقابلے میں دھنیت بڑھتی جاتی ہے، یہاں تک کہ بچے کا عہد رضاعت پورا ہو جاتا ہے اور اس کا معدہ عام غذاؤں کے ہضم کرنے کی استعداد پیدا کر لیتا ہے۔ جوں ہی اس کا وقت آتا ہے، ماں کا دودھ خشک ہو جاتا ہے یہ گویا ربوبیت الٰہی کا اشارہ ہوتا ہے کہ اب اس کے لئے دودھ کی ضرورت نہیں رہی ، ہر طرح کی غذائیں استعمال کر سکتا ہے۔

وَحَمْلُهُ وَفِصَالُهُ ثَلَاثُونَ شَهْرًا (۴۶:۱۵)

اور حمل اور دودھ چھڑانے کی مدت (کم از کم) تیس مہینوں کی ہے۔

پھر ربوبیت الٰہی کی اس کارسازی پر غور کرو کہ کس طرح ماں کی فطرت میں بچے کی محبت ودیعت کر دی گئی ہے اور کس طرح اس جذبے کو طبیعت بشری کے تمام جذبات میں سب سے زیادہ پر جوش اور سب سے زیادہ ناقابل تسخیر بنا دیا گیا ہے! دنیا کی کون سی قوت ہے جو اس جوش کا مقابلہ کر سکتی ہے جسے ماں کی ممتا کہتے ہیں؟ جس بچے کی پیدائش اس کیلئے زندگی کی سب سے بڑی مصیبت تھی۔

حَمَلَتْهُ أُمُّهُ كُرْهًا وَّ وَضَعَتْهُ كُرْهًا. (۴۶:۱۵)

اس کی ماں نے اسے تکلیف کے ساتھ پیٹ میں رکھا اور تکلیف کے ساتھ جنا۔

اسی کی محبت اس کے اندر زندگی کا سب سے بڑا جذبہ مشتعل کر دیتی ہے۔ جب تک بچہ سن بلوغ تک نہیں پہنچ جاتا ہے وہ اپنے لئے نہیں ، بلکہ بچے کے لئے زندہ رہنا چاہتی ہے۔ زندگی کی کوئی خود فراموشی نہیں جو اس پر طاری نہ ہوتی ہو اور راحت و آسائش کی کوئی قربانی نہیں جس سے اسے گریز ہو۔ حب ذات جو فطرت انسانی کا سب سے زیادہ طاقتور جذبہ ہے اور جس کے انفعالات کے بغیر کوئی مخلوق زندہ نہیں رہ سکتی، وہ بھی اس جذبہ خود فراموشی کے مقابلے میں مضمحل ہو کر رہ جاتا ہے۔ یہ بات کہ ایک ماں نے بچے کے مجنونانہ عشق میں اپنی زندگی قربان کر دی، فطرت مادری کا ایسا معمولی واقعہ ہے جو ہمیشہ پیش آتا رہتا ہے اور ہم اس میں کسی طرح کی غرابت محسوس نہیں کرتے۔

لیکن پھر دیکھو! کارساز فطرت کی یہ کیسی کرشمہ سازی ہے کہ جوں جوں بچے کی عمر بڑھتی جاتی ہے، محبت مادری کا یہ شعلہ خودبخود دھیما پڑتا جاتا ہے اور پھر ایک وقت آتا ہے حیوانات میں بالکل ہی بجھ جاتا ہے اور انسان میں بھی اس کی گرم جوشیاں باقی نہیں رہتیں۔ یہ انقلاب کیوں ہوتا ہے؟ ایسا کیوں ہے کہ بچے کے پیدا ہوتے ہی محبت کا ایک عظیم ترین جذبہ جنبش میں آجائے اور پھر ایک خاص وقت تک قائم رہ کر خودبخود غائب ہو جائے؟ اس لئے کہ یہ نظام ربوبیت کی کارفرمائی ہے اور اس کا مقتضیٰ یہی تھا۔ ربوبیت چاہتی ہے کہ بچے کی پرورش ہو اس نے پرورش کا ذریعہ ماں کے جذبہ محبت میں رکھ دیا۔ جب بچے کی عمر اس حد تک پہنچ گئی کہ ماں کی پرورش کی احتیاج باقی نہ رہی تو اس ذریعے کی بھی ضرورت باقی نہ رہی۔ اب اس کا باقی رہنا ماں کے لئے بوجھ اور بچے کے لئے رکاوٹ ہوتا۔ بچے کی احتیاج کا سب سے زیادہ نازک وقت اس کی نئی نئی طفولیت تھی۔ اس لئے ماں کی محبت میں بھی سب سے زیادہ جوش اسی وقت تھا۔ پھر جوں جوں بچہ بڑھتا گیا، احتیاج کم ہوتی گئی، اس لئے محبت کی گرم جوشیاں بھی گھٹتی گئیں۔ فطرت نے محبت مادری کا دامن بچے کی احتیاج پرورش سے باندھ دیا تھا۔ جب احتیاج زیادہ تھی تو محبت کی سرگرمی بھی زیادہ تھی، جب احتیاج کم ہوگئی تو محبت بھی تغافل کرنے لگی[۱۸]

جن حیوانات کے بچے انڈوں سے پیدا ہوتے ہیں، ان کی جسمانی ساخت اور طبیعت دودھ والے حیوانات سے مختلف ہوتی ہے، اس لئے وہ اول دن ہی سے معمولی غذائیں کھا سکتے ہیں، بشرطیکہ کھلانے کے لئے کوئی شفیق نگرانی موجود ہو۔ چنانچہ تم دیکھتے ہو کہ بچہ انڈے سے نکلتے ہی غذا ڈھونڈھنے لگتا ہے اور ماں چن چن کر اس کے سامنے ڈالتی اور منہ میں لے لے کر کھانے کی تلقین کرتی ہے یا ایسا کرتی ہے کہ خود کھا لیتی ہے مگر ہضم نہیں کرتی۔ اپنے اندر نرم اور ہلکا بنا کر محفوظ رکھتی ہے اور جب بچہ غذا کے لئے منہ کھولتا ہے تو اس کے اندر اتار دیتی ہے۔

ربوبیت معنوی

پھراس سے بھی عجیب تر نظام ربوبیت کا معنوی پہلو ہے۔ خارج میں زندگی اور پرورش کا کتنا ہی سروسامان کیا جاتا، لیکن وہ کچھ مفید نہیں ہوسکتا تھا اگر ہر وجود کے اندر اس سے کام لینے کی ٹھیک ٹھیک استعداد نہ ہوتی اور اس کے ظاہری و باطنی قویٰ اس کا ساتھ نہ دیتے۔ پس یہ ربوبیت ہی کا فیضان ہے کہ ہم دیکھتے ہیں ہر مخلوق کی ظاہری و باطنی بناوٹ اس طرح کی واقع ہوئی ہے کہ اس کی ہر قوت اسکے سامان پرورش کی نوعیت کے مطابق ہوتی ہے اور اس کی ہر چیز اسے زندہ رہنے اور نشو ونما پانے میں مدد دیتی ہے۔ ایسا نہیں ہوسکتا کہ کوئی مخلوق اپنے جسم وقویٰ کی ایسی نوعیت رکھتی ہو جو اس کے حالات پرورش کے مقتضیات کے خلاف ہو۔ اس سلسلے میں جو حقائق مشاہدہ وتفکر سے نمایاں ہوتے ہیں ان میں دو باتیں سب سے زیادہ نمایاں ہیں، اس لئے جابجا قرآن حکیم نے ان پر توجہ دلائی ہے۔ ایک کو وہ تقدیر سے تعبیر کرتا ہے، دوسری کو ہدایت سے۔

تقدیر

تقدیر کے معنی اندازہ کر دینے کے ہیں، یعنی کسی کے لئے ایک خاص طرح کی حالت ٹھہرا دینے کے، خواہ یہ ٹھہراؤ کمیت میں ہو یا کیفیت میں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ فطرت نے ہر وجود کی جسمانی ساخت اور معنوی قویٰ کے لئے ایک خاص طرح کا اندازہ ٹھہرا دیا ہے جس سے وہ باہر نہیں جا سکتا اور یہ اندازہ ایسا ہے جو اس کی زندگی اور نشو ونما کے تمام احوال وظروف سے ٹھیک ٹھیک مناسبت رکھتا ہے۔

وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهُ تَقْدِيرًا ۝ (۲:۲۵)

اور اس نے تمام چیزیں پیدا کیں، پھر ہر چیز کے لئے (اس کی حالت اور ضرورت

کے مطابق) ایک خاص اندازہ ٹھہرایا!

یہ کیا چیز ہے کہ ہر گردوپیش میں اور اس کی پیداوار میں ہمیشہ مطابقت پائی جاتی ہے اور یہ ایک ایسا قانون خلقت ہے جو کبھی متغیر نہیں ہوسکتا؟ یہ کیوں ہے کہ ہر مخلوق اپنی ظاہری و باطنی بناوٹ میں ویسی ہی ہوتی ہے جیسا اس کا گردوپیش ہے اور ہر گردوپیش ویسا ہی ہوتا ہے جیسی اس کی مخلوقات ہوتی ہے؟ یہ اس حکیم وقدیر کی ٹھہرائی ہوئی تقدیر ہے اور اس نے ہر چیز کی خلقت وزندگی کے لئے ایسا ہی اندازہ مقرر کردیا ہے۔ اس کا یہ قانون تقدیر صرف حیوانات ونباتات ہی کے لئے نہیں ہے، بلکہ کائنات ہستی کی ہر چیز کے لئے ہے۔ ستاروں کا یہ پورا نظام گردش بھی اسی تقدیر کی حد بندیوں پر قائم ہے۔

وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ۚ ذٰلِكَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ ۝

(۳۶:۳۸)

اور (دیکھو!) سورج کے لئے جو قرارگاہ ٹھہرادی گئی ہے وہ اسی پر چلتا ہے اور یہ عزیز وعلیم خدا کی اس کے لئے تقدیر ہے۔

مخلوقات اور اس کے گردوپیش کی مطابقت کا یہی قانون ہے جس نے دونوں میں باہم دگر مناسبت پیدا کردی ہے۔ اور ہر مخلوق اپنے چاروں طرف وہی پاتی ہے جس میں اس کے لئے پرورش اور نشوونما کا سامان ہوتا ہے۔ پرند کا جسم اڑنے والا ہے، مچھلی کا تیرنے والا، چارپایوں کا چلنے والا، حشرات کا رینگنے والا، اس لئے کہ ان میں سے ہر نوع کا گردوپیش ویسے ہی جسم کے لئے موزوں ہے جیسا اسے ملا ہے اور اس لئے کہ ان میں سے ہر نوع کی جسمانی ساخت ویسا ہی گردوپیش چاہتی ہے جیسا گردوپیش اسے حاصل ہے۔ دریا میں پرند پیدا نہیں ہوتا، اس لئے کہ یہ گردوپیش اس کے لئے مفید پرورش نہیں۔ خشکی میں مچھلیاں پیدا نہیں ہوسکتیں کیونکہ خشکی ان کے لئے موزوں نہیں۔ اگر فطرت کی اس تقدیر کے خلاف ایک خاص گردوپیش کی مخلوق دوسرے قسم کے گردوپیش چلی جاتی ہے تو یا تو وہاں زندہ نہیں رہتی یا رہتی ہے تو پھر بتدریج اس کی جسمانی ساخت اور طبیعت بھی ویسی ہی ہوجاتی ہے جیسی اس

گردوپیش میں ہونی چاہئے۔

پھر ان میں سے ہر نوع کے لئے مقامی موثرات کے مختلف گردوپیش ہیں اور ہر گردوپیش کا یہی حال ہے۔ سرد آب وہوا کی پیداوار، سرد آب وہوا ہی کے لئے ہے، گرم کی گرم کے لئے۔ قطب شمالی کے قرب وجوار کا ریچھ خط استواء کے قرب میں نظر نہیں آسکتا اور منطقہ حارہ کے جانور منطقہ باردہ میں معدوم ہیں۔

ہدایت

ہدایت کے معنی راہ دکھانے، راہ پر لگا دینے، رہنمائی کرنے کے ہیں اور اس کے مختلف مراتب اور اقسام ہیں۔ تفصیل آگے آئے گی۔ یہاں صرف اس مرتبہ ہدایت کا ذکر کرنا ہے جو تمام مخلوقات پر ان کی پرورش کی راہیں کھولتا، انہیں زندگی کی راہ پر لگاتا اور ضروریات زندگی کی طلب وحصول میں رہنمائی کرتا ہے۔ فطرت کی یہ ہدایت ربوبیت کی ہدایت ہے اور اگر ہدایت کی دستگیری نہ ہوتی تو ممکن نہ تھا کہ کوئی مخلوق بھی دنیا کے سامان حیات و پرورش سے فائدہ اٹھا سکتی اور زندگی کی سرگرمیاں ظہور میں آسکتیں۔

لیکن ربوبیت الٰہی کی یہ ہدایت کیا ہے؟ قرآن کہتا ہے یہ وجدان کا فطری الہام اور حواس وادراک کی قدرتی استعداد ہے۔ وہ کہتا ہے یہ فطرت کی وہ رہنمائی ہے جو ہر مخلوق کے اندر پہلے وجدان کا الہام بن کر نمودار ہوتی ہے، پھر حواس وادراک کا چراغ روشن کر دیتی ہے۔ یہ ہدایت کے مختلف مراتب میں سے وجدان اور ادراک کی ہدایت کے مراتب ہیں۔

ہدایتِ وجدان

وجدان کی ہدایت یہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں ہر مخلوق کی طبیعت میں کوئی ایسا اندرونی الہام موجود ہے جو اسے زندگی اور پرورش کی راہوں پر خود بخود لگا دیتا ہے اور وہ باہر کی رہنمائی وتعلیم کی محتاج نہیں ہوتی۔ انسان کا بچہ ہو یا حیوان کا، جونہی شکم مادر سے باہر آتا ہے خود بخود معلوم کر لیتا ہے کہ اس کی غذا ماں کے سینے میں ہے اور جب پستان منہ میں لیتا ہے تو جانتا

ہے کہ اسے زور زور سے چوسنا چاہئے۔ بلی کے بچوں کو ہمیشہ دیکھتے ہیں کہ ابھی ابھی پیدا ہوئے ہیں، ان کی آنکھیں بھی نہیں کھلی ہیں، لیکن ماں جوش محبت میں انہیں چاٹ رہی ہے، وہ اس کے سینے پر منہ مار رہے ہیں۔ یہ بچہ جس نے عالم ہستی میں ابھی ابھی قدم رکھا ہے، جسے خارج کے موثرات نے چھوا تک نہیں کس طرح معلوم کر لیتا ہے کہ اسے پستان منہ میں لے لینا چاہئے اور اس کی غذا کا سرچشمہ یہیں ہے؟ وہ کون سا فرشتہ ہے جو اس وقت اسکے کان میں پھونک دیتا ہے کہ اس طرح اپنی غذا حاصل کر لے؟ یقیناً وہ وجدانی ہدایت کا فرشتہ ہے اور یہی وجدانی ہدایت ہے جو قبل اس کے کہ حواس وادراک کی روشنی نمودار ہو، ہر مخلوق کو اس کی پرورش وزندگی کی راہوں پر لگا دیتی ہے۔

تمہارے گھر میں پلی ہوئی بلی ضرور ہوگی تم نے دیکھا ہوگا کہ بلی اپنی عمر میں پہلی مرتبہ حاملہ ہوئی ہے۔ اس حالت کا اسے کوئی پچھلا تجربہ حاصل نہیں تاہم اس کے اندر کوئی چیز ہے جو اسے بتا دیتی ہے کہ تیاری وحفاظت کی سرگرمیاں شروع کر دینی چاہئیں جونہی وضع حمل کا وقت آتا ہے، خود بخود اس کی توجہ ہر چیز کی طرف سے ہٹ جاتی ہے اور کسی محفوظ گوشے کی جستجو شروع کر دیتی ہے۔ تم نے دیکھا ہوگا کہ مضطرب الحال بلی مکان کا ایک ایک کونہ دیکھتی پھرتی ہے پھر وہ خود بخود ایک سب سے محفوظ اور علیحدہ گوشہ چھانٹ لیتی ہے اور وہاں بچہ دیتی ہے۔ پھر یکا یک اس کے اندر بچے کی حفاظت کی طرف سے ایک مجہول خطرہ پیدا ہو جاتا ہے اور وہ یکے بعد دیگرے اپنی جگہ بدلتی رہتی ہے۔ غور کرو! یہ کون سی قوت ہے جو بلی کے اندر خیال پیدا کر دیتی ہے کہ محفوظ جگہ تلاش کرے، کیونکہ عنقریب ایسی جگہ کی اسے ضرورت ہوگی؟ یہ کون سا الہام ہے جو اسے خبردار کر دیتا ہے کہ بلا بچوں کا دشمن اور ان کی بو سونگھتا پھرتا ہے اس لئے جگہ بدلتے رہنا چاہئے؟ بلاشبہ یہ ربوبیت الٰہی کی وجدانی ہدایت ہے جس کا الہام ہر مخلوق کے اندر اپنی نمود رکھتا ہے اور جوان پر زندگی اور پرورش کی تمام راہیں کھول دیتا ہے۔

ہدایت حواس

ہدایت کا دوسرا مرتبہ حواس اور مدرکات ذہنی کی ہدایت ہے اور وہ اس درجہ واضح و معلوم ہے کہ تشریح کی ضرورت نہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اگرچہ حیوانات اس جوہر دماغ سے محروم ہیں جسے فکر و عقل سے تعبیر کیا جاتا ہے، تاہم فطرت نے انہیں احساس و ادراک کی وہ تمام قوتیں دے دی ہیں جن کی زندگی و معیشت کے لئے ضرورت تھی اور ان کی مدد سے وہ اپنے رہنے سہنے، کھانے پینے، توالد و تناسل اور حفاظت و نگرانی کے تمام وظائف حسن و خوبی کے ساتھ انجام دیتے رہتے ہیں۔ پھر حواس و ادراک کی یہ ہدایت ہر حیوان کے لئے ایک ہی طرح کی نہیں ہے بلکہ ہر وجود کو اتنی ہی اور ویسی ہی استعداد دی گئی ہے جتنی اور جیسی استعداد اس کے احوال و ظروف کے لئے ضروری تھی۔ چیونٹی کی قوت شامہ نہایت دوررس ہوتی ہے اس لئے کہ اسی قوت کے ذریعے وہ اپنی غذا حاصل کرسکتی ہے۔ چیل اور عقاب کی نگاہ تیز ہوتی ہے کیونکہ اگر ان کی نگاہ تیز نہ ہو تو بلندی میں اڑتے ہوئے اپنا شکار دیکھ نہ سکیں۔ یہ سوال بالکل غیر ضروری ہے کہ حیوانات کے حواس و ادراک کی یہ حالت اول دن سے تھی یا احوال و ظروف کی ضروریات اور قانون مطابقت کے موثرات سے بتدریج ظہور میں آئی۔ اس لئے کہ خواہ کوئی صورت ہو، بہر حال فطرت کی بخشی ہوئی استعداد ہے اور نشو و نما ارتقاء کا قانون بھی فطرت ہی کا ٹھہرایا ہوا قانون ہے۔

چنانچہ یہی مرتبہ ہدایت ہے جس کو قرآن نے ربوبیت الٰہی کی ''وحی'' سے تعبیر کیا ہے۔ عربی میں وحی کے معنی مخفی ایماء اور اشارے کے ہیں یہ گویا فطرت کی وہ اندرونی سرگوشی ہے جو ہر مخلوق پر اس کی راہ عمل کھول دیتی ہے۔

وَاَوْحٰی رَبُّکَ اِلَی النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِیْ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا وَّ مِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا یَعْرِشُوْنَ ۝ (۱۶:۶۸)

اور دیکھو! تمہارے پروردگار نے شہد کی مکھی کے دل میں یہ بات ڈال دی کہ پہاڑوں میں اور درختوں میں اور ان ٹٹیوں میں جو اس غرض سے بلند کی جاتی ہیں،

اپنے لئے چھتے بنائے۔

اور یہی وہ ربوبیت الٰہی کی ہدایت ہے جس کی طرف حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی زبانی اشارہ کیا گیا ہے۔ فرعون نے جب پوچھا:

فَمَنْ رَّبُّكُمَا يٰمُوْسٰى ؟ تمہارا پروردگار کون ہے؟

تو حضرت موسیٰ نے کہا:

رَبُّنَا الَّذِىٓ اَعْطٰى كُلَّ شَىْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى ٥ (٢٠:٥٠)

ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی بناوٹ دی پھر اس پر (زندگی و معیشت کی) راہ کھول دی۔

اور پھر یہی وہ ہدایت ہے جسے دوسری جگہ ''راہ عمل آسان کر دینے'' سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔

مِنْ اَىِّ شَىْءٍ خَلَقَهٗ ٥ مِنْ نُّطْفَةٍ ؕ خَلَقَهٗ فَقَدَّرَهٗ ٥ ثُمَّ السَّبِيْلَ يَسَّرَهٗ ٥ (٨٠:١٨-٢٠)

اس نے انسان کو کس چیز سے پیدا کیا؟ نطفہ سے پیدا کیا پھر اس (کی تمام ظاہری و باطنی قوتوں) کے لئے ایک اندازہ ٹھہرا دیا، پھر اس پر (زندگی و عمل کی) راہ آسان کر دی۔

یہی ''ثُمَّ السَّبِيْلَ يَسَّرَهٗ'' یعنی ''راہ عمل آسان کر دینا'' وجدان و ادراک کی ہدایت ہے جو تقدیر کے بعد ہے، کیونکہ اگر فطرت کی یہ رہنمائی نہ ہوتی تو ممکن نہ تھا کہ ہم اپنی ضروریات زندگی حاصل کر سکتے۔

آگے چل کر تمہیں معلوم ہوگا کہ قرآن نے تکوین وجود کے جو چار مرتبے بیان کئے ہیں، ان میں سے تیسرا اور چوتھا مرتبہ یہی تقدیر اور ہدایت کا مرتبہ ہے۔ تخلیق، تسویہ، تقدیر، ہدایت۔

اَلَّذِىْ خَلَقَ فَسَوّٰى ٥ وَالَّذِىْ قَدَّرَ فَهَدٰى ٥ (٨٧:٢-٣)

وہ پروردگار عالم جس نے پیدا کیا پھر اسے ٹھیک ٹھیک درست کر دیا اور جس نے ہر وجود کے لئے ایک اندازہ ٹھہرا دیا پھر اس پر راہ (عمل) کھول دی۔

براہین قرآنیہ کا مبدءِ استدلال

چنانچہ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے خدا کی ہستی اور اس کی توحید و صفات پر جا بجا نظام ربوبیت سے استدلال کیا ہے اور یہ استدلال اس کے مہمات دلائل میں سے ہے۔ لیکن قبل اس کے کہ اس کی تشریح کی جائے مناسب ہوگا کہ قرآن کے طریق استدلال کی بعض مبادیات واضح کر دی جائیں کیونکہ مختلف اسباب سے جن کی تشریح کا یہ موقع نہیں، مطالب قرآنی کا یہ گوشہ سب سے زیادہ مہجور ہو گیا ہے اور ضرورت ہے کہ از سرِ نو حقیقت گم گشتہ کا سراغ لگایا جائے۔

دعوت تعقل

قرآن کے طریق استدلال کا اولین مبدء تعقل و تفکر کی دعوت ہے، یعنی وہ جا بجا اس بات پر زور دیتا ہے کہ انسان کے لئے حقیقت شناسی کی راہ یہی ہے کہ خدا کی دی ہوئی عقل و بصیرت سے کام لے اور اپنے وجود کے اندر اور اپنے وجود کے باہر جو کچھ بھی محسوس کر سکتا ہے اس میں تدبر و تفکر کرے۔ چنانچہ قرآن کی کوئی سورۃ اور سورۃ کا کوئی حصہ نہیں جو تفکر و تعقل کی دعوت سے خالی ہو۔

وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِّلْمُوقِنِينَ ٥ وَفِي أَنفُسِكُمْ أَفَلَا تُبْصِرُونَ ٥

(۵۱:۲۰۔۲۱)

اور یقین رکھنے والوں کے لئے زمین میں بھی (معرفت حق کی) نشانیاں ہیں اور خود تمہارے وجود میں بھی، پھر کیا تم دیکھتے نہیں۔

وہ کہتا ہے: انسان کو عقل وبصیرت دی گئی ہے، اس لئے وہ اس قوت کے ٹھیک ٹھیک استعمال کرنے نہ کرنے کے لئے جواب دہ ہے۔

اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا. (۱۷:۳۶)

یقیناً (انسان کا) سننا، دیکھنا، سوچنا، سب اپنی اپنی جگہ جواب دہی رکھتے ہیں!

وہ کہتا ہے: زمین کی ہر چیز میں، آسمان کے ہر منظر میں، زندگی کے ہر تغیر میں، فکر انسانی کے لئے معرفت وحقیقت کی نشانیاں ہیں، بشرطیکہ وہ غفلت واعراض میں مبتلا نہ ہو جائے۔

وَكَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ○ (۱۲:۱۰۵)

اور آسمان وزمین میں (معرفت حق کی) کتنی ہی نشانیاں ہیں۔ لیکن (افسوس انسان کی غفلت پر!) لوگ ان پر سے گزر جاتے ہیں اور نظر اٹھا کر دیکھتے تک نہیں!

تخلیق بالحق

اچھا! اگر انسان عقل وبصیرت سے کام لے اور کائنات خلقت میں تفکر کرے تو اس پر حقیقت شناسی کا کون سا دروازہ کھلے گا؟ وہ کہتا ہے: سب سے پہلی حقیقت جو اس کے سامنے نمودار ہوگی وہ تخلیق بالحق کا عالم گیر اور بنیادی قانون ہے، یعنی وہ دیکھے گا کہ کائنات خلقت اور اس کی ہر چیز کی بناوٹ کچھ اس طرح کی واقع ہوئی ہے کہ ہر چیز ضبط وترتیب کے ساتھ ایک خاص نظام وقانون میں منسلک ہے اور کوئی شے نہیں جو حکمت ومصلحت سے خالی ہو۔ ایسا نہیں ہے کہ یہ سب کچھ تخلیق بالباطل ہو، یعنی بغیر کسی معین اور ٹھہرائے ہوئے مقصد و نظم کے وجود میں آ گیا ہو۔ کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو ممکن نہ تھا کہ اس نظم، اس یکسانیت، اس دقت کے ساتھ اس کی ہر بات کسی نہ کسی حکمت ومصلحت کے ساتھ بندھی ہوئی ہوتی۔ [19]

خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ○ (۲۹:۴۴)

اللہ نے آسمانوں کو اور زمین کو حکمت اور مصلحت کے ساتھ پیدا کیا ہے، اور بلاشبہ اس بات میں ارباب ایمان کے لئے (معرفت حق کی) ایک بڑی ہی نشانی ہے!

''آل عمران'' کی مشہور آیت میں ان ارباب دانش کی جو آسمان و زمین کی خلقت میں تفکر کرتے ہیں، صدائے حال یہ بتائی ہے:

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا. (۳:۱۹۱)

اے ہمارے پروردگار! سب کچھ تو نے اس لئے پیدا نہیں کیا ہے کہ محض ایک بے کار وعبث سا کام ہو!

دوسری جگہ ''تخلیق بالباطل'' کو تلعب سے تعبیر کیا ہے۔ ''تلعب'' یعنی کوئی کام کھیل کود کی طرح بغیر کسی معقول غرض و مدعا کے کرنا۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ○ وَمَا خَلَقْنٰهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ○ (۴۴:۳۸-۳۹)

ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، محض کھیل اور تماشہ کرتے ہوئے نہیں پیدا کیا ہے۔ ہم نے انہیں نہیں پیدا کیا مگر حکمت و مصلحت کے ساتھ مگر اکثر انسان ایسے ہیں جو اس حقیقت کا علم نہیں رکھتے۔

پھر جا بجا اس ''تخلیق بالحق'' کی تشریح کی ہے۔ مثلاً ایک مقام پر ''تخلیق بالحق'' کے اس پہلو پر توجہ دلائی ہے کہ کائنات کی ہر چیز افادہ و فیضان کے لئے ہے اور فطرت چاہتی ہے کہ جو کچھ بنائے، اس طرح بنائے کہ اس میں وجود اور زندگی کے لئے نفع اور راحت ہو:

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ يُكَوِّرُ الَّيْلَ عَلَى النَّهَارِ وَيُكَوِّرُ النَّهَارَ عَلَى الَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ؕ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ اَلَا هُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفَّارُ○ (۳۹:۵)

اس نے آسمانوں اور زمین کو حکمت و مصلحت کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ اس نے رات اور دن کے اختلاف اور ظہور کا ایسا انتظام کر دیا کہ رات دن پر لپٹی جاتی ہے اور دن

رات پر لپٹا آتا ہے۔ اور سورج اور چاند دونوں کو اس کی قدرت نے مسخر کر رکھا ہے۔ سب (اپنی اپنی جگہ) اپنے مقررہ وقت تک کے لئے گردش کر رہے ہیں۔ (سنو! وہ غالب اور بخشنے والا ہے[21]۔)

ایک دوسرے موقع پر خصوصیت کے ساتھ اجرام سماویہ کے افادہ فیضان پر توجہ دلائی ہے اور اسے ''تخلیق بالحق'' سے تعبیر کیا ہے:

هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَاءً وَّ الْقَمَرَ نُوْرًا وَّ قَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَ الْحِسَابَ ؕ مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْحَقِّ ۚ يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ○ (۱۰:۵)

وہی ہے جس نے سورج کو چمکتا ہوا بنایا اور چاند کو روشن اور پھر چاند کی منزلوں کا انداز ٹھہرا دیا تاکہ تم برسوں کی گنتی اور حساب معلوم کر لیا کرو اللہ نے یہ سب کچھ بنایا ہیمگر حکمت و مصلحت کے ساتھ ان لوگوں کے لئے جو جاننے والے ہیں، وہ (اپنی قدرت اور حکمت کی) دلیلیں کھول کھول کر بیان کر دیتا ہے۔

ایک اور موقع پر فطرت کے جمال و زیبائی کی طرف اشارہ کیا ہے اور اسے ''تخلیق بالحق'' سے تعبیر کیا ہے، یعنی فطرت کائنات میں تحسین و آرائش کا قانون کام کر رہا ہے جو چاہتا ہے جو کچھ بنے، ایسا بنے کہ اس میں حسن و جمال اور خوبی و کمال ہو۔

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ ○ (۶۴:۳)

اس نے آسمانوں اور زمین کو حکمت و مصلحت کے ساتھ پیدا کیا اور تمہاری صورتیں بنائیں تو نہایت حسن و خوبی کے ساتھ بنائیں۔

اسی طرح وہ قانون مجازات پر (یعنی جزاء و سزا کے قانون پر) بھی اسی (تخلیق بالحق) سے استشہاد کرتا ہے۔ تم دیکھتے ہو کہ دنیا میں ہر چیز کوئی نہ کوئی خاصہ اور نتیجہ رکھتی ہے اور تمام خواص اور نتائج لازمی اور اٹل ہیں۔ پھر کیونکر ممکن ہے کہ انسان کے اعمال میں بھی اچھے اور برے خواص اور نتائج نہ ہوں اور وہ قطعی اور اٹل نہ ہوں جو قانون فطرت دنیا کی ہر چیز میں اچھے برے کا امتیاز رکھتا ہے، کیا انسان کے اعمال میں اس امتیاز سے غافل ہو جائے گا؟

اَمۡ حَسِبَ الَّذِیۡنَ اجۡتَرَحُوا السَّیِّاٰتِ اَنۡ نَّجۡعَلَهُمۡ كَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَوَآءً مَّحۡیَاهُمۡ وَمَمَاتُهُمۡ ؕ سَآءَ مَا یَحۡكُمُوۡنَ ۠ وَخَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ بِالۡحَقِّ وَلِتُجۡزٰی كُلُّ نَفۡسٍۭ بِمَا كَسَبَتۡ وَهُمۡ لَا یُظۡلَمُوۡنَ ۝ (۴۵:۲۱-۲۲)

جو لوگ برائیاں کرتے ہیں، کیا وہ سمجھتے ہیں ہم انہیں ان لوگوں جیسا کر دیں گے جو ایمان لائے اور جن کے اعمال اچھے ہیں، یعنی دونوں برابر ہو جائیں زندگی میں بھی اور موت میں بھی۔ (اگر ان لوگوں کے فہم و دانش کا فیصلہ یہی ہے تو) کیا ہی برا ان کا فیصلہ ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے آسمانوں کو اور زمین کو حکمت و مصلحت کے ساتھ پیدا کیا ہے اور اس لئے پیدا کیا ہے کہ ہر جان اپنی کمائی کے مطابق بدلا پالے اور ایسا نہیں ہوگا کہ ان کے ساتھ ناانصافی ہو۔

معاد، یعنی مرنے کے بعد کی زندگی پر بھی اس سے جا بجا استشہاد کیا ہے۔ کائنات میں ہر چیز کوئی نہ کوئی مقصد اور منتہیٰ رکھتی ہے۔ پس ضروری ہے کہ انسانی وجود کے لئے بھی کوئی نہ کوئی مقصد اور منتہیٰ ہو۔ یہی منتہیٰ آخرت کی زندگی ہے، کیونکہ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ کائنات ارضی کی یہ بہترین مخلوق صرف اسی لئے پیدا کی گئی ہو کہ پیدا ہو اور چند دن جی کر فنا ہو جائے۔

اَوَلَمۡ یَتَفَكَّرُوۡا فِیۡۤ اَنۡفُسِهِمۡ مَا خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ وَمَا بَیۡنَهُمَاۤ اِلَّا بِالۡحَقِّ وَاَجَلٍ مُّسَمًّی ؕ وَاِنَّ كَثِیۡرًا مِّنَ النَّاسِ بِلِقَآئِ رَبِّهِمۡ لَكٰفِرُوۡنَ ۝ (۳۰:۸)

کیا ان لوگوں نے کبھی اپنے دل میں اس بات پر غور نہیں کیا کہ اللہ نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، محض بے کار و عبث نہیں بنایا ہے۔ ضروری ہے کہ حکمت و مصلحت کے ساتھ بنایا ہو اور اس کے لئے ایک مقررہ وقت ٹھہرا دیا ہو۔ اصل یہ ہے کہ انسانوں میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو اپنے پروردگار کی ملاقات سے یک قلم منکر ہیں۔

مبدء استدلال

غرض کہ قرآن کا مبدء استدلال یہ ہے کہ:

۱۔ اس کے نزول کے وقت دین داری اور خدا پرستی کے جس قدر عام تصورات موجود تھے وہ نہ صرف عقل کی آمیزش سے خالی تھے، بلکہ ان کی تمام تر بنیاد غیر عقلی عقائد پر آکر ٹھہر گئی تھی، لیکن اس نے خدا پرستی کے لئے عقلی تصور پیدا کیا۔

۲۔ اس کی دعوت کی تمام تر بنیاد تعقل و تفکر پر ہے۔ اور وہ خصوصیت کے ساتھ کائنات خلقت کے مطالعے و تفکر کی دعوت دیتا ہے۔

۳۔ وہ کہتا ہے: کائنات خلقت کے مطالعہ و تفکر سے انسان پر تخلیق بالحق کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔ یعنی وہ دیکھتا ہے کہ اس کارخانہ ہستی کی کوئی چیز نہیں جو کسی ٹھہرائے ہوئے مقصد اور مصلحت سے خالی ہو اور کسی بالاتر قانون خلقت کے ماتحت ظہور میں نہ آئی ہو۔ یہاں جو چیز بھی اپنا وجود رکھتی ہے ایک خاص نظم و ترتیب کے ساتھ حکمتوں اور مصلحتوں کے عالم گیر سلسلے میں بندھی ہوئی ہے۔

۴۔ وہ کہتا ہے: جب انسان ان مقاصد و مصالح پر غور کرے گا تو عرفان حقیقت کی راہ خود بخود اس پر کھل جائے گی اور جہل و کوری کی گمراہی سے نجات پا جائے گا۔

برھان ربوبیت

چنانچہ اس سلسلہ میں مظاہر کائنات کے جن مقاصد و مصالح سے استدلال کیا ہے ان میں سب سے زیادہ عام استدلال ”ربوبیت“ کا استدلال ہے اور اسی لئے ہم اسے برہان ربوبیت سے تعبیر کر سکتے ہیں وہ کہتا ہے کائنات کے تمام اعمال و مظاہر کا اس طرح واقع ہونا کہ ہر چیز پرورش کرنے والی اور ہر تاثیر زندگی بخشنے والی ہے اور پھر ایک ایسے نظام ربوبیت کا موجود ہونا جو ہر حالت کی رعایت کرتا اور ہر طرح کی مناسبت ملحوظ رکھتا ہے، ہر انسان کو وجدانی

طور پر یقین دلا دیتا ہے کہ ایک پرور دگار عالم ہستی موجود ہے اور وہ ان تمام صفتوں سے متصف ہے جن کے بغیر نظام ربوبیت کا یہ کامل اور بے عیب کارخانہ وجود میں نہیں آسکتا تھا۔

وہ کہتا ہے: کیا انسان کا وجدان یہ باور کرسکتا ہے کہ نظام ربوبیت کا یہ پورا کارخانہ خود بخود وجود میں آجائے اور کوئی زندگی، کوئی ارادہ، کوئی حکمت اس کے اندر کارفرما نہ ہو؟ کیا یہ ممکن ہے کہ اس کارخانہ ہستی کی ہر چیز میں ایک بولتی ہوئی پروردگاری اور ایک ابھری ہوئی کارسازی موجود ہو، مگر کوئی پروردگار، کوئی کارساز موجود نہ ہو؟ پھر کیا یہ محض ایک اندھی بہری فطرت، بے جان مادہ اور بے حس الیکٹرون (Electrone) کے خواص ہیں جن سے پروردگاری و کارسازی کا یہ پورا کارخانہ ظہور میں آگیا ہے۔ اور عقل اور ارادہ رکھنے والی کوئی ہستی موجود نہیں؟

پروردگاری موجود ہے مگر کوئی پروردگار موجود نہیں! کارسازی موجود ہے مگر کوئی کارساز موجود نہیں! رحمت موجود ہے مگر کوئی رحیم نہیں! حکمت موجود ہے مگر کوئی حکیم موجود نہیں! سب کچھ موجود ہے مگر کوئی موجود نہیں! عمل بغیر کسی عامل کے، نظم بغیر کسی ناظم کے، قیام بغیر کسی قیوم کے، عمارت بغیر کسی معمار کے، نقش بغیر کسی نقاش کے، سب کچھ بغیر کسی موجود کے! نہیں، انسان کی فطرت کبھی یہ باور نہیں کرسکتی۔ اس کا وجدان پکارتا ہے کہ ایسا ہونا ممکن نہیں۔ اس کی فطرت اپنی بناوٹ میں ایک ایسا سانچا لے کر آئی ہے جس میں یقین و ایمان ہی ڈھل سکتا ہے، شک اور انکار کی اس میں سمائی نہیں!

قرآن کہتا ہے: یہ بات انسان کے وجدانی اذعان کے خلاف ہے کہ وہ نظام ربوبیت کا مطالعہ کرے اور ایک "رب العالمین" ہستی کا یقین اسکے اندر جاگ نہ اٹھے۔ وہ کہتا ہے: ایک انسان غفلت کی سرشاری اور سرکشی کے ہیجان میں ہر چیز سے انکار کرسکتا ہے لیکن اپنی فطرت سے انکار نہیں کرسکتا۔ وہ ہر چیز کے خلاف جنگ کرسکتا ہے لیکن اپنی فطرت کے خلاف ہتھیار نہیں اٹھا سکتا۔ وہ جب اپنے چاروں طرف زندگی اور پروردگاری کا ایک عالم گیر کارخانہ پھیلا ہوا دیکھتا ہے تو اس کی فطرت کی صدا کیا ہوتی ہے؟ اس کے دل کے ایک

ریشے میں کون سا اعتقاد سمایا ہوتا ہے؟ کیا یہی نہیں ہوتا کہ ایک پروردگار ہستی موجود ہے اور یہ سب کچھ اسی کی کرشمہ سازیاں ہیں؟

یہ یاد رکھنا چاہئے کہ قرآن کا اسلوب بیان یہ نہیں ہے کہ نظری مقدمات اور ذہنی مسلمات کی شکلیں ترتیب دے پھر اس پر بحث وتقریر کر کے مخاطب کو رد وتسلیم پر مجبور کرے۔ اس کا تمام تر خطاب انسان کے فطری وجدان وذوق سے ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے: خدا پرستی کا جذبہ انسانی فطرت کا خمیر ہے۔ اگر ایک انسان اس سے انکار کرنے لگتا ہے تو یہ اس کی غفلت ہے اور ضروری ہے کہ اسے غفلت سے چونکا دینے کے لئے دلیلیں پیش کی جائیں لیکن یہ دلیل ایسی نہیں ہونی چاہئے جو محض ذہن ودماغ میں کاوش پیدا کرے، بلکہ ایسی ہونی چاہئے جو اس کے نہاں خانہ دل پر دستک دے دے اور اس کا فطری وجدان بیدار کر دے۔ اگر اس کا وجدان بیدار ہو گیا تو پھر اثبات مدعا کے لئے بحث وتقریر کی ضرورت نہ ہوگی، خود اس کا وجدان ہی اسے مدعا تک پہنچا دے گا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن خود انسان کی فطرت ہی سے انسان پر حجت لاتا ہے۔

بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ ۝ وَّلَوْ اَلْقٰی مَعَاذِيْرَهٗ ؕ (۷۵:۱۴-۱۵)

بلکہ انسان کا وجود خود اس کے خلاف (یعنی اس کی کج اندیشیوں کے خلاف) حجت ہے۔ اگرچہ وہ (اپنے وجدان کے خلاف) کتنے ہی عذر بہانے تراش لیا کرے۔

اور اسی لئے وہ جا بجا فطرت انسانی کو مخاطب کرتا ہے اور اس کی گہرائیوں سے جواب طلب کرتا ہے۔

قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ؕ اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَمَنْ يُّخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَمَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ ؕ فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ فَقُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ۝ فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ ۝

(۱۰:۳۱-۳۲)

(اے پیغمبران سے کہو: [۲۲] وہ کون ہے جو آسمان (میں پھیلے ہوئے کارخانہ حیات) سے اور زمین (کی وسعت میں پیدا ہونے والے سامان رزق) سے تمہیں روزی بخش رہا ہے؟ وہ کون ہے جس کے قبضہ میں تمہارا سننا اور دیکھنا ہے؟ وہ کون ہے جو بے جان سے جان دار کو اور جان دار سے بے جان کو نکالتا ہے، اور پھر وہ کون سی ہستی ہے جو یہ تمام کارخانہ خلقت اس نظم و نگرانی کے ساتھ چلا رہی ہے؟ (اے پیغمبر!) یقیناً وہ (بے اختیار) بول اٹھیں گے: اللہ ہے، (اس کے سوا کون ہوسکتا ہے؟) اچھا تم ان سے کہو: جب تمہیں اس بات سے انکار نہیں تو پھر یہ کیوں ہے کہ غفلت و سرکشی سے نہیں بچتے؟ ہاں بے شک یہ اللہ ہی ہے جو تمہارا پروردگار برحق ہے اور جب یہ حق ہے تو حق کے ظہور کے بعد اسے نہ ماننا گمراہی نہیں تو اور کیا ہے؟ (افسوس تمہاری سمجھ پر) تم (حقیقت سے منہ پھرائے) کہاں جارہے ہو؟

ایک دوسرے موقع پر فرمایا۔

اَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ حَدَآئِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُنْۢبِتُوْا شَجَرَهَا ءَ اِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ بَلْ هُمْ قَوْمٌ يَّعْدِلُوْنَ○ اَمَّنْ جَعَلَ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّ جَعَلَ خِلٰلَهَاۤ اَنْهٰرًا وَّ جَعَلَ لَهَا رَوَاسِيَ وَجَعَلَ بَيْنَ الْبَحْرَيْنِ حَاجِزًا ؕ○ ءَ اِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ○ اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوْٓءَ وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ ؕ ءَ اِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ○ اَمَّنْ يَّهْدِيْكُمْ فِيْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَنْ يُّرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًا ۢ بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ ؕ ءَ اِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ تَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ○ اَمَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَمَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ؕ ءَ اِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ○ (۲۷: ۶۰-۶۴)

وہ کون ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور جس نے آسمانوں سے تمہارے لئے پانی برسایا، پھر اس آب پاشی سے خوش نما باغ اگا دیئے، حالانکہ تمہارے بس کی یہ بات نہ تھی کہ ان باغوں کے درخت اگاتے۔ کیا ان کاموں کا کرنے والا اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا معبود بھی ہے؟ (افسوس ان لوگوں کی سمجھ پر! حقیقت حال کتنی ہی ظاہر ہو) مگر یہ وہ لوگ ہیں جن کا شیوہ ہی کج روی ہے۔

اچھا بتلاؤ! اور کون ہے جس نے زمین کو (زندگی و معیشت کا) ٹھکانا بنا دیا، اس کے درمیان نہریں جاری کر دیں، اس (کی درستگی) کے لئے پہاڑ بلند کر دیئے دو دریاؤں میں (یعنی دریا اور سمندر میں ایسی) دیوار حائل کر دی (کہ دونوں اپنی اپنی جگہ محدود رہتے ہیں) کیا اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا بھی ہے؟ (افسوس! کتنی واضح بات ہے) مگر ان لوگوں میں اکثر ایسے ہیں جو نہیں جانتے۔

اچھا بتلاؤ! وہ کون ہے جو بے قرار دلوں کی پکار سنتا ہے جب وہ (ہر طرف سے مایوس ہو کر) اسے پکارنے لگتے ہیں اور ان کا درد دکھ ٹال دیتا ہے، اور وہ کہ اس نے تمہیں زمین کا جانشیں بنایا ہے؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا بھی ہے (افسوس تمہاری غفلت پر!) بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ تم نصیحت پذیر ہو!

(اچھا بتلاؤ!) وہ کون ہے جو صحراؤں اور سمندروں کی تاریکیوں میں تمہاری رہنمائی کرتا ہے؟ وہ کون ہے جو باران رحمت سے پہلے خوش خبری دینے والی ہوائیں چلا دیتا ہے؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا بھی معبود ہے؟ (ہرگز نہیں) اللہ کی ذات اس ساجھے سے پاک و منزہ ہے جو یہ لوگ اس کی معبودیت میں ٹھہرا رہے ہیں۔

اچھا بتاؤ! وہ کون ہے جو مخلوقات کی پیدائش شروع کرتا ہے اور پھر اسے دہراتا ہے اور وہ کون ہے جو آسمان و زمین کے کارخانہ ہائے رزق سے تمہیں روزی دے رہا ہے؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا معبود بھی ہے؟ (اے پیغمبر!) ان سے کہو اگر تم (اپنے رویے میں) سچے ہو (اور انسانی عقل و بصیرت کی اس عالم گیر شہادت کے خلاف

تمہارے پاس کوئی دلیل ہے) تو اپنی دلیل پیش کرو۔

ان سوالات میں سے ہر سوال اپنی جگہ ایک مستقل دلیل ہے، کیونکہ ان میں سے ہر سوال کا صرف ایک ہی جواب ہوسکتا ہے اور وہ فطرت انسانی کا عالم گیر اور مسلمہ اذعان ہے ہمارے متکلموں کی نظر اس پہلو پر نہ تھی، اس لئے قرآن کا اسلوب استدلال ان پر واضح نہ ہوسکا اور دور دراز گوشوں میں بھٹک گئے۔

بہرحال قرآن کے وہ بے شمار مقامات جن میں کائنات ہستی کے سروسامان پرورش اور نظام ربوبیت کی کارسازیوں کا ذکر کیا گیا ہے، دراصل اسی استدلال پر مبنی ہیں۔

فَلْيَنْظُرِ الْإِنْسَانُ إِلَىٰ طَعَامِهِ ۝ أَنَّا صَبَبْنَا الْمَاءَ صَبًّا ۝ ثُمَّ شَقَقْنَا الْأَرْضَ شَقًّا ۝ فَأَنْبَتْنَا فِيهَا حَبًّا ۝ وَعِنَبًا وَقَضْبًا ۝ وَزَيْتُونًا وَنَخْلًا ۝ وَحَدَائِقَ غُلْبًا ۝ وَفَاكِهَةً وَأَبًّا ۝ مَتَاعًا لَكُمْ وَلِأَنْعَامِكُمْ ۝ (۸۰:۲۴-۳۲)

انسان اپنی غذا پر نظر ڈالے (جو شب و روز اس کے استعمال میں آتی رہتی ہے) ہم پہلے زمین پر پانی برساتے ہیں، پھر اس کی سطح شق کر دیتے ہیں، پھر اس کی روئیدگی سے طرح طرح کی چیزیں پیدا کر دیتے ہیں۔ اناج کے دانے، انگور کی بیلیں، کھجور کے خوشے، سبزی، ترکاری، زیتون کا تیل، درختوں کے جھنڈ، قسم قسم کے میوے، طرح طرح کا چارہ، (اور یہ سب کچھ کس کے لئے؟) تمہارے فائدے کے لئے اور تمہارے جانوروں کے لئے!

ان آیات میں " فَلْيَنْظُرِ الْإِنْسَانُ " کے زور پر غور کرو۔ انسان کتنا ہی غافل ہو جائے اور کتنا ہی اعراض کرے، لیکن دلائل حقیقت کی وسعت اور ہمہ گیری کا یہ حال ہے کہ کسی حال میں بھی اس سے اوجھل نہیں ہوسکتیں۔ ایک انسان تمام دنیا کی طرف سے آنکھیں بند کر لے، لیکن بہرحال اپنی شب و روز کی غذا کی طرف سے تو آنکھیں بند نہیں کر سکتا۔ جو غذا اس کے سامنے دھری ہے اسی پر نظر ڈالے۔ یہ کیا ہے؟ گیہوں کا دانہ ہے۔ اچھا! گیہوں کا ایک دانہ اپنی ہتھیلی پر رکھ لو اور اس کی پیدائش سے لے کر اس کی پختگی و تکمیل تک کے تمام احوال

وظروف پر غور کرو۔ کیا یہ حقیر سا ایک دانہ بھی وجود میں آسکتا تھا اگر تمام کارخانۂ ہستی ایک خاص نظم وترتیب کے ساتھ اس کی بناوٹ میں سرگرم نہ رہتا؟ اور اگر دنیا میں ایک ایسا نظام ربوبیت موجود ہے تو کیا یہ ہوسکتا ہے کہ ربوبیت رکھنے والی ہستی موجود نہ ہو؟

سورہ نحل میں یہی استدلال ایک دوسرے پیرایے میں نمودار ہوا ہے:

وَاِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً ۚ نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهٖ مِنْۢ بَيْنِ فَرْثٍ وَّ دَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِيْنَ۝ وَمِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِيْلِ وَالْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا وَّ رِزْقًا حَسَنًا ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ۝ وَاَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِيْ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا وَّ مِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا يَعْرِشُوْنَ۝ ثُمَّ كُلِيْ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسْلُكِيْ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا ؕ يَخْرُجُ مِنْۢ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ فِيْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ۝[۲۳]

(۱۶:۶۶-۶۹)

اور (دیکھو! یہ) چارپائے (جنہیں تم پالتے ہو) ان میں تمہارے لئے غور کرنے اور نتیجہ نکالنے کی کتنی عبرت ہے؟ ان کے جسم سے ہم خون و کثافت کے درمیان دودھ پیدا کردیتے ہیں جو پینے والوں کے لئے بے غل و غش مشروب ہوتا ہے۔ (اسی طرح) کھجور اور انگور کے پھل ہیں جن سے نشہ کا عرق اور اچھی غذا دونوں طرح کی چیزیں حاصل کرتے ہو۔ بلاشبہ اس بات میں ارباب عقل کے لئے (ربوبیت الٰہی کی) بڑی ہی نشانی ہے! اور پھر دیکھو! تمہارے پروردگار نے شہد کی مکھی کی طبیعت میں یہ بات ڈال دی کہ پہاڑوں میں اور درختوں میں اور ان ٹٹیوں میں جو اس غرض سے بلند کردی جاتی ہیں، اپنے لئے گھر بنائے، پھر ہر طرح کے پھولوں سے رس چوسے، پھر اپنے پرودگار کے ٹھہرائے ہوئے طریقوں پر کامل فرماں برداری کے ساتھ گامزن ہو (چنانچہ تم دیکھتے ہو کہ) اس کے جسم سے مختلف

رنگتوں کا رس نکلتا ہے جس میں انسان کے لئے شفا ہے، بلاشبہ اس بات میں ان لوگوں کے لئے جو غور و فکر کرتے ہیں (ربوبیتِ الٰہی کی عجائب آفرینیوں کی) بڑی ہی نشانی ہے!

جس طرح اس نے جابجا خلقت سے استدلال کیا ہے،، یعنی دنیا میں ہر چیز مخلوق ہے، اس لئے ضروری ہے کہ خالق بھی ہو، اسی طرح وہ ربوبیت سے بھی استدلال کرتا ہے، یعنی دنیا میں ہر چیز مربوب ہے، اس لئے ضروری ہے کہ کوئی رب بھی ہو، اور دنیا میں ربوبیت کامل اور بے داغ ہے، اس لئے ضروری ہے کہ وہ رب کامل اور بے عیب ہو۔

زیادہ واضح لفظوں میں اسے یوں ادا کیا جاسکتا ہے کہ ہم دیکھتے ہیں دنیا میں ہر چیز ایسی ہے کہ اسے پرورش کی احتیاج ہے اور اسے پرورش مل رہی ہے۔ پس ضروری ہے کہ کوئی پرورش کرنے والا بھی موجود ہو۔ یہ پرورش کرنے والا کون ہے؟ یقیناً وہ نہیں ہوسکتا جو خود پروردہ اور محتاج پروردگاری ہو، قرآن میں جہاں کہیں اس طرح کے مخاطبات ہیں، جیسا کہ سورہ واقعہ کی مندرجہ ذیل آیت میں ہے، وہ اسی استدلال پر مبنی ہیں۔

اَفَرَءَیْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَo ءَ اَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَo لَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنٰهُ حُطَامًا فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُوْنَo اِنَّا لَمُغْرَمُوْنَo بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَo اَفَرَءَیْتُمُ الْمَآءَ الَّذِیْ تَشْرَبُوْنَo ءَ اَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ o لَوْ نَشَآءُ جَعَلْنٰهُ اُجَاجًا فَلَوْ لَا تَشْكُرُوْنَo اَفَرَءَیْتُمُ النَّارَ الَّتِیْ تُوْرُوْنَo ءَ اَنْتُمْ اَنْشَاْتُمْ شَجَرَتَهَآ اَمْ نَحْنُ الْمُنْشِئُوْنَo نَحْنُ جَعَلْنٰهَا تَذْكِرَةً وَّ مَتَاعًا لِّلْمُقْوِیْنَo

(۵۶:۶۳-۷۳)

اچھا! تم نے اس بات پر غور کیا کہ جو کچھ تم کاشت کاری کرتے ہو اسے تم اگاتے ہو یا ہم اگاتے ہیں؟ اگر ہم چاہیں تو اسے چورا چورا کردیں اور تم صرف یہ کہنے کے لئے رہ جاؤ ''افسوس! ہمیں تو اس نقصان کا تاوان ہی دینا پڑے گا بلکہ ہم تو اپنی

محنت کے سارے فائدوں ہی سے محروم ہو گئے"۔ اچھا! تم نے یہ بات بھی دیکھی کہ یہ پانی جو تمہارے پینے میں آتا ہے اسے کون برساتا ہے؟ تم برساتے ہو یا ہم برساتے ہیں؟ اگر ہم چاہیں تو اسے (سمندر کے پانی کی طرح) کڑوا کر دیں۔ پھر کیا اس نعمت کے لئے ضروری نہیں کہ تم شکر گزار رہو؟ اچھا! تم نے یہ بات بھی دیکھی کہ یہ آگ جو تم لگاتے ہو تو اس کے لئے لکڑی تم نے پیدا کی ہے یا ہم پیدا کر رہے ہیں؟ ہم نے اسے یادگار اور مسافروں کے لئے فائدہ بخش بنایا۔

نظام ربوبیت سے توحید پر استدلال

اسی طرح وہ نظام ربوبیت سے توحید الٰہی پر استدلال کرتا ہے جو رب العالمین تمام کائنات کی پرورش کر رہا ہے اور جس کی ربوبیت کا اعتراف تمہارے دل کے ایک ایک ریشے میں موجود ہے۔ اس کے سوا کون اس کا مستحق ہو سکتا ہے کہ بندگی و نیاز کا سر اس کے آگے جھکایا جائے؟

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ وَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ٥ الَّذِىْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّ السَّمَآءَ بِنَآءً وَّ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ٥ (۲:۲۱-۲۲)

اے افرادِ نسل انسانی! پروردگار کی عبادت کرو، اس پروردگار کی جس نے تمہیں پیدا کیا اور ان سب کو بھی پیدا کیا جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں، اور اس لئے پیدا کیا تاکہ تم برائیوں سے بچو۔ وہ پروردگار عالم جس نے تمہارے لئے زمین فرش کی طرح بچھا دی اور آسمان چھت کی طرح بنا دیا اور آسمان سے پانی برسایا، پھر اس سے طرح طرح کے پھل پیدا کر دیئے تاکہ تمہارے لئے رزق کا سامان ہو۔ پس (جب خالقیت اسی کی خالقیت ہے اور ربوبیت اسی کی ربوبیت تو) ایسا نہ کرو کہ کسی دوسری ذات کو اس کا ہم پلہ ٹھہراؤ، اور تم اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہو!

یا مثلاً سورہ فاطر میں ہے:

يَاَيُّهَا النَّاسُ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللّٰهِ يَرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ○ (۳:۳۵)

اے افرادِ نسلِ انسانی! اللہ نے اپنی جن نعمتوں سے تمہیں فیض یاب کیا ہے ان پر غور کرو! کیا اللہ کے سوا کوئی دوسرا بھی خالق ہے جو تمہیں زمین اور آسمان کی بخشائشوں سے رزق دے رہا ہے؟ نہیں، کوئی معبود نہیں ہے مگر اسی کی ایک ذات! پھر تم (اس سے روگردانی کر کے) کدھر بھٹکے چلے جا رہے ہو۔[۲۴]

نظامِ ربوبیت سے وحی و رسالت کی ضرورت پر استدلال

اسی طرح وہ نظامِ ربوبیت کے اعمال سے انسانی سعادت و شقاوت کے معنوی قوانین اور وحی و رسالت کی ضرورت پر بھی استدلال کرتا ہے۔ جس رب العالمین نے تمہاری پرورش کے لئے ربوبیت کا ایسا نظام قائم کر رکھا ہے، کیا ممکن ہے کہ اس نے تمہاری روحانی فلاح و سعادت کے لئے کوئی قانون، کوئی نظام، کوئی قاعدہ مقرر نہ کیا ہو؟ جس طرح تمہارے جسم کی ضرورتیں ہیں اسی طرح تمہاری روح کی بھی ضرورتیں ہیں۔ پھر کیوں کر ممکن ہے کہ جسم کی نشوونما کے لئے تو اس کے پاس سب کچھ ہو، لیکن روح کی نشوونما کے لئے اس کے پاس کوئی پروردگاری نہ ہو؟

اگر وہ رب العالمین ہے اور اس کی ربوبیت کے فیضان کا یہ حال ہے کہ ہر ذرہ کے لئے سیرابی اور ہر چیونٹی کے لئے کارسازی رکھتی ہے تو کیونکر باور کیا جا سکتا ہے کہ انسان کی روحانی سعادت کے لئے اس کے پاس کوئی سرچشمگی نہ ہو؟ اس کی پروردگاری اجسام کی پرورش کے لئے آسمان سے پانی برسائے لیکن ارواح کی پرورش کے لئے ایک قطرہ فیض بھی نہ رکھے؟ تم دیکھتے ہو کہ جب زمین شادابی سے محروم ہو کر مردہ ہو جاتی ہے تو یہ اس کا قانون ہے کہ بارانِ رحمت نمودار ہوتی ہے۔ زندگی کی برکتوں سے زمین کے ایک ایک ذرے کو مالا مال کر دیتی ہے۔ پھر کیا یہ ضروری نہیں کہ جب عالمِ انسانیت ہدایت و سعادت کی

شادابیوں سے محروم ہو جائے تو اس کی باران رحمت نمودار ہو کر ایک ایک روح کو پیام زندگی پہنچا دے؟ روحانی سعادت کی یہ بارش کیا ہے؟ وہ کہتا ہے: وحی الٰہی ہے۔ تم اس منظر پر کبھی متعجب نہیں ہوتے کہ پانی برسا اور مردہ زمین زندہ ہو گئی۔ پھر اس بات پر کیوں چونک اٹھو کہ وحی الٰہی ظاہر ہوئی اور مردہ روحوں میں زندگی کی جنبش پیدا ہو گئی؟

حٰمٓ ۝ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ۝ اِنَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۝ وَفِيْ خَلْقِكُمْ وَمَا يَبُثُّ مِنْ دَآبَّةٍ اٰيٰتٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ۝ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ رِّزْقٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ اٰيٰتٌ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝ تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۢ بَعْدَ اللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ يُؤْمِنُوْنَ ۝ (۴۵:۱۔۶)

یہ اللہ کی طرف سے کتاب (ہدایت) نازل کی جاتی ہے جو عزیز اور حکیم ہے۔ بلاشبہ ایمان رکھنے والوں کے لئے آسمانوں اور زمین میں (معرفت حق کی) بے شمار نشانیاں ہیں۔ نیز تمہاری پیدائش میں اور ان چارپایوں میں جنہیں اس نے زمین میں پھیلا رکھا ہے، ارباب یقین کے لئے بڑی ہی نشانیاں ہیں۔ اسی طرح رات اور دن کے یکے بعد دیگرے آتے رہنے میں اور اس سرمایہ رزق میں جسے وہ آسمان سے برساتا ہے اور زمین مرنے کے بعد پھر جی اٹھتی ہے اور ہواؤں کے ردو بدل میں، ارباب دانش کے لئے بڑی ہی نشانیاں ہیں۔ (اے پیغمبر!) یہ اللہ کی آیتیں ہیں جو فی الحقیقت ہم تمہیں سنا رہے ہیں۔ پھر اللہ اور اس کی آیتوں کے بعد کون سی بات رہ گئی ہے جسے سن کر یہ لوگ ایمان لائیں گے؟

سورہ انعام میں ان لوگوں کا جو وحی الٰہی کے نزول پر متعجب ہوتے ہیں، ان لفظوں میں ذکر کیا ہے:

وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖٓ اِذْ قَالُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنْ

شَیْ ءٍ. (۹۱:۶)

اور اللہ کے کاموں کی انہیں جو قدر شناسی کرنی تھی، یقیناً انہوں نے نہیں کی جب انہوں نے یہ بات کہی کہ اللہ نے اپنے کسی بندے پر کوئی چیز نازل نہیں کی۔

پھر تورات اور قرآن کے نزول کے ذکر کے بعد حسب ذیل بیان شروع ہو جاتا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰی ط یُخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ وَ مُخْرِجُ الْمَیِّتِ مِنَ الْحَیِّ ط ذٰلِكُمُ اللّٰهُ فَاَنّٰی تُؤْفَكُوْنَ○ فَالِقُ الْاِصْبَاحِ وَجَعَلَ الَّیْلَ سَكَنًا وَّ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ حُسْبَانًا ط ذٰلِكَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ○ وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ النُّجُوْمَ لِتَهْتَدُوْا بِهَا فِیْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ط قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ○ (۶:۹۶۔۹۸)

یقیناً یہ اللہ ہی کی کارفرمائی ہے کہ وہ دانے اور گٹھلی کو شق کرتا ہے (اور اس سے ہر چیز کا درخت پیدا کر دیتا ہے) وہ زندہ کو مردہ چیز سے نکالتا اور مردہ کو زندہ اشیاء سے نکالنے والا ہے۔ ہاں! وہی تمہارا خدا ہے، پھر تم (اس سے روگردانی کر کے) کدھر کو بہکے چلے جا رہے ہو؟ ہاں! وہی (پردہ شب چاک کر کے) صبح کی روشنی نمودار کرنے والا ہے، وہی ہے جس نے رات کو راحت وسکون کا ذریعہ بنا دیا اور وہی ہے کہ اس نے سورج اور چاند کی گردش اس درستگی کے ساتھ قائم کر دی کہ حساب کا معیار بن گئی۔ یہ اس عزیز وعلیم کا ٹھہرایا ہوا اندازہ ہے۔

اور (پھر دیکھو!) وہی ہے جس نے تمہارے لئے ستارے پیدا کر دیئے تاکہ خشکی وتری کی تاریکیوں میں ان سے رہنمائی پاؤ۔ بلاشبہ ان لوگوں کے لئے جو جاننے والے ہیں ہم نے دلیلیں کھول کھول کر بیان کر دی ہیں!

یعنی جس پروردگار عالم کی ربوبیت ورحمت کا یہ تمام فیضان شب وروز دیکھ رہے ہو، کیا یہ ممکن ہے کہ وہ تمہاری جسمانی پرورش وہدایت کے لئے تو یہ سب کچھ کرے، لیکن تمہاری روحانی پرورش وہدایت کے لئے اس کے پاس کوئی سروسامان نہ ہو؟ وہ زمین کی موت کو

زندگی سے بدل دیتا ہے پھر کیا تمہاری روح کی موت کو زندگی سے نہیں بدل دے گا؟ وہ ستاروں کی روشن علامتوں سے خشکی وتری کی ظلمتوں میں رہنمائی کرتا ہے۔ کیونکر ممکن ہے کہ تمہاری روحانی زندگی کی تاریکیوں میں رہنمائی کی کوئی روشنی نہ ہو؟ تم، جو کبھی اس پر متعجب نہیں ہوتے کہ زمین پر کھیت لہلہا رہے ہیں اور آسمان میں تارے چمک رہے ہیں، کیوں اس بات پر متعجب ہوتے ہو کہ خدا کی وحی نوع انسانی کی ہدایت کے لئے نازل ہو رہی ہے؟ اگر تمہیں تعجب ہوتا ہے تو یہ اس بات کا نتیجہ ہے کہ تم نے خدا کو اس کی صفتوں میں اس طرح نہیں دیکھا ہے جس طرح دیکھنا چاہئے۔ تمہاری سمجھ میں یہ بات تو آ جاتی ہے کہ وہ ایک چیونٹی کی پرورش کے لئے یہ پورا کارخانہ حیات سرگرم رکھے، مگر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ نوع انسانی کی ہدایت کے لئے سلسلہ وحی وتنزیل قائم ہو۔

نظامِ ربوبیت سے وجودِ معاد پر استدلال

اسی طرح وہ اعمال ربوبیت سے معاد اور آخرت پر بھی استدلال کرتا ہے۔ جو چیز جتنی زیادہ نگرانی اور اہتمام سے بنائی جاتی ہے اتنی ہی زیادہ قیمتی استعمال اور اہم مقصد بھی رکھتی ہے۔ اور بہتر صناع وہی ہے جو اپنی صنعت گری کا بہتر استعمال اور مقصد رکھتا ہو۔ پس انسان جو کرۂ ارضی کی بہترین مخلوق اور اس کی تمام سلسلہ خلقت کا خلاصہ ہے اور جس کی جسمانی ومعنوی نشوونما کے لئے فطرت کائنات نے اس قدر اہتمام کیا ہے، کیونکر ممکن ہے کہ محض دنیا کی چند روزہ زندگی کے لئے ہی بنایا گیا ہو اور کوئی بہتر استعمال اور بلند تر مقصد نہ رکھتا ہو؟ اور پھر اگر خالق کائنات "رب" ہے اور کامل درجے کی ربوبیت رکھتا ہے تو کیونکر باور کیا جا سکتا ہے کہ اس نے اپنے ایک بہترین مربوب یعنی پروردہ ہستی کو محض اس لئے بنایا ہو کہ مہمل اور بے نتیجہ چھوڑ دے۔

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّ اَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ○ فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ○ (۲۳:۱۱۵۔۱۱۶)

کیا تم نے ایسا سمجھ رکھا ہے کہ ہم نے تمہیں بغیر کسی مقصد ونتیجہ کے پیدا کیا ہے اور تم

ہماری طرف لوٹنے والے نہیں؟ اللہ جو اس کائنات ہستی کا حقیقی حکمران ہے، اس سے بہت بلند ہے کہ ایک بے کار و عبث فعل کرے۔ کوئی معبود نہیں ہے مگر وہ جو (جہاں داری کے) عرش بزرگ کا پروردگار ہے۔

ہم نے یہ مطلب اسی سادہ طریقہ پر بیان کر دیا جو قرآن کے بیان و خطاب کا طریقہ ہے، لیکن یہی مطلب علمی بحث و تقریر کے پیرایے میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ وجود انسانی کرہ ارضی کے سلسلہ خلقت کی آخری اور اعلیٰ ترین کڑی ہے۔ اور اگر پیدائش حیات سے لے کر انسانی وجود کی تکمیل تک کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو ایک ناقابل شمار مدت کے مسلسل نشو و ارتقا کی تاریخ ہو گی۔ گویا فطرت نے لاکھوں کروڑوں برس کی کارفرمائی و صناعی سے کرہ ارضی پر جو اعلیٰ ترین وجود تیار کیا ہے، وہ انسان ہے!

ماضی کے ایک نقطہ بعید کا تصور کرو! جب ہمارا یہ کرہ سورج کے ملتھب کرے سے الگ ہوا تھا، نہیں معلوم کتنی مدت اس کے ٹھنڈے اور معتدل ہونے میں گزر گئی اور یہ اس قابل ہوا کہ زندگی کے عناصر اس میں نشو و نما پا سکیں۔ اس کے بعد وہ وقت آیا جب اس کی سطح پر نشو و نما کی سب سے پہلی داغ بیل پڑی۔ اور پھر نہیں معلوم کتنی مدت کے بعد زندگی کا وہ اولین بیج وجود میں آ سکا جسے پروٹو پلازم (Protoplasm) کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ پھر حیات عضوی کے نشو و نما کا دور شروع ہوا اور نہیں معلوم کتنی مدت اس پر گزر گئی کہ اس دور نے بسیط سے مرکب تک اور ادنیٰ سے اعلیٰ درجے تک ترقی کی منزلیں طے کیں! یہاں تک کہ حیوانات کی ابتدائی کڑیاں ظہور میں آئیں اور پھر لاکھوں برس اس میں نکل گئے کہ یہ سلسلہ ارتقا وجود انسانی تک مرتفع ہو! پھر انسان کے جسمانی ظہور کے بعد اس کے ذہنی ارتقا کا سلسلہ شروع ہوا اور ایک طول طویل مدت اس پر گزر گئی! بالآخر ہزاروں برس کے اجتماعی اور ذہنی ارتقا کے بعد وہ انسان ظہور پذیر ہو سکا جو کرہ ارضی کے تاریخی عہد کا متمدن اور عقیل انسان ہے!

گویا زمین کی پیدائش سے لے کر ترقی یافتہ انسان کی تکمیل تک جو کچھ گزر چکا ہے اور جو کچھ بنتا سنورتا رہا ہے، وہ تمام تر انسان کی پیدائش و تکمیل ہی کی سرگزشت ہے!

سوال یہ ہے کہ جس وجود کی پیدائش کے لئے فطرت نے اس درجہ اہتمام کیا ہے، کیا یہ سب کچھ صرف اس لئے تھا کہ وہ پیدا ہو، کھائے پیئے اور مر کر فنا ہو جائے؟

فَتَعَالَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ○ (۱۱۶:۲۳)

قدرتی طور پر یہاں ایک دوسرا سوال بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر وجود حیوانی اپنے ماضی میں ہمیشہ یکے بعد دیگرے متغیر ہوتا اور ترقی کرتا رہا ہے تو مستقبل میں بھی یہ تغیر وارتقا کیوں جاری نہ رہے؟ اگر اس بات پر ہمیں بالکل تعجب نہیں ہوتا کہ ماضی میں بے شمار صورتیں مٹیں اور نئی زندگیاں ظہور میں آئیں تو اس بات پر کیوں تعجب ہو کہ موجودہ زندگی کا مٹنا بھی بالکل مٹ جانا نہیں ہے، اس کے بعد بھی ایک اعلیٰ تر صورت اور زندگی ہے؟

اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى○ اَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِيٍّ يُّمْنٰى○ ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوّٰى○ (۷۵:۳۶-۳۸)

کیا انسان خیال کرتا ہے کہ وہ مہمل چھوڑ دیا جائے گا (اور اس زندگی کے بعد دوسری زندگی نہ ہوگی)؟ کیا اس پر یہ حالت نہیں گزر چکی ہے کہ پیدائش سے پہلے نطفہ تھا، پھر نطفہ سے علقہ ہوا (یعنی جونک کی سی شکل ہوگئی)، پھر علقہ سے (اس کا ڈیل ڈول) پیدا کیا گیا، پھر (اس ڈیل ڈول کو) ٹھیک ٹھیک درست کیا گیا!

سورہ ذاریات میں تمام تر "دین" یعنی جزا کا بیان ہے۔

اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَصَادِقٌ وَّاِنَّ الدِّيْنَ لَوَاقِعٌ○ (۵۱:۵-۶)

یقیناً جس چیز سے تمہیں ڈرایا جا رہا ہے وہ سچی ہے اور جزائے اعمال ضرور ملنی والی ہے۔

اور پھر اس پر اعمال ربوبیت سے یعنی ہواؤں کے چلنے اور پانی برسنے کے موثرات سے استشہاد کیا گیا ہے:

وَالذّٰرِيٰتِ ذَرْوًا○ فَالْحٰمِلٰتِ وِقْرًا○ فَالْجٰرِيٰتِ يُسْرًا○ فَالْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًا○ (۵۱:۱-۴)

پھر آسمان اور زمین کی بخششوں پر اور خود وجود انسانی کی اندرونی شہادتوں پر توجہ دلائی ہے۔

وَفِی الْاَرْضِ اٰیٰتٌ لِّلْمُوْقِنِیْنَ ٥ وَفِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ٥ وَفِی السَّمَآءِ رِزْقُکُمْ وَمَا تُوْعَدُوْنَ. (۵۱۔۲۰۔۲۲)

اس کے بعد فرمایا:

فَوَرَبِّ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اِنَّهٗ لَحَقٌّ مِّثْلَ مَآ اَنَّکُمْ تَنْطِقُوْنَ ٥ (۵۱:۲۳)

آسمان اور زمین کے رب کی قسم (یعنی آسمان وزمین کے پروردگار کی پروردگاری شہادت دے رہی ہے) کہ بلاشبہ وہ معاملہ (یعنی جزا وسزا کا معاملہ) حق ہے، ٹھیک اسی طرح جس طرح یہ بات کہ تم گویائی رکھتے ہو۔

اس آیت میں اثبات جزا کے لئے خدا نے خود اپنے وجود کی قسم کھائی ہے، لیکن ''رب'' کے لفظ سے اپنے آپ کو تعبیر کیا ہے۔ عربی میں قسم کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کسی بات پر کسی بات سے شہادت لائی جائے۔ پس مطلب یہ ہوا کہ پروردگار عالم کی پروردگاری شہادت دے رہی ہے کہ یہ بات حق ہے۔ یہ شہادت کیا ہے؟ وہی ربوبیت کی شہادت ہے۔ اگر دنیا میں پرورش موجود ہے، پروردہ موجود ہے اور اس لئے پروردگار بھی موجود ہے تو ممکن نہیں کہ جزا کا معاملہ بھی موجود نہ ہو اور وہ بغیر کسی نتیجہ کے انسان کو چھوڑ دے۔ چونکہ لوگوں کی نظر اس حقیقت پر نہ تھی، اس لئے اس آیت میں قسم اور مقسم بہ کا ربط صحیح طور پر متعین نہ کر سکے۔

قرآن حکیم کے دلائل وبراہین پر غور کرتے ہوئے یہ اصل ہمیشہ پیش نظر رکھنی چاہئے کہ اس کے استدلال کا طریقہ منطقی بحث تقریر کا طریقہ نہیں ہے جس کے لئے چند در چند مقدمات کی ضرورت ہوتی ہے اور پھر اثبات مدعا کی شکلیں ترتیب دینی پڑتی ہیں بلکہ وہ ہمیشہ براہ راست تلقین کا قدرتی اور سیدھا سادا طریقہ اختیار کرتا ہے۔ عموماً اس کے دلائل اس کے اسلوب بیان وخطاب میں مضمر ہوتے ہیں۔ وہ یا تو کسی مطلب کے لئے اسلوب خطاب ایسا اختیار کرتا ہے کہ اس سے استدلال کی روشنی نمودار ہو جاتی ہے یا پھر کسی مطلب پر زور دیتے ہوئے کوئی ایک لفظ ایسا بول جاتا ہے کہ اس کی تعبیر ہی اس کی دلیل بھی موجود

ہوتی ہے اور خود بخود مخاطب کا ذہن دلیل کی طرف پھر جاتا ہے۔ چنانچہ اس کی ایک واضح مثال یہی صفت ربوبیت کا جابجا استعمال ہے۔ جب وہ خدا کی ہستی کا ذکر کرتا ہوا اسے ''رب'' کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے تو یہ بات کہ وہ ''رب'' ہے، جس طرح اس کی ایک صفت ظاہر کرتی ہے اسی طرح اس کی دلیل بھی واضح کر دیتی ہے۔ وہ ''رب'' ہے۔ اور یہ واقعہ ہے کہ اس کی ربوبیت تمہیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے اور خود تمہارے دل کے اندر گھر بنائے ہوئے ہے۔ پھر کیونکر تم جرات کر سکتے ہو کہ اس کی ہستی سے انکار کرو! وہ رب ہے اور رب کے سوا کون ہوسکتا ہے جو تمہاری بندگی و نیاز کا مستحق ہو؟

چنانچہ قرآن کے وہ تمام مقامات جہاں اس طرح کے مخاطبات ہیں کہ:

يَآأَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ (۲۱:۲)

اُعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّي وَرَبَّكُمْ (۱۱۷،۷۲:۵)

اِنَّ اللّٰهَ رَبِّي وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ (۵۱:۳)

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ (۳:۱۰)

اِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ (۹۲:۲۱)

قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِي اللّٰهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ (۱۳۹:۲)

وغیرھا تو انہیں مجرد امر و خطاب ہی نہیں سمجھنا چاہئے، بلکہ وہ خطاب و دلیل دونوں ہیں، کیونکہ ''رب'' کے لفظ نے برہان ربوبیت کی طرف خود بخود رہنمائی کر دی ہے۔ افسوس ہے ہمارے مفسروں کی نظر اس حقیقت پر نہ تھی کیونکہ منطقی استدلال کے استغراق نے انہیں قرآن کے طریق استدلال سے بے پروا کر دیا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ان مقامات کے ترجمہ و تفسیر میں قرآن کے اسلوب بیان کی حقیقی روح واضح نہ ہوسکی اور استدلال کا پہلو طرح طرح کی توجیہات میں گم ہوگیا۔

00000

الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

"الرَّحْمٰنِ "اور"الرَّحِيْمِ "دونوں رحم سے ہیں۔عربی میں''رحمت''عواطف کی ایسی رقت ونرمی کو کہتے ہیں جس سے کسی دوسری ہستی کے لئے احسان وشفقت کا ارادہ جوش میں آجائے۔پس رحمت میں محبت،شفقت،فضل،احسان،سب کا مفہوم داخل ہے اور مجرد محبت،لطف اور فضل سے زیادہ وسیع اور حاوی ہے۔

اگر چہ یہ دونوں اسم رحمت سے ہیں،لیکن رحمت کے دو مختلف پہلوؤں کو نمایاں کرتے ہیں۔عربی میں فعلان کا باب عموماً ایسے صفات کے لئے استعمال کیا جاتا ہے جو محض صفات عارضہ ہوتے ہیں [25] جیسے پیاسے کے لئے عطشان،غضبناک کے لئے غضبان،سراسیمہ کے لئے حیران،مست کے لئے سکران،لیکن فعیل کے وزن میں صفات قائمہ کا خاصہ ہے،یعنی عموماً ایسے صفات کے لئے بولا جاتا ہے جو جذبات وعوارض ہونے کی جگہ صفات قائمہ ہوتے ہیں [26]،مثلاً کریم کرم کرنے والا،عظیم بڑائی رکھنے والا،حکیم حکمت رکھنے والا۔پس''الرحمٰن'' کے معنی یہ ہوئے کہ وہ ذات جس میں رحمت ہے اور''الرحیم'' کے معنی یہ ہوئے کہ وہ ذات جس میں نہ صرف رحمت ہے بلکہ جس سے ہمیشہ رحمت کا ظہور ہوتا رہتا ہے اور ہر آن ہر لمحہ تمام کائنات خلقت اس سے فیض یاب ہو رہی ہے۔

رحمت کو دو الگ الگ اسموں سے کیوں تعبیر کیا گیا؟اس لئے کہ قرآن خدا کے تصور کا جو نقشہ ذہن نشین کرنا چاہتا ہے،اس میں سب سے زیادہ نمایاں اور چھائی ہوئی صفت رحمت ہی کی صفت ہے،بلکہ کہنا چاہئے تمام تر رحمت ہی ہے۔

وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ.(۷:۱۵۶)

اور میری رحمت دنیا کی ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے۔

پس یہ ضروری تھا کہ خصوصیت کے ساتھ اس کی صفتی اور فعلی دونوں حیثیتیں واضح کر دی جائیں، یعنی اس میں رحمت ہے، کیونکہ وہ "الرحمن" ہے اور صرف اتنا ہی نہیں، بلکہ ہمیشہ اس سے رحمت کا ظہور بھی ہو رہا ہے، کیونکہ "الرَّحْمٰنِ" کے ساتھ وہ "الرَّحِيْمِ" بھی ہے۔

رحمت: لیکن اللہ کی رحمت کیا ہے؟ قرآن کہتا ہے: کائنات ہستی میں جو کچھ بھی خوبی و کمال ہے وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ رحمت الٰہی کا ظہور ہے۔

جب ہم کائنات ہستی کے اعمال و مظاہر پر غور کرتے ہیں تو سب سے پہلی حقیقت جو ہمارے سامنے نمایاں ہوتی ہے وہ اس کا نظام ربوبیت ہے، کیونکہ فطرت سے ہماری پہلی شناسائی ربوبیت ہی کے ذریعہ ہوتی ہے۔ لیکن جب علم و ادراک کی راہ میں چند قدم آگے بڑھتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ ربوبیت سے بھی ایک زیادہ وسیع اور عام حقیقت یہاں کار فرما ہے اور خود ربوبیت بھی اسی کے فیضان کا ایک گوشہ ہے۔

ربوبیت اور اس کا نظام کیا ہے؟ کائنات ہستی کی پرورش ہے، لیکن کائنات ہستی میں صرف پرورش ہی نہیں ہے، پرورش سے بھی ایک زیادہ بنانے، سنوارنے اور فائدہ پہنچانے کی حقیقت کام کر رہی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس کی فطرت میں بناؤ ہے، اس کے بناؤ میں خوبی ہے، اس کے مزاج میں اعتدال ہے، اس کے افعال میں خواص ہیں، اس کی صورت میں حسن ہے، اس کی صداؤں میں نغمہ ہے، اس کی بو میں عطر بیزی ہے اور اس کی کوئی بات نہیں جو اس کارخانے کی تعمیر و درستگی کے لئے مفید نہ ہو۔ پس یہ حقیقت جو اپنے بناؤ اور فیضان میں ربوبیت سے بھی زیادہ وسیع اور عام ہے، قرآن کہتا ہے کہ رحمت ہے اور خالق کائنات کی رحمانیت اور رحیمیت کا ظہور ہے۔

تعمیر و تحسین کائنات رحمت الٰہی کا نتیجہ ہے

زندگی اور حرکت کا یہ عالم گیر کارخانہ وجود ہی میں نہ آتا، اگر اپنے ہر فعل میں بننے بنانے، سنورنے سنوارنے اور ہر طرح بہتر و اصلح ہونے کا خاصہ نہ رکھتا۔ فطرت کائنات

میں یہ خاصہ کیوں ہے؟ اس لئے کہ بناؤ ہو بگاڑ نہ ہو، درستگی ہو برہمی نہ ہو۔ لیکن کیوں ایسا ہوا کہ فطرت بنائے اور سنوارے، بگاڑے اور الجھائے نہیں؟ یہ کیا ہے کہ جو کچھ ہوتا ہے، درست اور بہتر ہی ہوتا ہے، خراب اور بدتر نہیں ہوتا؟ انسان کے علم و دانش کی کاوشیں آج تک یہ عقدہ حل نہ کر سکیں۔ فلسفہ ونظر کا قدم جب بھی اس حد تک پہنچا، دم بخود ہو کر رہ گیا، لیکن قرآن کہتا ہے: یہ اس لئے ہے کہ فطرت کائنات میں رحمت ہے اور رحمت کا مقتضی یہی ہے کہ خوبی اور درستگی ہو، بگاڑ اور خرابی نہ ہو۔

انسان کے علم و دانش کی کاوشیں بتلاتی ہیں کہ کائنات ہستی کا یہ بناؤ اور سنوار عناصر اولیہ کی ترکیب اور ترکیب کے اعتدال وتسویہ کا نتیجہ ہے۔ مادہ عالم کی کمیت میں بھی اعتدال ہے، کیفیت میں بھی اعتدال ہے۔ یہی اعتدال ہے جس سے سب کچھ بنتا ہے اور جو کچھ بنتا ہے خوبی اور کمال کے ساتھ بنتا ہے۔ یہی اعتدال وتناسب دنیا کے تمام تعمیری اور ایجابی حقائق کی اصل ہے۔ وجود، زندگی، تندرستی، حسن، خوشبو، نغمہ، بناؤ اور خوبی کے بہت سے نام ہیں، مگر حقیقت ایک ہی ہے اور وہ اعتدال ہے۔

لیکن فطرت کائنات میں اعتدال وتناسب کیوں ہے؟ کیوں ایسا ہوا کہ عناصر کے دقائق جب ملیں تو اعتدال وتناسب کے ساتھ ملیں اور مادہ کا خاصہ یہی ٹھہرا! کہ اعتدال وتناسب ہو، انحراف اور تجاوز نہ ہو؟ انسان کا علم دم بخود اور متحیر ہے، لیکن قرآن کہتا ہے: یہ اس لئے ہوا کہ خالق کائنات میں رحمت ہے اور اس لئے کہ اس کی رحمت اپنا ظہور بھی رکھتی ہے۔ اور جس میں رحمت ہو اور اس کی رحمت ظہور بھی رکھتی ہو تو جو کچھ اس سے صادر ہوگا، اس میں خوبی و بہتری ہی ہوگی، حسن و جمال ہی ہوگا، اعتدال وتناسب ہی ہوگا، اس کے خلاف کچھ نہیں ہوسکتا۔

فلسفہ ہمیں بتاتا ہے کہ تعمیر اور تحسین فطرت کائنات کا خاصہ ہے۔ خاصہ تعمیر چاہتا ہے کہ بناؤ ہو۔ خاصہ تحسین چاہتا ہے کہ جو کچھ بنے خوبی و کمال کے ساتھ بنے، اور یہ دونوں خاصے "قانون ضرورت" کا نتیجہ ہیں۔ کائنات ہستی کے ظہور و تکمیل کے لئے ضرورت تھی

کہ تعمیر ہو اور ضرورت تھی کہ جو کچھ تعمیر ہو حسن و خوبی کے ساتھ تعمیر ہو۔ ''ضرورت'' بجائے خود ایک علت ہوگئی اور اس لئے فطرت سے جو کچھ بھی ظہور میں آتا ہے ویسا ہی ہوتا ہے جیسا ہونا ضروری تھا۔

لیکن اس تعلیل سے بھی تو یہ عقدہ حل نہیں ہوا، سوال جس منزل میں تھا اس سے صرف ایک منزل اور آگے بڑھ گیا۔ تم کہتے ہو یہ جو کچھ ہو رہا ہے اس لئے ہے کہ ''ضرورت'' کا قانون موجود ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ ''ضرورت'' کا قانون کیوں موجود ہے؟ کیوں یہ ضروری ہوا جو کچھ ظہور میں آئے ''ضرورت'' کے مطابق ہو اور ''ضرورت'' اسی بات کی مقتضی ہوئی کہ خوبی اور درستگی ہو، بگاڑ اور برہمی نہ ہو؟ انسانی علم کی کاوشیں اس کا کوئی جواب نہیں دے سکتیں۔ ایک مشہور فلسفی کے لفظوں میں ''جس جگہ سے یہ کیوں شروع ہو جائے سمجھ جاؤ کہ فلسفہ کے غور و خوض کی سرحد ختم ہوگئی'' لیکن قرآن اسی سوال کا جواب دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے یہ ''ضرورت'' رحمت اور فضل کی ''ضرورت'' ہے۔ رحمت چاہتی ہے کہ جو کچھ ظہور میں آئے بہتر ہو اور نافع ہو، اور اس لئے جو کچھ ظہور میں آتا ہے بہتر ہوتا ہے اور نافع ہوتا ہے!

پھر یہ حقیقت بھی واضح رہے کہ دنیا میں زندگی اور بقا کے لئے جن چیزوں کی ضرورت ہے، جمال و زیبائش ان سے ایک زائد تر فیضان ہے اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ جمال و زیبائش بھی یہاں موجود ہے۔ پس یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ سب کچھ قانون ضرورت ہی کا نتیجہ ہے۔ ضرورت، زندگی اور بقا کا سر و سامان چاہتی ہے، لیکن زندہ اور باقی رہنے کے لئے جمال و زیبائش کی کیا ضرورت ہے؟ اگر جمال و زیبائش بھی یہاں موجود ہے تو یقیناً یہ فطرت کا ایک مزید لطف و احسان ہے، اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فطرت صرف زندگی ہی نہیں بخشتی، بلکہ زندگی کو حسین و لطیف بھی بنانا چاہتی ہے۔ پس یہ محض زندگی کی ضرورت کا قانون نہیں ہو سکتا یہ اس ''ضرورت'' سے بھی کوئی بالاتر ''ضرورت'' ہے جو چاہتی ہے کہ مرحمت اور فیضان ہو۔ قرآن کہتا ہے یہ رحمت کی ''ضرورت'' ہے۔ اور رحمت کا مقتضیٰ یہی ہے کہ وہ سب کچھ ظہور میں آئے جو رحمت سے ظہور میں آنا چاہیے۔

قُلْ لِّمَنْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ قُلْ لِّلّٰهِ ؕ كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ؕ (۱۲:۶)

(اے پیغمبر! ان لوگوں سے) پوچھو[۲۷] آسمان اور زمین میں جو کچھ ہے وہ کس کے لیے ہے؟ (اے پیغمبر) کہہ دے: اللہ کے لئے ہے جس نے اپنے لئے ضروری ٹھہرا لیا ہے کہ رحمت ہو۔

وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ؕ (۱۵۶:۷)

اور میری رحمت دنیا کی ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے۔

افادہ و فیضان فطرت

اس سلسلہ میں سب سے پہلی حقیقت جو ہمارے سامنے نمایاں ہوتی ہے، وہ کائنات ہستی اور اس کی تمام اشیاء کا افادہ و فیضان ہے۔ یعنی ہم دیکھتے ہیں کہ فطرت کے تمام کاموں میں کامل نظم و یکسانیت کے ساتھ مفید اور بکار آمد ہونے کی خاصیت پائی جاتی ہے۔ اور اگر بحیثیت مجموعی دیکھا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا یہ تمام کارگاہ عالم صرف اسی لئے بنا ہے کہ ہمیں فائدہ پہنچائے اور ہماری حاجت روائیوں کا ذریعہ ہو۔

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ○ (۱۳:۴۵)

اور آسمانوں اور زمین میں جو کچھ بھی ہے، وہ سب اللہ نے تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے (یعنی ان کی قوتیں اور تاثیریں اس طرح تمہارے تصرف میں دے دی گئی ہیں کہ جس طرح چاہو کام لے سکتے ہو) بلاشبہ ان لوگوں کے لئے جو غور و فکر کرنے والے ہیں، اس بات میں (معرفت حق کی) بڑی ہی نشانیاں ہیں۔[۲۸]

ہم دیکھتے ہیں کہ کائنات ہستی میں جو کچھ بھی موجود ہے اور جو کچھ بھی ظہور میں آتا ہے، اس میں سے ہر چیز کوئی نہ کوئی خاصہ رکھتی ہے اور ہر حادثہ کی کوئی نہ کوئی تاثیر ہے۔ اور پھر ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ تمام خواص و موثرات کچھ اس طرح واقع ہوئے ہیں کہ ہر خاصہ ہماری

کوئی نہ کوئی ضرورت پوری کرتا اور ہر تاثیر ہمارے لئے کوئی نہ کوئی فیضان رکھتی ہے۔ سورج، چاند، ستارے، ہوا، بارش، دریا، سمندر، پہاڑ سب کے خواص وفوائد ہیں اور سب ہمارے لئے طرح طرح کی راحتوں اور آسایشوں کا سامان بہم پہنچارہے ہیں۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ وَ سَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِیَ فِی الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ وَ سَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهٰرَ وَ سَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآئِبَیْنِ وَ سَخَّرَ لَكُمُ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ وَاٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ ؕ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ؕ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ ۝ (۱۴: ۳۲-۳۴)

یہ اللہ ہی کی کارفرمائی ہے کہ اس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور آسمان سے پانی برسایا، پھر اس کی تاثیر سے طرح طرح کے پھل تمہاری غذا کے لئے پیدا کر دیئے۔ اسی طرح اس نے یہ بات بھی ٹھہرا دی کہ سمندر میں جہاز تمہارے زیر فرمان رہتے اور حکم الٰہی سے چلتے رہتے ہیں۔ اور اسی طرح دریا بھی تمہاری کاربرآریوں کے لئے مسخر کر دیئے گئے۔ اور (پھر اتنا ہی نہیں بلکہ غور کرو تو) سورج اور چاند بھی تمہارے لئے مسخر کر دیئے گئے ہیں کہ ایک خاص ڈھنگ پر گردش میں ہیں اور رات اور دن کا اختلاف بھی (تمہارے فائدہ ہی کے لئے) مسخر ہے۔ غرضیکہ جو کچھ تمہیں مطلوب تھا، وہ سب کچھ اس نے عطا کر دیا۔ اگر تم اللہ کی نعمتیں شمار کرنی چاہو تو وہ اتنی ہیں کہ ہرگز شمار نہ کرسکو گے۔ بلاشبہ انسان بڑا ہی ناانصاف، بڑا ہی ناشکرا ہے!

زمین کو دیکھو! اس کی سطح پھلوں اور پھولوں سے لدی ہوئی ہے، تہہ میں آب شیریں کی سوتیں بہہ رہی ہیں، گہرائی سے چاندی سونا نکل رہا ہے۔ وہ اپنی جسامت میں اگرچہ مدور ہے، لیکن اس کا ہر حصہ اس طرح واقع ہوا ہے کہ معلوم ہوتا ہے ایک مسطح فرش بچھا دیا گیا ہے۔

اَلَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا وَّ جَعَلَ لَكُمْ فِیْهَا سُبُلًا لَّعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝ (۴۳: ۱۰)

وہ پروردگار جس نے تمہارے لئے زمین اس طرح بنادی کہ فرش کی طرح بچھی ہوئی ہے اوراس میں قطع مسافت کی (ہموار) راہیں پیدا کردیں (تاکہ تم راہ پاؤ)۔[۲۹]

وَهُوَ الَّذِي مَدَّ الْأَرْضَ وَجَعَلَ فِيهَا رَوَاسِيَ وَأَنْهَارًا ؕ وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ جَعَلَ فِيهَا زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ يُغْشِي اللَّيْلَ النَّهَارَ ؕ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ ○ وَفِي الْأَرْضِ قِطَعٌ مُتَجَاوِرَاتٌ وَجَنَّاتٌ مِنْ أَعْنَابٍ وَزَرْعٌ وَنَخِيلٌ صِنْوَانٌ وَغَيْرُ صِنْوَانٍ يُسْقَىٰ بِمَاءٍ وَاحِدٍ وَنُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلَىٰ بَعْضٍ فِي الْأُكُلِ ؕ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ○ (۱۳:۳-۴)

اور یہ اسی پروردگار کی پروردگاری ہے کہ اس نے زمین (تمہاری سکونت کے لئے) پھیلادی اوراس میں پہاڑوں کے لنگر ڈال دیئے اورنہریں بہادیں، نیز ہرطرح کے پھلوں کی دودوقسمیں پیدا کردیں۔اور پھر یہ اسی کی کارفرمائی ہے کہ (رات اوردن یکے بعد دیگرے آتے رہتے ہیں اور) رات کی تاریکی دن کی روشنی کوڈھانپ لیتی ہے۔ بلاشبہ ان لوگوں کے لئے جوغوروفکر کرنے والے ہیں اس میں (معرفت حقیقت کی) بڑی ہی نشانیاں ہیں!اور (پھر دیکھو) زمین کی سطح اس طرح بنائی گئی ہے کہ اس میں ایک دوسرے سے قریب (آبادی کے) قطعات بن گئے اورانگوروں کے باغ ،غلہ کی کھیتیاں، کھجوروں کے جھنڈ پیدا ہوگئے۔ان درختوں میں بعض درخت زیادہ ٹہنیوں والے ہیں،بعض اکہرے۔اوراگرچہ سب کوایک ہی طرح کے پانی سے سینچا جاتا ہے،لیکن پھل ایک طرح کے نہیں،ہم نے بعض درختوں کوبعض درختوں پر پھلوں کے مزے میں برتری دے دی۔ بلاشبہ ارباب دانش کے لئے اس میں (معرفت حقیقت کی) بڑی ہی نشانیاں ہیں۔

وَلَقَدْ مَكَّنَّاكُمْ فِي الْأَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ ؕ قَلِيلًا مَا تَشْكُرُونَ ○ (۷:۱۰)

اور (دیکھو!) ہم نے زمین میں تمہیں طاقت وتصرف کے ساتھ جگہ دی اور زندگی کے تمام سامان پیدا کر دیئے، (مگر افسوس) بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ تم (نعمت الٰہی کے) شکر گزار ہو!

سمندر کی طرف نظر اٹھاؤ! اس کی سطح پر جہاز تیر رہے ہیں، تہہ میں مچھلیاں اچھل رہی ہیں، قعر میں مرجان اور موتی نشو ونما پا رہے ہیں۔

وَهُوَ الَّذِیْ سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَاْكُلُوْا مِنْهُ لَحْمًا طَرِیًّا وَّ تَسْتَخْرِجُوْا مِنْهُ حِلْیَةً تَلْبَسُوْنَهَا وَتَرَی الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِیْهِ وَ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ○ (۱۶:۱۴)

اور (دیکھو!) یہ اسی کی کارفرمائی ہے کہ اس نے سمندر تمہارے لئے مسخر کر دیا تا کہ اپنی غذا کے لئے تر و تازہ گوشت حاصل کرو اور زیور کی چیزیں نکالو جنہیں (خوش نمائی کے لئے) پہنتے ہو۔ نیز تم دیکھتے ہو کہ جہاز سمندر میں موجیں چیرتے ہوئے چلے جارہے ہیں اور سیر و سیاحت کے ذریعے اللہ کا فضل تلاش کرو تا کہ اس کی نعمت کے شکر گزار رہو!

حیوانات کو دیکھو! زمین کے چار پائے، فضا کے پرند، پانی کی مچھلیاں، سب اسی لئے ہیں کہ اپنے اپنے وجود سے ہمیں فائدہ پہنچائیں۔ غذا کے لئے ان کا دودھ اور گوشت، سواری کے لئے ان کی پیٹھ، حفاظت کے لئے ان کی پاسبانی، پہننے کے لئے ان کی کھال اور اون، برتنے کے لئے ان کے جسم کی ہڈیاں تک مفید ہیں۔

وَالْاَنْعَامَ خَلَقَهَا لَكُمْ فِیْهَا دِفْءٌ وَّ مَنَافِعُ وَ مِنْهَا تَاْكُلُوْنَ○ وَ لَكُمْ فِیْهَا جَمَالٌ حِیْنَ تُرِیْحُوْنَ حِیْنَ تَسْرَحُوْنَ○ وَتَحْمِلُ اَثْقَالَكُمْ اِلٰی بَلَدٍ لَّمْ تَكُوْنُوْا بٰلِغِیْهِ اِلَّا بِشِقِّ الْاَنْفُسِ ؕ اِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ○ وَ الْخَیْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِیْرَ لِتَرْكَبُوْهَا وَزِیْنَةً ط وَیَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ○ (۱۶:۵۔۸)

اور چار پایے پیدا کر دیئے ہیں جن میں تمہارے لئے جاڑے کا سامان اور طرح طرح کے منافع ہیں، اور ان سے تم اپنی غذا بھی حاصل کرتے ہو۔ جب ان کے غول شام کو چر کر واپس آتے ہیں اور جب چراگاہوں کے لئے نکلتے ہیں تو (دیکھو!) ان کے منظر میں تمہارے لئے خوشنمائی رکھ دی ہے۔ اور انہیں میں وہ جانور بھی ہیں جو تمہارا بوجھ اٹھا کر ان (دور دراز) شہروں تک پہنچا دیتے ہیں جہاں تک تم بغیر سخت مشقت کے نہیں پہنچا سکتے تھے۔ بلاشبہ تمہارا پروردگار بڑا ہی شفقت رکھنے والا اور صاحب رحمت ہے۔ اور (دیکھو!) گھوڑے، خچر، گدھے پیدا کئے گئے تاکہ تم ان سے سواری کا کام لو اور خوش نمائی کا بھی موجب ہوں۔ وہ اسی طرح (طرح طرح کی چیزیں) پیدا کرتا ہے جن کا تمہیں علم نہیں۔

وَاِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً ؕ نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهٖ مِنْۢ بَيْنِ فَرْثٍ وَّ دَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِيْنَ۝ (۶۶:۱۶)

اور چار پایوں کے وجود میں تمہارے لئے (فہم و بصیرت کی) بڑی ہی عبرت ہے۔ انہیں جانوروں کے جسم میں سے ہم خون اور کثافتوں کے درمیان پاک وصاف دودھ پیدا کر دیتے ہیں جو پینے والوں کے لئے بے غل وغش مشروب ہوتا ہے۔

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْۢ بُيُوْتِكُمْ سَكَنًا وَّ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ جُلُوْدِ الْاَنْعَامِ بُيُوْتًا تَسْتَخِفُّوْنَهَا يَوْمَ ظَعْنِكُمْ وَ يَوْمَ اِقَامَتِكُمْ وَ مِنْ اَصْوَافِهَا وَ اَوْبَارِهَا وَ اَشْعَارِهَا اَثَاثًا وَّ مَتَاعًا اِلٰى حِيْنٍ۝ (۸۰:۱۶)

اور (دیکھو!) اللہ نے تمہارے گھروں کو تمہارے لئے سکونت کی جگہ بنایا، اور (جو لوگ شہروں میں نہیں بستے، ان کے لئے ایسا سامان کر دیا کہ) چار پایوں کی کھال کے خیمے بنا دیئے۔ سفر اور اقامت، دونوں حالتوں میں انہیں ہلکا پاتے ہو۔ اسی طرح جانوروں کی اون، رووں اور بالوں سے طرح طرح کی چیزیں پیدا کر دیں جن سے ایک خاص وقت تک تمہیں فائدہ پہنچتا ہے!

ایک انسان کتنی ہی محدود اور غیر متمدن زندگی رکھتا ہو، لیکن اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہو سکتا کہ اس کا گردوپیش اسے فائدہ پہنچا رہا ہے۔ ایک لکڑہارا بھی اپنے جھونپڑے میں بیٹھا ہوا نظر اٹھاتا ہے تو گو اپنے احساس کے لئے بہتر تعبیر نہ پائے، لیکن یہ حقیقت ضرور محسوس کر لیتا ہے وہ جب بیمار ہوتا ہے تو جنگل کی جڑی بوٹیاں کھا لیتا ہے، دھوپ تیز ہوتی ہے تو درختوں کے سایے میں بیٹھ جاتا ہے، بیکار ہوتا ہے تو پتوں کی سرسبزی اور پھولوں کی خوش نمائی سے آنکھیں سینکنے لگتا ہے۔ پھر یہی درخت ہیں جو اپنی شادابی میں اسے پھل بخشتے ہیں، پختگی میں لکڑی کے تختے بن جاتے ہیں، کہنگی میں آگ کے شعلے بھڑکا دیتے ہیں۔ ایک ہی مخلوق نباتی ہے جو اپنے منظر سے نزہت و سرور بخشتی ہے۔ اپنی بو سے ہوا کو معطر کرتی ہے، اپنے پھل میں طرح طرح کی غذائیں رکھتی ہے، اپنی لکڑی سے سامان تعمیر مہیا کرتی ہے، اور پھر خشک ہو جاتی ہے تو اس کے جلانے سے آگ بھڑکتی، چولہے گرم کرتی، موسم کو معتدل بناتی اور اپنی حرارت سے بے شمار اشیاء کے پکنے، پگھلنے اور تپنے کا ذریعہ بنتی ہے۔

اَلَّذِیْ جَعَلَ لَکُمْ مِّنَ الشَّجَرِ الْاَخْضَرِ نَارًا فَاِذَآ اَنْتُمْ مِّنْهُ تُوْقِدُوْنَ۝

(۸۰:۳۶)

(اور دیکھو!) وہ کارفرمائے قدرت جس نے سرسبز درخت سے تمہارے لئے آگ پیدا کر دی، اب تم اسی سے (اپنے چولہوں کی) آگ سلگا لیتے ہو!

اور پھر یہ وہ فوائد ہیں جو تمہیں اپنی جگہ محسوس ہو رہے ہیں، لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ فطرت نے یہ تمام چیزیں کن کن کاموں اور کن کن مصلحتوں کے لئے پیدا کی ہیں اور کارفرمائے عالم کارگاہ ہستی کے بنانے سنوارنے کے لئے ان سے کیا کیا کام نہیں لے رہا ہے؟

وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ (۳۱:۷۴)

اور تمہارا پروردگار (اس کارزار ہستی کی کارفرمائیوں کے لئے) فوجیں رکھتا ہے، ان کا حال اس کے سوا کون جانتا ہے؟

پھر یہ حقیقت بھی پیش نظر رہے کہ فطرت نے کائنات ہستی کے افادہ وفیضان کا نظام کچھ اس طرح بنایا ہے کہ وہ بیک وقت ہر مخلوق کو یکساں طور پر نفع پہنچاتا اور ہر مخلوق کی یکساں طور پر رعایت ملحوظ رکھتا ہے۔ اگر ایک انسان اپنے عالی شان محل میں بیٹھ کر محسوس کرتا ہے کہ تمام کارخانہ ہستی صرف اسی کی کاربرآریوں کے لئے ہے تو ٹھیک اسی طرح ایک چیونٹی بھی اپنے بل میں کہہ سکتی ہے کہ فطرت کی ساری کارفرمائیاں صرف اسی کی کاربرآریوں کے لئے ہیں اور کون ہے جو اسے جھٹلانے کی جرات کرسکتا ہے؟ کیا فی الحقیقت سورج اس لئے نہیں ہے کہ اس کے لئے حرارت بہم پہنچائے؟ کیا بارش اس لئے نہیں ہے کہ اس کے لئے رطوبت مہیا کرے؟ کیا ہوا اس لئے نہیں ہے کہ اس کی ناک تک شکر کی بو پہنچادے؟ کیا زمین اس لئے نہیں ہے کہ ہر موسم اور ہر حالت کے مطابق اس کے لئے مقام ومنزل بنے؟ دراصل فطرت کی بخشایشوں کا قانون کچھ ایسا عام اور ہمہ گیر واقع ہوا ہے کہ وہ ایک ہی وقت میں، ایک ہی طریقہ سے، ایک ہی نظام کے ماتحت، ہر مخلوق کی نگہداشت کرتا اور ہر مخلوق کو یکساں طور پر فائدہ اٹھانے کا موقع دیتا ہے، حتیٰ کہ ہر وجود اپنی جگہ محسوس کرسکتا ہے کہ یہ پورا کارخانہ عالم صرف اسی کی کام جوئیوں اور آسائشوں کے لئے سرگرم کار ہے۔

وَمَا مِنۡ دَآبَّةٍ فِي الۡاَرۡضِ وَلَا طٰٓئِرٍ يَّطِيۡرُ بِجَنَاحَيۡهِ اِلَّاۤ اُمَمٌ اَمۡثَالُكُمۡ ؕ (۶:۳۸)

اور زمین کے تمام جانور اور (پردار) بازوؤں سے اڑنے والے تمام پرند دراصل تمہاری ہی طرح امتیں ہیں۔

کائنات کی تخریب بھی تعمیر کے لئے ہے

البتہ یہ حقیقت فراموش نہیں کرنی چاہئے کہ دنیا عالم کون وفساد ہے۔ یہاں ہر بننے کے ساتھ بگڑنا ہے۔ اور سمٹنے کے ساتھ بکھرنا، لیکن جس طرح سنگ تراش کا توڑنا پھوڑنا بھی اس لئے ہوتا ہے کہ خوبی ودل آویزی کا ایک پیکر تیار کردے، اسی طرح کائنات عالم کا تمام بگاڑ بھی اس لئے ہے کہ بناؤ اور خوبی کا فیضان ظہور میں آئے۔ تم ایک عمارت بناتے ہو، لیکن

اس "بنانے" کا مطلب کیا ہوتا ہے؟ کیا یہی نہیں ہوتا کہ بہت سی بنی ہوئی چیزیں "بگڑ" گئیں؟ چٹانیں اگر نہ کاٹی جاتیں، بھٹے اگر نہ سلگائے جاتے، درختوں پر آرہ اگر نہ چلتا تو ظاہر ہے عمارت کا بناؤ بھی ظہور میں نہ آتا۔ پھر یہ راحت وسکون جو تمہیں ایک عمارت کی سکونت سے حاصل ہوتا ہے، کس صورت حال کا نتیجہ ہے؟ یقیناً اسی شور وشر اور ہنگامہ تخریب کا جو سروسامان تعمیر کی جدوجہد نے عرصہ تک جاری رکھا تھا۔ اگر تخریب کا یہ شور وشر نہ ہوتا تو عمارت کا عیش وسکون بھی وجود میں نہ آتا۔ پس یہی حال فطرت کی تعمیری سرگرمیوں کا بھی سمجھو۔ وہ عمارت ہستی کا ایک ایک گوشہ تعمیر کرتی رہتی ہے۔ وہ اس کارخانہ کا ایک ایک کیل پرزہ ڈھالتی رہتی ہے، وہ اس کی درستگی وخوبی کی حفاظت کے لئے ہر نقصان کا دفعیہ اور ہر فساد کا ازالہ چاہتی ہے۔ تعمیر ودرستگی کی یہی سرگرمیاں ہیں جو تمہیں بعض اوقات تخریب ونقصان کی ہولناکیاں دکھائی دیتی ہیں۔ حالانکہ یہاں تخریب کب ہے؟ جو کچھ ہے تعمیر ہی تعمیر ہے۔ سمندر میں تلاطم، دریا میں طغیانی، پہاڑوں میں آتش افشانی، جاڑوں میں برف باری، گرمیوں میں سموم، بارش میں ہنگامۂ ابروباد، تمہارے لئے خوش آیند مناظر نہیں ہوتے، لیکن تم نہیں جانتے کہ ان میں سے ہر حادثہ کائنات ہستی کی تعمیر ودرستگی کے لئے اتنا ہی ضروری ہے جس قدر دنیا کی کوئی مفید سے مفید چیز تمہاری نگاہ میں ہوسکتی ہے۔ اگر سمندر میں طوفان نہ اٹھتے تو میدانوں کو زندگی وشادابی کے لئے ایک قطرہ بارش میسر نہ آتا۔ اگر بادل کی گرج اور بجلی کی کڑک نہ ہوتی تو باران رحمت کا فیضان بھی نہ آتا۔ اگر آتش فشاں پہاڑوں کی چوٹیاں نہ پھٹتیں تو زمین کے اندر کا کھولتا ہوا مادہ اس کرہ کی تمام سطح پارہ پارہ کر دیتا۔ تم بول اٹھو گے: یہ مادہ پیدا ہی کیوں کیا گیا؟ لیکن تمہیں جاننا چاہئے کہ اگر یہ مادہ نہ ہوتا تو زمین کی قوت نشوونما کا ایک ضروری عنصر مفقود ہو جاتا۔ یہی حقیقت ہے جس کی طرف قرآن نے جا بجا اشارات کئے ہیں، مثلاً سورہ روم میں ہے:

وَمِنْ اٰيٰتِهٖ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ
مَآءً فَيُحْيٖ بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ

يَّعْقِلُوْنَ O (۳۰:۲۴)

اور (دیکھو!) اس کی (قدرت وحکمت کی) نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ ہے کہ بجلی کی چمک اور کڑک نمودار کرتا ہے اور اس سے تم پر خوف اور امید دونوں کی حالتیں طاری ہو جاتی ہیں۔ اور آسمان سے پانی برساتا ہے۔ اور پانی کی تاثیر سے زمین مرنے کے بعد دوبارہ جی اٹھتی ہے۔ بلاشبہ اس صورت حال میں ان لوگوں کے لئے جو عقل وبینش رکھتے ہیں (حکمت الٰہی کی) بڑی ہی نشانیاں ہیں!

جمال فطرت

لیکن فطرت کے افادہ وفیضان کی سب سے بڑی بخشایش اس کا عالم گیر حسن و جمال ہے۔ فطرت صرف بناتی اور سنوارتی ہی نہیں، بلکہ اس طرح بناتی اور سنوارتی ہے کہ اس کے ہر بناؤ میں حسن وزیبائی کا جلوہ اور اس کے ہر ظہور میں نظر افروزی کی نمود پیدا ہو گئی ہے۔ کائنات ہستی کو اس کی مجموعی حیثیت میں دیکھو یا اس کے ایک ایک گوشہ خلقت پر نظر ڈالو، اس کا کوئی رخ نہیں جس پر حسن ورعنائی نے ایک نقاب زیبایش نہ ڈال دی ہو۔ ستاروں کا نظام اور ان کی سیر وگردش، سورج کی روشنی اور اس کی بوقلمونی، چاند کی گردش اور اس کا اتار چڑھاؤ، فضاء آسمانی کی وسعت اور اس کی نیز نگیاں، بارش کا سماں اور اس کے تغیرات، سمندر کا منظر اور دریاؤں کی روانی، پہاڑوں کی بلندیاں اور وادیوں کا نشیب، حیوانات کے اجسام اور ان کا تنوع، نباتات کی صورت آرائیاں اور باغ وچمن کی رعنائیاں، پھولوں کی عطر بیزی اور پرندوں کی نغمہ سنجی، صبح کا چہرہ خنداں اور شام کا جلوہ محجوب، غرضیکہ تمام تماشا گاہ ہستی حسن کی نمائش اور نظر افروزی کی جلوہ گاہ ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا اس پردۂ ہستی کے پیچھے حسن افروزی اور جلوہ آرائی کی کوئی قوت کام رہی ہے جو چاہتی ہے کہ جو کچھ بھی ظہور میں آئے، حسن وزیبایش کے ساتھ ظہور میں آئے اور کارخانہ ہستی کا ہر گوشہ نگاہ کے لئے بہشت راحت وسکون بن جائے!

دراصل کائنات ہستی کا مایہ خمیر ہی حسن وزیبائی ہے۔ فطرت نے جس طرح اس کے بناؤ

کے لیئے مادی عناصر پیدا کیئے، اسی طرح اس کی خوب روئی اور رعنائی کے لیئے معنوی عناصر کا بھی رنگ و روغن آراستہ کر دیا۔ روشنی، رنگ، خوشبو اور نغمہ حسن و رعنائی کے وہ اجزا ہیں جن سے مشاطۂ فطرت چہرہ وجود کی آرائش کر رہی ہے۔

مشاطہ را بگو کہ بر اسباب حسن یار
چیزی فزوں کند کہ تماشا بما رسد

صُنۡعَ اللّٰهِ الَّذِیۡۤ اَتۡقَنَ كُلَّ شَیۡءٍ (۲۷:۸۸)

یہ اللہ کی کاریگری ہے جس نے ہر چیز خوبی اور درستگی کے ساتھ بنائی!

ذٰلِكَ عٰلِمُ الۡغَیۡبِ وَالشَّهَادَةِ الۡعَزِیۡزُ الرَّحِیۡمُ ۝ الَّذِیۡۤ اَحۡسَنَ كُلَّ شَیۡءٍ خَلَقَهٗ (۳۲:۶،۷)

یہ اللہ ہے، محسوسات اور غیر محسوسات کا جاننے والا، طاقت والا، رحمت والا جس نے جو چیز بنائی، حسن و خوبی کے ساتھ بنائی۔

بلبل کی نغمہ سنجی اور زاغ وزغن کا شور و غوغا

بلاشبہ کاروبار فطرت کے بعض مظاہر ایسے بھی ہیں جن میں تمہیں حسن و خوبی کی کوئی گیرائی محسوس نہیں ہوتی۔ تم کہتے ہو قمری و بلبل کی نغمہ سنجیوں کے ساتھ زاغ و زغن کا شور و غوغا کیوں ہے؟ لیکن تم بھول جاتے ہو کہ ارغنون ہستی کا نغمہ کسی ایک آہنگ ہی سے نہیں بنا ہے اور نہ بننا چاہئے تھا۔ جس طرح تمہارے آلات موسیقی کے پردوں میں زیر و بم کے تمام آہنگ موجود ہیں۔ اس میں ہلکے سے ہلکے سر بھی ہیں جن سے باریک اور سریلی صدائیں نکلتی ہیں، موٹے سے موٹے سر بھی ہیں جو بلند سے بلند اور بھاری سے بھاری صدائیں پیدا کرتے ہیں۔ ان تمام سروں کے ملنے سے جو کیفیت پیدا ہوتی ہے، وہی موسیقی کی حلاوت ہے، کیونکہ دنیا کی تمام چیزوں کی طرح موسیقی کی حقیقت بھی مختلف اجزاء کے امتزاج و تالیف سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ کسی ایک ہی سر سے نغمے کی حلاوت پیدا ہو جائے۔ اگر تم بین یا ستار اٹھا کر صرف اس کے چڑھاؤ کا کوئی ایک پردہ چھیڑ دو گے، یا پیانو کی بھاری کنجیوں میں سے کوئی

ایک کنجی ہی بجانے لگو گے تو یہ نغمہ نہ ہوگا، بھاں بھاں کی ایک کرخت آواز ہوگی۔ یہی حال موسیقی فطرت کے زیروبم کا بھی ہے۔ تمہیں کوے کی کائیں کائیں اور چیل کی چیخ میں کوئی دل کشی محسوس نہیں ہوتی، لیکن موسیقی فطرت کی تالیف کے لئے جس طرح قمری و بلبل کا ہلکا سر ضروری تھا، اسی طرح زاغ وزغن کا بھاری اور کرخت سر بھی ناگزیر تھا۔ بلبل وقمری کو اس سرگم کا اتار سمجھو اور زاغ وزغن کو چڑھاؤ۔

بر اہل ذوق در فیض در نمی بندو
نوائے بلبل اگر نیست صوت زاغ شنو!

تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ۗ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ۗ اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا. (۱۷:۴۴)

ساتوں آسمان اور زمین اور جو کوئی بھی ان میں ہے، سب (اپنی بناوٹ کی خوبی اور صنعت کے کمال میں) اللہ کی بڑائی اور پاکی کا (زبان حال سے) اعتراف کر رہے ہیں اور (اتنا ہی نہیں بلکہ کائنات خلقت میں) کوئی چیز بھی ایسی نہیں جو (زبان حال سے) اس کی تسبیح وتحمید نہ کر رہی ہو، مگر (افسوس کہ) تم (اپنے جہل وغفلت سے) اس ترانہ تسبیح کو سمجھتے نہیں (بلاشبہ وہ بڑا ہی بردبار، بڑا ہی بخشنے والا ہے) [۳۰]

فطرت کی حسن افروزیاں اور رحمت الٰہی کی بخشش

آؤ چند لمحوں کے لئے پھر ان سوالات پر غور کر لیں جو پہلے گزر چکے ہیں۔ فطرت کائنات کی یہ تمام حسن افروزیاں اور جلوہ آرائیاں کیوں ہیں؟ یہ کیوں ہے کہ فطرت حسین ہے اور جو کچھ اس سے ظہور میں آتا ہے، وہ حسن وجمال ہی ہوتا ہے؟ کیا یہ ممکن نہ تھا کہ کارخانہ ہستی ہوتا، لیکن رنگ کی نظر افروزیاں، بو کی عطر بیزیاں، نغمہ کی جاں نوازیاں نہ ہوتیں؟ کیا ایسا نہیں ہوسکتا تھا کہ سب کچھ ہوتا، لیکن سبزہ وگل کی رعنائیاں اور قمری وبلبل کی نغمہ سنجیاں نہ ہوتیں؟ یقیناً دنیا اپنے بننے کے لئے اس کی محتاج نہ تھی کہ تتلی کے پروں میں

عجیب وغریب نقش ونگار ہوں اور رنگ برنگ کے دل فریب پرند درختوں کی شاخوں پر چہچہا رہے ہوں۔ایسا بھی ہو سکتا تھا کہ درخت ہوتے مگر قامت کی بلندی، پھیلاؤ کی موزونیت، شاخوں کی ترتیب، پتوں کی سبزی، پھولوں کی رنگا رنگی نہ ہوتی۔ پھر یہ کیوں ہے کہ تمام حیوانات اپنی اپنی حالت اور گرد وپیش کے مطابق ڈیل ڈول کی موزونیت اور اعضا کا تناسب ضرور ہی رکھیں اور کوئی وجود ہی نہ ہو جو اپنی شکل ومنظر میں ایک خاص طرح کا معتدل پیمانہ نہ رکھتا ہو؟

انسانی علم ونظر کی کاوشیں آج تک یہ عقدہ حل نہ کر سکیں کہ یہاں تعمیر کے ساتھ تحسین کیوں ہے؟ مگر قرآن کہتا ہے کہ یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ خالق کائنات ''الرحمٰن'' اور ''الرحیم'' ہے، یعنی اس میں رحمت ہے اور اس کی رحمت اپنا ظہور وفعل بھی رکھتی ہے۔رحمت کا مقتضی یہی تھا کہ بخشش ہو، فیضان ہو، جود واحسان ہو۔پس اس نے ایک طرف تو ہمیں زندگی اور زندگی کے تمام احساس وعواطف بخش دیئے جو خوش نمائی اور بدنمائی میں امتیاز کرتے اور خوبی وجمال سے کیف وسرور حاصل کرتے ہیں، دوسری طرف کارگاہ ہستی کو اپنی حسن آرائیوں اور جاں فزائیوں سے اس طرح آراستہ کر دیا کہ اس کا ہر گوشہ نگاہ کے لئے جنت، سامعہ کے لئے حلاوت اور روح کے لئے سرمایہ کیف وسرور بن گیا۔

فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ٥ (۱۴:۲۳)

پس کیا ہی بابرکت ذات ہے اللہ کی، بنانے والوں میں سب سے زیادہ حسن وخوبی کے ساتھ بنانے والا۔

قدرت کا خودرو سامان راحت وسرور اور انسان کی ناشکری

ہم زندگی کی بناوٹی اور خودساختہ آسائشوں میں اس درجہ منہمک ہو گئے ہیں کہ ہمیں قدرتی راحتوں پر غور کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا اور بسا اوقات تو ہم ان کی قدر وقیمت کے اعتراف سے بھی انکار کر دیتے ہیں۔لیکن اگر چند لمحوں کے لئے اپنے آپ کو اس غفلت سے بیدار کر لیں تو معلوم ہو جائے کہ کائنات ہستی کا حسن وجمال فطرت کی ایک عظیم اور بے

پایاں بخشش ہے اور اگر یہ نہ ہوتی یا ہم میں اس کا احساس نہ ہوتا تو زندگی زندگی نہ ہوتی نہیں معلوم کیا چیز ہو جاتی؟ ممکن ہے موت کی بدحالیوں کا ایک تسلسل ہوتا۔

ایک لمحہ کے لئے تصور کرو کہ دنیا موجود ہے، مگر حسن و زیبائی کے تمام جلووں اور احساسات سے خالی ہے۔ آسمان ہے مگر فضا کی یہ نگاہ پرور نیلگونی نہیں ہے، ستارے ہیں مگر ان کی درخشندگی و جہاں تابی کی یہ جلوہ آرائی نہیں ہے، درخت ہیں مگر بغیر سبزی کے، پھول ہیں مگر بغیر رنگ و بو کے، اشیاء کا اعتدال، اجسام کا تناسب، صداؤں کا ترنم، روشنی و رنگت کی بوقلمونی، ان میں سے کوئی چیز بھی وجود نہیں رکھتی، یا یوں کہا جائے کہ ہم میں ان کا احساس نہیں ہے۔ غور کرو! ایک ایسی دنیا کے ساتھ زندگی کا تصور کیسا بھیانک اور ہولناک منظر پیش کرتا ہے؟ ایسی زندگی جس میں نہ تو حسن کا احساس ہو نہ حسن کی جلوہ آرائی، نہ نگاہ کے لئے سرور ہو نہ سامعہ کے لئے حلاوت، نہ جذبات کی رقت ہو نہ محسوسات کی لطافت، یقیناً عذاب و جاں کاہی کی ایسی حالت ہوتی جس کا تصور بھی ہمارے لئے ناقابل برداشت ہے۔

لیکن جس قدرت نے ہمیں زندگی دی، اس نے یہ بھی ضروری سمجھا کہ زندگی کی سب سے بڑی نعمت یعنی حسن و زیبائی کی بخشش سے بھی مالا مال کر دے۔ اس نے ایک ہاتھ سے ہمیں حسن کا احساس دیا، دوسرے ہاتھ سے تمام دنیا کو جلوہ حسن بنا دیا۔ یہی حقیقت ہے جو ہمیں رحمت کی موجودگی کا یقین دلاتی ہے۔ اگر پردہ ہستی کے پیچھے صرف خالقیت ہی ہوتی، رحمت نہ ہوتی، یعنی پیدا کرنے یا پیدا ہو جانے کی قوت ہوتی، مگر افادہ و فیضان کا ارادہ نہ ہوتا تو یقیناً کائنات ہستی میں فطرت کے فضل و احسان کا یہ عالم گیر مظاہرہ بھی نہ ہوتا۔

اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً ۭ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ ۝ (۳۱:۲۰)

کیا تم نے کبھی اس بات پر غور نہیں کیا کہ جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، وہ سب تمہارے لئے خدا نے مسخر کر دیا ہے اور اپنی تمام نعمتیں

ظاہری طور پر بھی اور باطنی طور پر بھی پوری کر دی ہیں۔ انسانوں میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہیں، بغیر اس کے کہ ان کے پاس کوئی علم ہو یا ہدایت ہو یا کوئی کتاب روشن۔

انسانی طبیعت کی یہ عالمگیر کمزوری ہے کہ جب تک وہ ایک نعمت سے محروم نہیں ہو جاتا، اس کی قدر و قیمت کا ٹھیک ٹھیک اندازہ نہیں کر سکتا۔ تم گنگا کے کنارے بستے ہو اس لئے تمہارے نزدیک زندگی کی سب سے زیادہ بے قدر چیز پانی ہے۔ لیکن اگر یہی پانی چوبیس گھنٹے تک میسر نہ آئے تو تمہیں معلوم ہو جائے اس کی قدر و قیمت کا کیا حال ہے۔ یہی حال فطرت کے فیضان جمال کا بھی ہے۔ اس کے عام اور بے پردہ جلوے شب و روز تمہاری نگاہوں کے سامنے سے گزرتے رہتے ہیں اس لئے تمہیں ان کی قدر و قیمت محسوس نہیں ہوتی۔ صبح اپنی ساری جلوہ آرائیوں کے ساتھ روز آتی ہے اس لئے تم بستر سے سر اٹھانے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ چاندنی اپنی ساری حسن افروزیوں کے ساتھ ہمیشہ نکھرتی رہتی ہے، اس لئے تم کھڑکیاں بند کر کے سو جاتے ہو لیکن جب یہی شب و روز کے جلوہ ہائے فطرت تمہاری نظروں سے روپوش ہو جاتے ہیں یا تم میں ان کے نظارہ و سماع کی استعداد باقی نہیں رہتی تو غور کرو اس وقت تمہارے احساسات کا کیا حال ہوتا ہے؟ کیا تم محسوس نہیں کرتے کہ ان میں سے ہر چیز زندگی کی ایک بے بہا برکت اور معیشت کی ایک عظیم الشان نعمت تھی؟ سرد ملکوں کے باشندوں سے پوچھو جہاں سال کا بڑا حصہ ابر آلود گزرتا ہے۔ کیا سورج کی کرنوں سے بڑھ کر بھی زندگی کی کوئی مسرت ہو سکتی ہے؟ ایک بیمار سے پوچھو جو نقل و حرکت سے محروم بستر مرض پر پڑا ہے وہ بتائے گا کہ آسمان کی صاف اور نیلگوں فضا کا ایک نظارہ راحت و سکون کی کتنی بڑی دولت ہے، ایک اندھا جو کہ پیدائشی اندھا نہ تھا، تمہیں بتا سکتا ہے کہ سورج کی روشنی اور باغ و چمن کی بہار دیکھے بغیر زندگی بسر کرنا کیسی ناقابل برداشت مصیبت ہے! تم بسا اوقات زندگی کی مصنوعی آسائشوں کے لئے ترستے ہو اور خیال کرتے ہو کہ زندگی کی سب سے بڑی نعمت چاندی سونے کا ڈھیر اور جاہ و حشم کی نمائش

ہے لیکن تم بھول جاتے ہو کہ زندگی کی حقیقی مسرتوں کا جو خود رو سامان فطرت نے ہر مخلوق کے لئے پیدا کر رکھا ہے، اور اگر انسان کو وہ سب کچھ میسر ہو تو پھر اس کے بعد کیا باقی رہ جاتا ہے؟ جس دنیا میں سورج روز چمکتا ہو، جس کی راتیں آسمان کی قندیلوں سے مزین اور جس کی چاندنی حسن افروزیوں سے جہاں تاب رہتی ہو، جس کی بہار سبزہ وگل سے لدی ہوئی اور جس کی فصلیں لہلاتے ہوئے کھیتوں سے گراں بار ہوں، جس دنیا میں روشنی اپنی چمک، رنگ اپنی بوقلمونی، خوشبو اپنی عطر بیزی اور موسیقی اپنا نغمہ آہنگ رکھتی ہو، کیا اس دنیا کا کوئی باشندہ آسائش حیات سے محروم اور نعمت معیشت سے مفلس ہو سکتا ہے؟ کیا کسی آنکھ کے لئے جو دیکھ سکتی ہو اور کسی دماغ کے لئے جو محسوس کر سکتا ہو، ایک ایسی دنیا میں نامرادی و بدبختی کا گلہ جائز ہے؟ قرآن نے جابجا انسان کو اس کے اسی کفران نعمت پر توجہ دلائی ہے۔

وَاٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ ؕ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا. اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ. (۱۴:۳۴)

اور اس نے تمہیں وہ تمام چیزیں دے دیں جو تمہیں مطلوب تھیں۔ اور اگر اللہ کی نعمتیں شمار کرنی چاہو تو وہ اتنی ہیں کہ کبھی شمار نہیں کر سکو گے۔ بلاشبہ انسان بڑا ہی ناانصاف، بڑا ہی ناشکرا ہے!

جمال معنوی

پھر فطرت کی بخشایش جمال کے اس گوشہ پر بھی نظر ڈالو کہ اس نے جس طرح جسم و صورت کو حسن وزیبائی بخشی، اسی طرح اس کی معنویت کو بھی جمال معنوی سے آراستہ کر دیا۔ جسم وصورت کا جمال یہ ہے کہ ہر وجود کے ڈیل ڈول اور اعضاء و جوارح میں تناسب ہے، معنویت کا جمال یہ ہے کہ ہر چیز کی کیفیت اور باطنی قویٰ میں اعتدال ہے اسی قوت کے اعتدال سے خواص اور فوائد پیدا ہوئے ہیں اور یہی اعتدال ہے جس نے حیوانات میں ادراک و حواس کی قوتیں بیدار کر دیں اور پھر انسان کے درجے میں پہنچ کر جو ہر عقل وفکر کا چراغ روشن کر دیا۔

وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْئًا وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ۝ (۱۶:۷۸)

اور (دیکھو!) یہ اللہ ہی کی کارفرمائی ہے کہ تم اپنی ماؤں کے شکم سے پیدا ہوتے ہو اور کسی طرح کی سمجھ بوجھ تم میں نہیں ہوتی، لیکن اس نے تمہارے لئے دیکھنے سننے کے حواس بنا دیئے اور سوچنے سمجھنے کے لئے عقل دے دی، تاکہ اس کی نعمت کے شکر گزار رہو۔

کائنات ہستی کے اسرار و غوامض بے شمار ہیں، لیکن روح حیوانی کا جوہر ادراک زندگی کا سب سے زیادہ لاینحل عقدہ ہے۔ حیوانات میں کیڑے مکوڑے تک ہر طرح کا احساس وادراک رکھتے ہیں اور انسانی دماغ کے نہاں خانہ میں عقل و تفکر کا چراغ روشن ہے یہ قوتِ احساس، یہ قوتِ ادراک، کیونکر پیدا ہوئی؟ مادی عناصر کی ترکیب وامتزاج سے ایک ماورائے مادہ جوہر کس طرح ظہور میں آ گیا؟ چیونٹی کو دیکھو! اس کے دماغ کا حجم سوئی کی نوک سے شاید ہی کچھ زیادہ ہوگا، لیکن مادے کے اس حقیر ترین عصبی ذرے میں بھی احساس وادراک، محنت واستقلال، ترتیب وتناسب، نظم وضبط اور صنعت واختراع کی ساری قوتیں مخفی ہوتی ہیں اور وہ اپنے اعمال حیات کی کرشمہ سازیوں سے ہم پر رعب اور حیرت کا عالم طاری کر دیتی ہے۔ شہد کی مکھی کی کارفرمائیاں ہر روز تمہاری نظروں سے گزرتی رہتی ہیں۔ یہ کون ہے جس نے ایک چھوٹی سی مکھی میں تعمیر وتحسین کی ایسی منتظم قوت پیدا کر دی ہے؟ قرآن کہتا ہے: یہ اس لئے ہے کہ رحمت کا مقتضی جمال تھا اور ضروری تھا کہ جس طرح اس نے جمال صوری سے دنیا آراستہ کر دی ہے، اسی طرح جمال معنوی کی بخشایشوں سے بھی اسے مالا مال کر دیتی۔

ذٰلِكَ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ۝ الَّذِيْٓ اَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ۝ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ۝ ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَجَعَلَ لَكُمُ

السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَۃَ ؕ قَلِیْلًا مَّا تَشْکُرُوْنَ ○ (۳۲:۶-۹)

یہ محسوسات اور غیر محسوسات کا جاننے والا عزیز و رحیم ہے جس نے جو چیز بھی بنائی حسن و خوبی کے ساتھ بنائی۔ چنانچہ یہ اسی کی قدرت و حکمت ہے کہ انسان کی پیدائش مٹی سے شروع کی، پھر اس کے توالد و تناسل کا سلسلہ (خون کے) خلاصے سے جو پانی کا ایک حقیر سا قطرہ ہوتا ہے، قائم کر دیا۔ پھر اس کی تمام قوتوں کی درستگی کی اور اپنی روح (میں سے ایک قوت) پھونک دی اور (اس طرح) اس کے لئے سننے، دیکھنے اور فکر کرنے کی قوتیں پیدا کر دیں۔ (لیکن افسوس انسان کی غفلت پر!) بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ وہ (اللہ کی رحمت کا) شکر گزار ہو۔

بقاء انفع

لیکن کائنات ہستی کا یہ بناؤ، یہ حسن، یہ ارتقاء قائم نہیں رہ سکتا تھا، اگر اس میں خوبی کے بقاء اور خرابی کے ازالے کے لئے ایک اٹل قوت سرگرم کار نہ رہتی۔ یہ قوت کیا ہے؟ فطرت کا انتخاب ہے۔ فطرت ہمیشہ چھانٹتی رہتی ہے وہ ہر گوشے میں صرف خوبی اور بہتری ہی باقی رکھتی ہے، فساد اور نقص محو کر دیتی ہے۔ ہم فطرت کے اس انتخاب سے بے خبر نہیں ہیں۔ ہم اسے "بقاء اصلح" کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں۔ "اصلح" یعنی (Fittest) لیکن قرآن "بقاء اصلح" کی جگہ "بقاء انفع" کا ذکر کرتا ہے وہ کہتا ہے: اس کارگاہ فیضان و جمال میں صرف وہی چیز باقی رکھی جاتی ہے جس میں نفع ہو، کیونکہ یہاں رحمت کار فرما ہے اور رحمت چاہتی ہے کہ افادہ و فیضان ہو، نقصان و برہمی گوارا نہیں کر سکتی۔ تم سونا کٹھالی میں ڈال کر آگ پر رکھتے ہو، کھوٹ جل جاتا ہے، خالص سونا باقی رہ جاتا ہے۔ یہی مثال فطرت کے انتخاب کی ہے۔ کھوٹ میں نفع نہ تھا، نابود کر دیا گیا، سونے میں نفع تھا، باقی رہ گیا۔

اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتْ اَوْدِیَۃٌۢ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ السَّیْلُ زَبَدًا رَّابِیًا ؕ وَمِمَّا یُوْقِدُوْنَ عَلَیْهِ فِی النَّارِ ابْتِغَآءَ حِلْیَۃٍ اَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهٗ ؕ كَذٰلِكَ یَضْرِبُ اللّٰهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ

فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاۤءً وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ (۱۳:۱۷)

خدا نے آسمان سے پانی برسایا تو ندی نالوں میں جس قدر سمائی تھی اس کے مطابق بہہ نکلے، اور جس قدر کوڑا کرکٹ جھاگ بن کر اوپر آ گیا تھا، اسے سیلاب اٹھا کر بہا لے گیا۔ اسی طرح جب زیور یا اور کسی طرح کا سامان بنانے کے لئے (مختلف قسم کی دھاتیں) آگ میں پتاتے ہیں تو اس میں بھی جھاگ اٹھتا ہے اور میل کچیل کٹ کر نکل جاتی ہے۔ اسی طرح اللہ حق اور باطل کی مثال بیان کر دیتا ہے۔ جھاگ رائیگاں جائے گا (کیونکہ اس میں نفع نہ تھا) جس چیز میں انسان کے لئے نفع ہو گا وہ زمین میں باقی رہ جائے گی۔

تدریج وامہال

پھر اگر دقت نظر سے کام لو تو افادہ وفیضان فطرت کی حقیقت کچھ انہیں مظاہر پر موقوف نہیں ہے۔ بلکہ کارخانہ ہستی کے تمام اعمال وقوانین کا یہی حال ہے۔
تم دیکھتے ہو کہ فطرت کے تمام قوانین اپنی نوعیت میں کچھ اس طرح واقع ہوئے ہیں کہ اگر لفظوں میں اسے تعبیر کرنا چاہو تو صرف فطرت کے فضل ورحمت ہی سے تعبیر کر سکتے ہو، تمہیں اور کوئی تعبیر نہیں ملے گی مثلاً اس کے قوانین کا عمل کبھی فوری اور اچانک نہیں ہوتا۔ وہ جو کچھ کرتی ہے، آہستہ آہستہ بتدریج کرتی ہے اور اس تدریجی طرز عمل نے دنیا کے لئے مہلت اور ڈھیل کا فائدہ پیدا کر دیا ہے یعنی اس کا ہر قانون فرصتوں پر فرصتیں دیتا ہے اور اس کا ہر فعل عفو ودرگزر کا دروازہ آخر تک کھلا رکھتا ہے۔ بلاشبہ اس کے قوانین اپنے نفاذ میں اٹل ہیں، ان میں ردوبدل کا امکان نہیں۔

مَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ (۵۰:۲۹)

ہمارے یہاں جو بات ایک مرتبہ ٹھہرا دی گئی، اس میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی۔

اور اس لئے تم خیال کرنے لگتے ہو کہ ان کی قطعیت بے رحمی سے خالی نہیں لیکن تم نہیں سوچتے کہ جو قوانین اپنے نفاذ میں اس درجہ قطعی اور بے پروا ہیں، وہی اپنی نوعیت میں کس درجہ عفو و درگزر اور مہلت بخشی و صلاح کوشی کی روح بھی رکھتے ہیں؟ اسی لئے آیت مندرجہ صدر میں ''مَا یُبَدَّلُ الْقَوْلُ'' کے بعد ہی فرمایا:

وَمَآ اَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِo (۲۹:۵۰)

لیکن یہ بھی نہیں ہے کہ ہم بندوں کے لئے زیادتی کرنے والے ہوں۔

فطرت اگر چاہتی تو ہر حالت بیک دفعہ ظہور میں آجاتی۔ یعنی اس کے قوانین کا نفاذ فوری اور ناگہانی ہوتا، لیکن تم دیکھ رہے ہو کہ ایسا نہیں ہوتا۔ ہر حالت، ہر تاثیر، ہر انفعال کے ظہور و بلوغ کے لئے ایک خاص مدت مقرر کر دی گئی ہے اور ضروری ہے کہ بتدریج مختلف منزلیں پیش آئیں۔ پھر ہر منزل اپنے آثار و انداز رکھتی ہے اور آنے والے نتائج سے خبردار کرتی رہتی ہے۔ زندگی اور موت کے قوانین پر غور کرو! کس طرح زندگی بتدریج نشو و نما پاتی اور کس طرح درجہ بدرجہ مختلف منزلوں سے گزرتی ہے اور پھر کس طرح موت کمزوری و فساد کا ایک طول طویل سلسلہ ہے جو اپنے ابتدائی نقطوں سے شروع ہوتا اور یکے بعد دیگرے مختلف منزلیں طے کرتا ہوا آخری نقطہ بلوغ تک پہنچا کرتا ہے! تم بد پرہیزی کرتے ہو تو یہ نہیں ہوتا کہ فوراً ہی ہلاک ہو جاؤ، بلکہ بتدریج موت کی طرف بڑھنے لگتے ہو اور آخر کار ایک خاص مدت کے اندر جو ہر صورت حال کے لئے یکساں نہیں ہوتی، درجہ بدرجہ اترتے ہوئے موت کے آغوش میں جا گرتے ہو۔ نباتات کو دیکھو! درخت اگر آبیاری سے محروم ہو جاتے ہیں یا نقصان و فساد کا کوئی دوسرا سبب عارض ہو جاتا ہے تو یہ نہیں ہوتا کہ ایک ہی دفعہ مرجھا کر رہ جائیں یا کھڑے کھڑے اچانک گر جائیں، بلکہ بتدریج شادابی کی جگہ پژمردگی کی حالت طاری ہونا شروع ہو جاتی ہے اور پھر ایک خاص مدت کے اندر جو مقرر کر دی گئی ہے، یا تو بالکل مرجھا کر رہ جاتے ہیں یا جڑ کھوکھلی ہو کر گر پڑتے ہیں۔

اصطلاح قرآنی میں ''اجل''

یہی حال کائنات کے تمام تغیرات و انفعالات کا ہے۔ کوئی تغیر ایسا نہیں جو اپنا

تدریجی دور نہ رکھتا ہو ہر چیز بتدریج بنتی ہے اور اسی طرح بتدریج بگڑتی ہے بناؤ ہو یا بگاڑ، ممکن نہیں کہ ایک خاص مدت گزرے بغیر کوئی حالت بھی اپنی کامل صورت میں ظاہر ہو سکے یہ مدت جو ہر حالت کے ظہور کے لئے اس کی ''اجل'' یعنی مقررہ وقت ہے، مختلف گوشوں اور مختلف حالتوں میں مختلف مقدار رکھتی ہے اور بعض حالتوں میں اس کی مقدار اتنی طویل ہوتی ہے کہ ہم اپنے نظام اوقات سے اس کا حساب بھی نہیں لگا سکتے۔ قرآن نے اسے یوں تعبیر کیا ہے کہ جس مدت کو تم اپنے حساب میں ایک دن سمجھتے ہو، اگر اسے ایک ہزار برس یا پچاس ہزار برس تصور کر لو تو ایسے دنوں سے جو مہینے اور برس بنیں گے ان کی مقدار کتنی ہوگی۔

وَاِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ○ (۲۲:۴۷)

اور بلاشبہ تمہارے پروردگار کے حساب میں ایک دن ایسا ہے جیسے تمہارے حساب میں ایک ہزار برس۔

تکویر

فطرت کا یہی تدریجی طرز عمل ہے جسے قرآن نے ''تکویر'' سے بھی تعبیر کیا ہے، یعنی لپٹنے سے، وہ کہتا ہے: بجائے اس کے کہ اچانک دن کی روشنی نکل آتی اور ناگہاں رات کی اندھیری ابل پڑتی، فطرت نے رات اور دن کے ظہور کو اس طرح تدریجی بنا دیا ہے کہ معلوم ہوتا ہے رات آہستہ آہستہ دن میں لپٹتی جاتی ہے اور دن درجہ بدرجہ رات میں لپٹتا آتا ہے۔

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ۚ يُكَوِّرُ الَّيْلَ عَلَى النَّهَارِ وَيُكَوِّرُ النَّهَارَ عَلَى الَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۖ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى (۳۹:۵)

اللہ نے آسمانوں اور زمین کو حکمت و مصلحت کے ساتھ پیدا کیا ہے، اس نے رات اور دن کے یکے بعد دیگرے آتے رہنے کا ایسا انتظام کر دیا ہے کہ رات دن پر لپٹتی جاتی ہے اور دن رات پر لپٹتا آتا ہے اور سورج اور چاند دونوں کو اس کی قدرت نے

(ایک خاص انتظام کے ماتحت) مسخر کر رکھا ہے۔ سب (اپنی جگہ) اپنے مقررہ وقت تک کے لئے حرکت میں ہیں۔

قرآن اس تدریجی رفتار عمل کو فائدہ اٹھانے کا موقع دینے، ڈھیل دینے، عفو و درگزر کرنے اور ایک خاص مدت تک فرصت حیات بخشنے سے تعبیر کرتا ہے اور کہتا ہے: یہ اس لئے ہے کہ کائنات ہستی میں فضل و رحمت کی مشیت کام کر رہی ہے اور وہ چاہتی ہے ہر غلطی کو درستگی کے لئے، ہر نقصان کو تلافی کے لیے ہر لغزش کو سنبھل جانے کے لئے زیادہ سے زیادہ مہلت اصلاح ملتی رہے اور اس کا دروازہ کسی پر بند نہ ہو۔

تاخیر اجل

وہ کہتا ہے: اگر تدریج و امہال کی یہ فرصتیں اور بخششیں نہ ہوتیں تو دنیا میں ایک وجود بھی فرصت حیات سے فائدہ نہ اٹھا سکتا۔ ہر غلطی، ہر کمزوری، ہر نقصان، ہر فساد، اچانک، بیک دفعہ بربادی و ہلاکت کا باعث ہو جاتا۔

وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوْا مَا تَرَكَ عَلٰى ظَهْرِهَا مِنْ دَآبَّةٍ وَّلٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِعِبَادِهٖ بَصِيْرًا ۝ (۳۵:۴۵)

اور انسان جو کچھ اپنے اعمال سے کمائی کرتا ہے، اگر اللہ اس پر (فوراً) مواخذہ کرتا تو یقین کرو زمین کی سطح پر ایک جان دار بھی باقی نہ رہتا لیکن (یہ اس کی رحمت ہے کہ) اس نے ایک مقررہ وقت تک فرصت حیات دے رکھی ہے البتہ جب وہ مقررہ وقت آجائے گا تو پھر (یاد رہے کہ) اللہ اپنے بندوں کے اعمال سے بے خبر نہیں ہے۔ اس کی آنکھیں ہر وقت اور ہر حال میں سب کچھ دیکھ رہی ہیں۔

تدریج و امہال اچھائی اور برائی دونوں کے لئے ہے

قدرتی طور پر یہ ڈھیل اچھائی اور برائی دونوں کے لئے ہے۔ اچھائی کے لئے اس لئے، تاکہ زیادہ نشو و نما پائے، برائی کے لئے، اس لیے تاکہ متنبہ اور خبردار ہو کر اصلاح

وتلافی کا سامان کر لے۔

كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ۚ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا۝ (۱۷:۲۰)

ان لوگوں کو بھی اور ان لوگوں کو بھی (یعنی اچھوں کو بھی اور بروں کو بھی) سب کو تمہارے پروردگار کی بخشش میں سے حصہ مل رہا ہے اور تمہارے پروردگار کی بخشش کسی پر بند نہیں!

اگر قوانین فطرت کی ان مہلت بخشیوں سے فائدہ اٹھا کر نقصان وفساد کی اصلاح کر لی جائے، مثلاً تم نے بدپرہیزی کی تھی، اسے ترک کردو تو پھر اسی فطرت کا یہ بھی قانون ہے کہ اصلاح وتلافی کی ہر کوشش قبول کر لیتی ہے۔ اور نقصان وفساد کے جو نتائج نشوونما پانے لگے تھے، ان کا مزید نشوونما فوراً رک جاتا ہے۔ اتنا ہی نہیں، بلکہ اگر اصلاح بروقت اور ٹھیک ٹھیک کی گئی ہے تو پچھلے مضر اثرات بھی محو ہو جائیں گے اور اس طرح محو ہو جائیں گے، گویا کوئی خرابی پیش ہی نہیں آئی تھی لیکن اگر فطرت کی تمام مہلت بخشیاں رائیگاں گئیں، اس کا بار بار اور درجہ بدرجہ انداز بھی کوئی نتیجہ پیدا نہ کر سکا تو پھر بلاشبہ وہ آخری حد نمودار ہو جاتی ہے جہاں پہنچ کر فطرت کا آخری فیصلہ صادر ہو جاتا ہے۔ اور پھر جب اس کا فیصلہ صادر ہو جائے تو نہ تو اس میں چشم زدن کی تاخیر ہو سکتی ہے نہ کسی حال میں بھی تزلزل اور تبدیلی۔

فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ۝

(۱۶:۶۱)

پھر جب ان کا مقررہ وقت آ گیا تو اس سے نہ تو ایک گھڑی پیچھے رہ سکتے ہیں اور نہ آگے بڑھ سکتے ہیں (یعنی نہ تو اس کے نفاذ میں تاخیر ہو سکتی ہے نہ تقدیم، ٹھیک ٹھیک اپنے وقت میں اسے ہو جانا ہے)

تسکین حیات

زندگی کی محنتیں اور کاوشیں

یا مثلاً ہم دیکھتے ہیں انسان کی معیشت، قیام و بقاء کی جدوجہد اور کشاکش کا نام ہے، اس لئے قدرتی طور پر اس کا ہر گوشہ طرح طرح کی محنتوں اور کاوشوں سے گھرا ہوا ہے اور بحیثیت مجموعی زندگی اضطراری ذمہ داریوں کا بوجھ اور مسلسل مشقتوں کی آزمائش ہے۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ کَبَدٍ ○ (۹۰:۴)

بلاشبہ ہم نے انسان کو اس طرح بنایا ہے کہ اس کی زندگی مشقتوں سے گھری ہوئی ہے!

مشغولیت اور انہماک

لیکن بایں ہمہ فطرت نے کارخانہ معیشت کا ڈھنگ کچھ اس طرح کا بنا دیا ہے اور طبیعتوں میں کچھ اس طرح کی خواہشیں، ولولے اور انفعالات ودیعت کر دیئے ہیں کہ زندگی کے ہر گوشے میں ایک عجیب طرح کی دل بستگی، مشغولیت، ہماہمی اور سرگرمی پیدا ہو گئی ہے اور یہی زندگی کا انہماک ہے جس کی وجہ سے ہر ذی حیات نہ صرف زندگی کی مشقتیں برداشت کر رہا ہے بلکہ انہیں مشقتوں میں زندگی کی بڑی سے بڑی لذت و راحت محسوس کرتا ہے۔ یہ مشقتیں جس قدر زیادہ ہوتی ہیں اتنی ہی زیادہ زندگی کی دلچسپی اور محبوبیت بھی بڑھ جاتی ہے۔ اگر ایک انسان کی زندگی ان مشقتوں سے خالی ہو جائے تو وہ محسوس کرے گا کہ زندگی کی ساری لذتوں سے محروم ہو گیا اور اب زندہ رہنا اس کے لئے ناقابل برداشت بوجھ ہے!

حالات متفاوت ہیں لیکن زندگی کی دل بستگی اور سرگرمی سب کے لئے ہے

پھر دیکھو! کارساز فطرت کی یہ کیسی کرشمہ سازی ہے کہ حالات متفاوت ہیں، طبائع

متنوع ہیں، اشغال مختلف ہیں، اغراض متضاد ہیں، لیکن معیشت کی دل بستگی اور سرگرمی سب کے لئے یکساں ہے اور سب ایک ہی طرح اس کی مشغولیتوں کے لئے جوش وطلب رکھتے ہیں۔ مرد وعورت، طفل و جواں، امیر وفقیر، عالم و جاہل، قوی وضعیف، تندرست وبیمار، مجرد ومتاہل، حاملہ ومرضعہ سب اپنی اپنی حالتوں میں منہمک ہیں اور کوئی نہیں جس کے لئے زندگی کی کاوشوں میں محویت نہ ہو، امیر اپنے محل کے عیش ونشاط میں اور فقیر اپنی بے سروسامانیوں کی فاقہ مستی میں زندگی بسر کرتا ہے، لیکن دونوں کے لئے زندگی کی مشغولیتوں میں دل بستگی ہوتی ہے اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کون زیادہ مشغول ہے۔ ایک تاجر جس انہماک کے ساتھ اپنی لاکھوں روپیہ کی آمدنی کا حساب کرتا ہے، اسی طرح ایک مزدور بھی دن بھر کی محنت کے چند پیسے گن لیا کرتا ہے اور دونوں کے لئے یکساں طور پر زندگی محبوب ہوتی ہے۔ ایک حکیم کو دیکھو جو اپنے علم و دانش کی کاوشوں میں غرق ہے اور ایک دھقان کو دیکھو جو دوپہر کی دھوپ میں برہنہ سر ہل جوت رہا ہے اور پھر بتاؤ! کس کے لئے زندگی کی مشغولیتوں میں زیادہ دل بستگی ہے؟

پھر دیکھو! بچے کی پیدائش ماں کے لئے کیسی جاں کاہی ومصیبت ہوتی ہے! اس کی پرورش ونگرانی کس طرح خود فروشانہ مشقتوں کا ایک طول طویل سلسلہ ہے! تاہم یہ سارا معاملہ کچھ ایسی خواہشوں اور جذبوں کے ساتھ وابستہ کر دیا گیا ہے کہ ہر عورت میں ماں بننے کی قدرتی طلب ہے اور ہر ماں پرورش اولاد کے لئے مجنونانہ خود فراموشی رکھتی ہے۔ وہ زندگی کا سب سے بڑا دکھ سہے گی اور پھر اسی دکھ میں زندگی کی سب سے بڑی مسرت محسوس کرے گی۔ وہ جب اپنی معیشت کی ساری راحتیں قربان کر دیتی ہے اور اپنی رگوں کے خون کا ایک ایک قطرہ دودھ بنا کر پلا دیتی ہے تو اس کے دل کا ایک ایک ریشہ زندگی کے سب سے بڑے احساس مسرت سے معمور ہو جاتا ہے!

پھر کاروبار فطرت کے یہ تصرفات دیکھو کہ کس طرح نوع انسانی کے منتشر افراد اجتماعی زندگی کے بندھنوں سے باہم دگر مربوط کر دیئے گئے ہیں اور کس طرح صلہ رحمی کے رشتہ نے

ہر فرد کو سینکڑوں ہزاروں افراد کے ساتھ جوڑ رکھا ہے!

فرض کرو! زندگی و معیشت ان تمام موثرات سے خالی ہوتی، لیکن قرآن کہتا ہے کہ خالی نہیں ہوسکتی تھی، اس لئے کہ فطرت کائنات میں رحمت کارفرما ہے اور رحمت کا مقتضی یہی تھا کہ معیشت کی مشقتوں کو خوش گوار بنا دے اور زندگی کے لئے تسکین وراحت کا سامان پیدا کر دے۔ یہ رحمت کی کرشمہ سازیاں ہیں جنہوں نے رنج میں راحت، الم میں لذت اور سختیوں میں دل پذیری کی کیفیت پیدا کر دی ہے!

اشیاء و مناظر کا اختلاف وتنوع اور تسکین حیات

چنانچہ قرآن نے تسکین حیات کے مختلف پہلوؤں پر جابجا توجہ دلائی ہے۔ ازاں جملہ کائنات خلقت کے مناظر واشیاء کا اختلاف وتنوع ہے۔ انسانی طبیعت کا خاصہ ہے کہ یکسانی سے اکتاتی ہے اور تبدیلی وتنوع میں خوش گواری و کیفیت محسوس کرتی ہے۔ پس اگر کائنات ہستی میں محض یکسانی و یک رنگی ہی ہوتی تو یہ دلچسپی اور خوش گواری پیدا نہ ہوسکتی جو اس کے ہر گوشے میں ہمیں نظر آرہی ہے۔ اوقات کا اختلاف، موسموں کا اختلاف، خشکی وتری کا اختلاف، مناظر طبیعت اور اشیاء خلقت کا اختلاف جہاں بے شمار مصلحتیں اور فوائد رکھتا ہے، وہاں ایک بڑی مصلحت دنیا کی زیب وزینت اور معیشت کی تسکین وراحت بھی ہے۔

گلہائے رنگ رنگ سے ہے زینت چمن
اے ذوق اس جہاں میں ہے زیب اختلاف سے

اختلاف لیل ونہار

چنانچہ اسی سلسلہ میں وہ رات اور دن کے اختلاف کا ذکر کرتا ہے اور کہتا ہے اگر غور کرو تو اس اختلاف میں حکمت الٰہی کی کتنی ہی نشانیاں پوشیدہ ہیں۔ یہ بات کہ شب وروز کی آمد وشد کی دو مختلف حالتیں ٹھہرا دی گئی ہیں اور وقت کی نوعیت ہر معین مقدار کے بعد بدلتی رہتی ہے۔ زندگی کے لئے بڑی ہی تسکین ودل بستگی کا ذریعہ ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا اور وقت ہمیشہ ایک ہی حالت پر برقرار رہتا تو دنیا میں زندہ رہنا دشوار ہو جاتا۔ اگر تم قطبین کے اطراف

میں جاؤ جہاں روز و شب کا اختلاف اپنی نمود نہیں رکھتا تو تمہیں معلوم ہو جائے کہ یہ اختلاف گزرانِ حیات کے لئے کیسی عظیم الشان نعمت ہے۔

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ۝ (۳:۱۹۰)

بلاشبہ آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں اور رات اور دن کے ایک کے بعد ایک آتے رہنے میں اربابِ دانش کے لئے (حکمتِ الٰہی) کی بڑی ہی نشانیاں ہیں!

رات اور دن کے اختلاف نے معیشت کو دو مختلف حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ دن کی روشنی جد و جہد کی سرگرمی پیدا کرتی ہے۔ رات کی تاریکی راحت و سکون کا بستر بچھا دیتی ہے۔ ہر دن کی محنت کے بعد رات کا سکون ہوتا ہے اور ہر رات کے سکون کے بعد نئے دن کی نئی سرگرمی!

وَمِنْ رَّحْمَتِهٖ جَعَلَ لَكُمُ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ لِتَسْكُنُوْا فِیْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝ (۲۸:۷۳)

اور (دیکھو!) یہ اس کی رحمت کی کارسازی ہے کہ تمہارے لئے رات اور دن (الگ الگ) ٹھہرا دیئے گئے تاکہ رات کے وقت راحت پاؤ اور دن میں اس کا فضل تلاش کرو۔ (یعنی کاروبار معیشت میں سرگرم ہو) [اور تاکہ تم (اس کا) شکر کرو۔] [۳۱]

دن کی مختلف حالتیں اور رات کی مختلف منزلیں

پھر رات اور دن کا اختلاف صرف رات اور دن ہی کا اختلاف نہیں ہے، بلکہ ہر دن مختلف حالتوں سے گزرتا اور ہر رات مختلف منزلیں طے کرتی ہے اور ہر حالت ایک خاص طرح کی تاثیر رکھتی ہے اور ہر منزل کے لئے ایک خاص طرح کا منظر ہوتا ہے۔ صبح طلوع ہوتی ہے اور اس کی ایک خاص تاثیر ہوتی ہے، دن ڈھلتا ہے اور اس کا ایک خاص منظر ہوتا ہے۔ اوقات کا یہ روزانہ اختلاف ہمارے احساسات کا ذائقہ بدلتا رہتا ہے اور یکسانیت کی افسردگی کی جگہ تبدل و تجدد کی لذت اور سرگرمی پیدا ہوتی رہتی ہے

فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَحِيْنَ تُصْبِحُوْنَ ۝ وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَعَشِيًّا وَّحِيْنَ تُظْهِرُوْنَ ۝ (۳۰:۱۷۔۱۸)

پس پاکی ہے اللہ کے لئے اور آسمانوں اور زمین میں اس کے لئے ستائش ہے جب کہ تم پر شام آتی ہے، جب تم پر صبح ہوتی ہے، جب دن کا آخری وقت ہوتا ہے اور جب تم پر دوپہر آتی ہے!

حیوانات کا اختلاف

اسی طرح انسان خود اپنے وجود کو دیکھے اور تمام حیوانات کو دیکھے، فطرت نے کس طرح طرح طرح کے اختلافات سے اس میں تنوع اور دل پذیری پیدا کر دی ہے!

وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَآبِّ وَالْاَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ ۝ (۳۵:۲۸)

اور انسان، جانور، چارپائے طرح طرح کی رنگتوں کے!

نباتات

عالم نباتات کو دیکھو! درختوں کے مختلف ڈیل ڈول ہیں، مختلف رنگتیں ہیں، مختلف خوشبوئیں ہیں، مختلف خواص ہیں اور پھر دانہ اور پھل کھاؤ تو مختلف قسم کے ذائقے ہیں۔

اَوَلَمْ يَرَوْا اِلَى الْاَرْضِ كَمْ اَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيْمٍ ۝ (۲۶:۷)

کیا ان لوگوں نے کبھی زمین پر نظر نہیں ڈالی اور غور نہیں کیا کہ ہم نے نباتات کی ہر دو دو بہتر قسموں میں سے کتنے (بے شمار) درخت پیدا کر دیئے ہیں؟

وَمَا ذَرَاَ لَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ. اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ. (۱۶:۱۳)

اور (دیکھو!) اللہ نے جو پیداوار مختلف رنگتوں کی تمہارے لئے زمین میں پھیلا دی ہے، سو اس میں بھی عبرت پذیر طبیعتوں کے لئے (حکمت الٰہی کی) بڑی ہی نشانی ہے!

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَ جَنّٰتٍ مَّعْرُوْشٰتٍ وَّغَيْرَ مَعْرُوْشٰتٍ وَّالنَّخْلَ

وَالزَّرْعَ مُخْتَلِفًا اُكُلُهٗ. (۶:۱۴۱)

اور وہ (حکیم وقدیر) جس نے (طرح طرح کے) باغ پیدا کر دیے، ٹٹیوں پر چڑھائے ہوئے اور بغیر چڑھائے ہوئے، اور کھجور کے درخت اور (طرح طرح کی) کھیتیاں جن کے دانے اور پھل کھانے میں مختلف ذائقہ رکھتے ہیں۔

جمادات

حیوانات اور نباتات ہی پر موقوف نہیں، جمادات میں بھی یہی قانون فطرت کام کر رہا ہے۔

وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ بِيْضٌ وَّحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا وَ غَرَابِيْبُ سُوْدٌ ○ (۳۵:۲۷)

اور پہاڑوں کو دیکھو! گونا گوں رنگوں کے ہیں، کچھ سفید، کچھ سرخ، کچھ کالے کلوٹے!

ہر چیز کے دودو ہونے کا قانون

اسی قانون اختلاف کا ایک گوشہ وہ بھی ہے جسے قرآن نے ''تزویج'' سے تعبیر کیا ہے اور ہم اسے قانون تثنیہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ یعنی ہر چیز کے دو دو ہونے یا متقابل ومتماثل ہونے کا قانون۔ کائنات خلقت کا کوئی گوشہ بھی دیکھو! تمہیں کوئی چیز یہاں اکہری اور طاق نظر نہیں آئے گی۔ ہر چیز میں جفت اور دو دو ہونے کی حقیقت کام کر رہی ہے، یا یوں کہا جائے کہ ہر چیز اپنا کوئی نہ کوئی مثنیٰ بھی ضرور رکھتی ہے۔ رات کے لئے دن ہے، صبح کے لئے شام ہے، نر کے لئے مادہ ہے، مرد کے لئے عورت ہے، زندگی کے لئے موت ہے[۳۲]

وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ○ (۵۱:۴۹)

اور ہر چیز میں جوڑے پیدا کر دیے (یعنی دو دو اور متقابل اشیاء پیدا کیں) تاکہ تم نصیحت حاصل کرو[۳۳]

سُبْحٰنَ الَّذِيْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنْبِتُ الْاَرْضُ وَمِنْ اَنْفُسِهِمْ وَمِمَّا لَا يَعْلَمُوْنَ ○ (۳۶:۳۶)

پاکی اور بزرگی ہے اس ذات کے لیے جس نے زمین کی پیداوار میں اور انسان میں

اوران تمام مخلوقات میں جن کا انسان کو علم نہیں، دو دو اور متقابل چیزیں پیدا کیں!

مرداور عورت

یہی قانون فطرت ہے جس نے انسان کو دو مختلف جنسوں یعنی مرد اور عورت میں تقسیم کر دیا اور پھر ان میں فعل وانفعال اور جذب وانجذاب کے کچھ ایسے وجدانی احساسات ودیعت کر دیئے کہ ہر جنس دوسری جنس سے ملنے کی قدرتی طلب رکھتی ہے اور دونوں کے ملنے سے ازدواجی زندگی کی ایک کامل معیشت پیدا ہو جاتی ہے۔

فَاطِرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّمِنَ الْاَنْعَامِ اَزْوَاجًا. (۱۱:۴۲)

وہ آسمانوں اور زمین کا بنانے والا! اس نے تمہارے لئے تمہاری ہی جنس میں سے جوڑے بنا دیئے (یعنی مرد کے لئے عورت اور عورت کے لئے مرد) اسی طرح چارپایوں میں بھی جوڑے پیدا کر دیئے۔

قرآن کہتا ہے: یہ اس لئے ہے تاکہ محبت اور سکون ہو اور دو ہستیوں کی باہمی رفاقت اور اشتراک سے زندگی کی محنتیں اور مشقتیں سہل اور گوارا ہو جائیں۔

وَمِنْ اٰیٰتِهٖۤ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْۤا اِلَیْهَا وَجَعَلَ بَیْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً. اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ○ (۲۱:۳۰)

اور (دیکھو!) اس کی (رحمت کی) نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ ہے کہ اس نے تمہارے لئے تم ہی میں سے جوڑے پیدا کر دیے (یعنی مرد کے لئے عورت اور عورت کے لئے مرد) تاکہ اس کی وجہ سے تمہیں سکون حاصل ہو۔ اور (پھر اس کی یہ کارفرمائی دیکھو کہ) تمہارے درمیان (یعنی مرد اور عورت کے درمیان) محبت اور رحمت کا جذبہ پیدا کر دیا۔ بلاشبہ ان لوگوں کے لئے جو غور وفکر کرنے والے ہیں، اس میں (حکمت الٰہی کی) بڑی ہی نشانیاں ہیں۔

نسب اور صہر

پھر اسی ازدواجی زندگی سے توالد و تناسل کا ایک ایسا سلسلہ قائم ہو گیا ہے کہ ہر وجود پیدا ہوتا ہے اور ہر وجود پیدا کرتا ہے۔ ایک طرف وہ نسب کا رشتہ رکھتا ہے جو اسے پچھلوں سے جوڑتا ہے، دوسری طرف صہر یعنی دامادی کا رشتہ رکھتا ہے جو اسے آگے آنے والوں سے مربوط کر دیتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہر وجود کی فردیت ایک وسیع دائرے کی کثرت میں پھیل گئی ہے اور رشتوں قرابتوں کا ایسا وسیع حلقہ پیدا ہو گیا ہے جس کی ہر کڑی دوسری کڑی کے ساتھ مربوط ہے۔

وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ مِنَ الْمَاءِ بَشَرًا فَجَعَلَهُ نَسَبًا وَصِهْرًا. (۲۵:۵۴)

اور وہی (حکیم و قدیر) ہے جس نے پانی سے (یعنی نطفہ سے) انسان کو پیدا کیا۔ پھر (اسی رشتہ پیدائش کے ذریعہ) اسے نسب اور صہر کا رشتہ رکھنے والا بنا دیا!

صلہ رحمی اور خاندانی حلقہ کی تشکیل

اور پھر دیکھو! اس نسب اور صہر کے رشتے سے کس طرح خاندان اور قبیلے کا نظام قائم ہو گیا ہے اور کس عجیب و غریب طریقے سے صلہ رحمی یعنی قرابت داری کی گیرائیاں ایک وجود کو دوسرے وجود سے جوڑتیں اور معاشرتی زندگی کی باہمی الفتوں اور معاونتوں کے لئے محرک ہوتی ہیں۔ دراصل انسان کی اجتماعی زندگی کا سارا کارخانہ اسی صلہ رحمی کے سررشتہ نے قائم کر رکھا ہے۔

يَاأَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَ خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي تَسَاءَلُونَ بِهِ وَالْأَرْحَامَ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيبًا (۴:۱)

اے افراد نسل انسانی! اپنے پروردگار کی نافرمانی سے بچو (اور اس کے ٹھہرائے ہوئے رشتوں سے بے پروا نہ ہو جاؤ) وہ پروردگار جس نے تمہیں ایک فرد واحد سے پیدا کیا (یعنی باپ سے پیدا کیا) اور اسی سے اس کا جوڑا[۳۴] بھی پیدا کر دیا (یعنی جس طرح مرد کی نسل سے لڑکا پیدا ہوا لڑکی بھی پیدا ہوئی پھر ان کی[۳۵] نسل سے ایک بڑی تعداد مرد اور عورت کی پیدا ہو کر پھیل گئی، (اس طرح فرد واحد کے رشتے نے

ایک بڑے خاندان اور قبیلے کی صورت پیدا کرلی) پس اللہ کی نافرمانی سے بچو جس کے نام پر باہم دگر (مہر و شفقت کا) سوال کرتے ہو، اور صلہ رحمی کے توڑنے سے بھی بچو (جس کے نام پر باہم دگر ایک دوسرے سے چشم داشت اعانت رکھتے ہو) بلاشبہ اللہ تمہارا نگراں حال ہے

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ بَنِيْنَ وَحَفَدَةً ۝ (۱۶:۷۲)

اور (دیکھو!) یہ اللہ ہے جس نے تمہاری ہی جنس سے تمہارے لئے جوڑا بنا دیا (یعنی مرد کے لئے عورت اور عورت کے لئے مرد) پھر تمہارے باہمی ازدواج سے بیٹوں اور پوتوں کا سلسلہ قائم کر دیا۔

ایام حیات کا تغیر و تنوع

اسی طرح ایام حیات کے تغیر و تنوع میں بھی تسکین حیات کی ایک بہت بڑی مصلحت پوشیدہ ہے۔ ہر زندگی طفولیت، شباب، جوانی، کہولت اور بڑھاپے کی مختلف منزلوں سے گزرتی ہے اور ہر منزل اپنے نئے نئے احساسات اور نئی نئی مشغولیتیں اور نئی نئی کاوشیں رکھتی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہماری زندگی عالم ہستی کی ایک دل چسپ مسافرت بن گئی۔ ایک منزل کی کیفیتوں سے ابھی جی سیر نہیں ہو چکتا کہ دوسری منزل نمودار ہو جاتی ہے اور اس طرح عرصۂ حیات کی طوالت محسوس ہی نہیں ہوتی۔

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ يُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ ثُمَّ لِتَكُوْنُوْا شُيُوْخًا. وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى مِنْ قَبْلُ وَلِتَبْلُغُوْٓا اَجَلًا مُّسَمًّى وَّلَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝ (۴۰:۶۷)

وہ (پروردگار) جس نے تمہارا وجود مٹی سے پیدا کیا، پھر نطفہ سے، پھر علقہ سے (یعنی جونک کی شکل کی ایک چیز سے) پھر ایسا ہوتا ہے کہ تم طفولیت کی حالت میں ماں کے شکم سے نکلتے ہو۔ پھر بڑے ہوتے ہو اور سن تمیز تک پہنچتے ہو۔ اس کے بعد

تمہارا جینا اس لئے ہوتا ہے تا کہ بڑھاپے کی منزل تک پہنچو۔ پھر تم میں سے کوئی تو ان منزلوں سے پہلے ہی مرجاتا ہے (اور کوئی چھوڑ دیا جاتا ہے) تا کہ اپنے مقررہ وقت تک زندگی بسر کر لے اور تا کہ تم سمجھو![۳۶]

زینت وتفاخر، مال ومتاع، آل واولاد

اسی طرح طرح طرح کی خواہشیں اور جذبے زینت وتفاخر کے ولولے، مال ومتاع کی محبت، آل اولاد کی دل بستگیاں زندگی کی دلچسپی اور انہاک کے لئے پیدا کر دی گئی ہیں۔

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَ الْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ؕ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ۝ (۳:۱۴)

انسان کے لئے مرد وعورت کے تعلق میں، اولاد میں، چاندی سونے کے اندوختوں میں، چنے ہوئے گھوڑوں میں، مویشیوں میں اور کھیتی باڑی میں دل بستگی پیدا کر دی گئی ہے اور یہ جو کچھ بھی ہے دنیوی زندگی کی پونجی ہے، بہتر ٹھکانا تو اللہ ہی کے پاس ہے۔

اختلاف معیشت اور تزاحم حیات

اسی طرح معیشت کا اختلاف اور اس کی وجہ سے مختلف درجوں اور حالتوں کا پیدا ہو جانا بھی انہاک حیات کا ایک بہت بڑا محرک ہے، کیونکہ اس کی وجہ سے زندگی میں مزاحمت اور مسابقت کی حالت پیدا ہو گئی ہے اور اس میں لگے رہنے سے زندگی کی مشقتوں کا جھیلنا آسان ہو گیا ہے، بلکہ یہی مشقتیں سرتاسر راحت وسرور کا سامان بن گئی ہیں۔

وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ ؕ اِنَّ رَبَّكَ سَرِيْعُ الْعِقَابِ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ (۶:۱۶۶)

اور یہ اسی (حکیم وقدیر) کی کارفرمائی ہے اس نے تمہیں زمین میں (پچھلوں) کا

جانشین بنایا اور تم میں سے بعض کو بعض پر درجوں میں فوقیت دے دی، تاکہ جو کچھ تمہیں دیا گیا ہے اس میں تمہارے عمل کی آزمائش کرے۔ بلاشبہ تمہارا پروردگار (پاداش عمل کی) سزا دینے میں تیز ہے (یعنی اس کا قانون مکافات نتائج عمل میں سست رفتار نہیں) لیکن ساتھ ہی بخش دینے والا، رحمت رکھنے والا بھی ہے!

برہان فضل ورحمت

چنانچہ یہی وجہ ہے کہ جس طرح قرآن نے ربوبیت کے اعمال ومظاہر سے استدلال کیا ہے، اسی طرح وہ رحمت کے آثار وحقائق سے بھی جابجا استدلال کرتا ہے۔ اور برہان ربوبیت کی طرح برہان فضل ورحمت بھی اس کی دعوت وارشاد کا ایک عام اسلوب خطاب ہے۔ وہ کہتا ہے: کائنات خلقت کی ہر شے میں ایک مقررہ نظام کے ساتھ رحمت وفضل کے مظاہر کا موجود ہونا قدرتی طور پر انسان کو یقین دلا دیتا ہے کہ ایک رحمت رکھنے والی ہستی کی کارفرمائیاں یہاں کام کر رہی ہیں، کیونکہ ممکن نہیں فضل ورحمت کی یہ پوری کائنات موجود ہو اور فضل ورحمت کا کوئی زندہ ارادہ موجود نہ ہو۔ چنانچہ وہ تمام مقامات جن میں کائنات خلقت کے افادہ وفیضان، زینت وجمال، موزونیت واعتدال، تسویہ وقوام اور تکمیل واتقان کا ذکر کیا گیا ہے، دراصل اسی استدلال پر مبنی ہیں۔

وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ○ اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِيْ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ وَّ تَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ○ (۲: ۱۶۳-۱۶۴)

اور (دیکھو!) تمہارا معبود وہی ایک معبود ہے۔ کوئی معبود نہیں مگر اسی کی ایک ذات، رحمت کی بخشایشوں سے ہمیشہ فیض یاب کرنے والی! بلاشبہ آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے میں اور رات دن کے ایک کے بعد ایک آتے رہنے میں اور

کشتی میں جو انسان کی کاربرآریوں کے لیے سمندر میں چلتی ہے، اور بارش میں جسے اللہ آسمان سے برساتا ہے اور اس (کی آب پاشی) سے زمین مرنے کے بعد پھر جی اٹھتی ہے اور اس بات میں کہ ہر قسم کے جانور زمین میں پھیلا دیئے ہیں نیز ہواؤں کے (مختلف جانب) پھیرنے میں اور بادلوں میں جو آسمان اور زمین کے درمیان (اپنی مقررہ جگہ کے اندر) بندھے رکے ہیں، عقل رکھنے والوں کے لئے (اللہ کی ہستی اور اس کے قوانین فضل ورحمت کی) بڑی ہی نشانیاں ہیں!

اسی طرح ان مقامات کا مطالعہ کرو جہاں خصوصیت کے ساتھ جمال فطرت سے استدلال کیا ہے۔

اَفَلَمْ يَنْظُرُوْٓا اِلَى السَّمَآءِ فَوْقَهُمْ كَيْفَ بَنَيْنٰهَا وَ زَيَّنّٰهَا وَمَا لَهَا مِنْ فُرُوْجٍ ○ وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَاَلْقَيْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ وَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍۢ بَهِيْجٍ ○ تَبْصِرَةً وَّ ذِكْرٰى لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيْبٍ ○ (۵۰: ۶-۸)

کیا کبھی ان لوگوں نے آسمان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا نہیں کہ کس طرح ہم نے اسے بنایا ہے اور کس طرح اس کے منظر میں خوش نمائی پیدا کر دی ہے اور پھر یہ کہ کہیں بھی اس میں شگاف نہیں۔ اور اسی طرح زمین کو دیکھو! کس طرح ہم نے اسے فرش کی طرح پھیلا دیا اور پہاڑوں کے لنگر ڈال دیئے اور پھر کس طرح قسم قسم کی خوب صورت نباتات اگا دیں! ہر اس بندے کے لئے جو حق کی طرف رجوع کرنے والا ہے اس میں غور کرنے کی بات اور نصیحت کی روشنی ہے۔

وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّ زَيَّنّٰهَا لِلنّٰظِرِيْنَ ○ (۱۵: ۱۶)

اور (دیکھو!) ہم نے آسمان میں (ستاروں کی گردش کے لئے) برج بنائے اور دیکھنے والوں کے لئے ان میں خوش نمائی پیدا کر دی۔

وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ ○ (۶۷: ۵)

اور (دیکھو!) ہم نے دنیا کے آسمان (یعنی کرہ ارض کی فضا) کو ستاروں کی قندیلوں

سے خوش منظر بنا دیا!

وَلَكُمْ فِيهَا جَمَالٌ حِينَ تُرِيحُونَ وَحِينَ تَسْرَحُونَ۝ (۶:۱۶)

اور (دیکھو!) تمہارے لئے چار پایوں کے منظر میں جب شام کے وقت چراگاہ سے واپس لاتے ہو اور جب صبح لے جاتے ہو، ایک طرح کا حسن اور نظر افروزی ہے۔

موزونیت و تناسب

جس چیز کو ہم "جمال" کہتے ہیں اس کی حقیقت کیا ہے؟ موزونیت اور تناسب۔ یہی موزونیت اور تناسب ہے جو بناؤ اور خوبی کے تمام مظاہر کی اصل ہے۔

وَاَنْبَتْنَا فِيهَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْزُونٍ۝ (۱۹:۱۵)

اور (دیکھو!) ہم نے زمین میں ہر ایک چیز موزونیت اور تناسب رکھنے والی اگائی!

تسویہ

اس معنی میں قرآن "تسویہ" کا لفظ بھی استعمال کرتا ہے "تسویہ" کے معنی یہ ہیں کہ کسی چیز کو اس طرح ٹھیک ٹھیک درست کر دینا کہ اس کی ہر بات خوبی و مناسبت کے ساتھ ہو۔

الَّذِي خَلَقَ فَسَوّٰى۝ وَالَّذِي قَدَّرَ فَهَدٰى۝ (۸۷:۲۔۳)

وہ پروردگار جس نے ہر چیز پیدا کی، پھر ٹھیک ٹھیک خوبی و مناسبت کے ساتھ درست کر دی اور وہ جس نے ہر وجود کے لئے ایک اندازہ ٹھہرا دیا، پھر اس پر (زندگی و معیشت) کی راہ کھول دی!

الَّذِي خَلَقَكَ فَسَوّٰكَ فَعَدَلَكَ فِي اَيِّ صُورَةٍ مَّا شَاءَ رَكَّبَكَ۝ (۸۲:۷۔۸)

وہ پروردگار جس نے تمہیں پیدا کیا۔ پھر ٹھیک ٹھیک درست کر دیا، پھر (تمہارے ظاہری و باطنی قویٰ میں) اعتدال و تناسب ملحوظ رکھا، پھر جیسی صورت بنانی چاہی اسی کے مطابق ترکیب دے دی۔

اتقان

یہی حقیقت ہے جسے قرآن نے ''اتقان'' سے بھی تعبیر کیا ہے، یعنی کائنات ہستی کی ہر چیز کا درستگی و استواری کے ساتھ ہونا کہ کہیں بھی اس میں خلل، نقصان بے ڈھنگا پن، اونچ نیچ، ناہمواری نظر نہیں آسکتی۔

صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِیْٓ اَتْقَنَ كُلَّ شَیْءٍ ۝ (۸۸:۲۷)

یہ اللہ کی کاریگری ہے جس نے ہر چیز درستگی و استواری کے ساتھ بنائی۔

مَا تَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ؕ فَارْجِعِ الْبَصَرَ ۙ هَلْ تَرٰی مِنْ فُطُوْرٍ ۝ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَیْنِ یَنْقَلِبْ اِلَیْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّ هُوَ حَسِیْرٌ ۝ (۶۷:۳-۴)

تم الرحمٰن کی بناوٹ میں (کیونکہ یہ اس کی رحمت ہی کا ظہور ہے) کبھی کوئی اونچ نیچ نہیں پاؤ گے۔ (اچھا نظر اٹھاؤ اور اس نمائش گاہ صنعت کا مطالعہ کرو!) ایک بار نہیں بار بار دیکھو! کیا تمہیں کوئی دراڑ دکھائی دیتی ہے؟ تم اسی طرح یکے بعد دیگرے دیکھتے رہو! تمہاری نگاہ اٹھے گی اور عاجز و درماندہ ہو کر واپس آجائے گی لیکن کوئی نقص نہ نکال سکے گی۔

''فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ'' فرمایا، یعنی یہ خوبی و اتقان اس لئے ہے کہ رحمت رکھنے والے کی کاریگری ہے رحمت کا مقتضی یہی تھا کہ حسن و خوبی ہو اتقان و کمال ہو، نقص و ناہمواری نہ ہو۔

رحمت سے معاد پر استدلال

خدا کی ہستی اور اس کی توحید و صفات کی طرح آخرت کی زندگی پر بھی وہ رحمت سے استدلال کرتا ہے۔ اگر رحمت کا مقتضی یہ ہوا کہ دنیا میں اس خوبی و کمال کے ساتھ زندگی کا ظہور ہو تو کیونکر یہ بات باور کی جاسکتی ہے کہ دنیا کی چند روزہ زندگی کے بعد اس کا فیضان ختم ہو جائے اور خزانہ رحمت میں انسان کی زندگی اور بناؤ کے لئے کچھ باقی نہ رہے؟

اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ قَادِرٌ عَلٰٓی اَنْ

يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ وَجَعَلَ لَهُمْ اَجَلًا لَّا رَيْبَ فِيْهِ ط فَاَبَى الظّٰلِمُوْنَ اِلَّا كُفُوْرًا ○ قُلْ لَّوْ اَنْتُمْ تَمْلِكُوْنَ خَزَآئِنَ رَحْمَةِ رَبِّيْٓ اِذًا لَّاَمْسَكْتُمْ خَشْيَةَ الْاِنْفَاقِ ط (۱۷:۹۹۔۱۰۰)

کیا ان لوگوں نے کبھی اس بات پر غور نہیں کیا کہ اللہ جس نے آسمان وزمین پیدا کئے ہیں، یقیناً اس بات سے عاجز نہیں ہوسکتا کہ ان جیسے (آدمی دوبارہ) پیدا کر دے۔ اور یہ کہ ان کے لئے اس نے ایک مقررہ وقت ٹھہرادیا ہے جس میں کسی طرح کا شک وشبہ نہیں؟ (افسوس ان کی شقاوت پر!) اس پر بھی ان ظالموں نے اپنے لئے کوئی راہ پسند نہ کی مگر حقیقت سے انکار کرنے کی! (اے پیغمبر! ان سے) کہہ دو: اگر میرے پروردگار کی رحمت کے خزانے تمہارے قبضے میں ہوتے تو اس حالت میں یقیناً تم خرچ ہوجانے کے ڈر سے ہاتھ روکے رکھتے۔ (لیکن یہ اللہ ہے جس کے خزائن رحمت نہ تو کبھی ختم ہوسکتے ہیں نہ اس کی بخشائش رحمت کی کوئی انتہا ہے)

رحمت سے وحی وتنزیل کی ضرورت پر استدلال

اسی طرح وہ رحمت سے وحی وتنزیل کی ضرورت پر بھی استدلال کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے جو رحمت کارخانہ ہستی کے ہر گوشے میں افادہ وفیضان کا سرچشمہ ہے، کیونکر ممکن تھا کہ انسان کی معنوی ہدایت کے لئے اس کے پاس کوئی فیضان نہ ہوتا۔ اور وہ انسان کو نقصان و ہلاکت کے لئے چھوڑ دیتی؟ اگر تم دس گوشوں میں فیضان رحمت محسوس کر رہے ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ گیارھویں گوشے میں اس سے انکار کردو۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے جابجا نزول وحی، ترسیل کتب اور بعثت انبیاء کو رحمت سے تعبیر کیا ہے۔

وَلَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ بِهٖ عَلَيْنَا وَكِيْلًا ○ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ اِنَّ فَضْلَهٗ كَانَ عَلَيْكَ كَبِيْرًا ○

(۱۷:۸۶۔۸۷)

اور (اے پیغمبر) اگر ہم چاہیں تو جو کچھ تم پر وحی کے ذریعے بھیجا گیا ہے اسے اٹھا لے

جائیں (یعنی سلسلہ تنزیل ووحی باقی نہ رہے) اور تمہیں کوئی بھی ایسا کارساز نہ ملے جو ہم پر زور ڈال سکے، لیکن جو سلسلہ وحی جاری ہے تو یہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ تمہارے پروردگار کی رحمت ہے اور یقین کرو! تم پر اس کا بڑا ہی فضل ہے۔

تَنْزِيْلَ الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اُنْذِرَ اٰبَآءُ هُمْ فَهُمْ غٰفِلُوْنَ○ (٣٦:٥۔٦)

(یہ قرآن) عزیز ورحیم کی طرف سے نازل کیا گیا ہے، تاکہ ان لوگوں کو جن کے آباؤ اجداد (کسی پیغمبر کی زبانی) متنبہ نہیں کیئے گئے ہیں اور اس لئے غفلت میں پڑے ہوئے ہیں، تم متنبہ کرو۔

تورات وانجیل اور قرآن کی نسبت جابجا تصریح کی کہ ان کا نزول ''رحمت'' ہے:

وَمِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰٓى اِمَامًا وَّ رَحْمَةً ط (١١۔١٧)

اور اس سے پہلے (یعنی قرآن سے پہلے) موسیٰ کی کتاب (امت کے لئے) پیشوا اور رحمت!

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِى الصُّدُوْرِ○ وَهُدًى وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ○ قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ○ (١٠:٥٧۔٥٨)

اے افرادِ نسل انسانی! یقیناً یہ تمہارے پروردگار کی طرف سے موعظت ہے جو تمہارے لئے آگئی ہے، اور ان تمام بیماریوں کے لئے جو انسان کے دل کی بیماریاں ہیں، نسخہ شفا ہے اور رہنمائی اور رحمت ہے ایمان رکھنے والوں کے لئے۔ (اے پیغمبر! ان لوگوں سے) کہہ دو (کہ یہ جو کچھ ہے) اللہ کے فضل اور رحمت سے ہے، پس چاہیے کہ (اپنی فیض یابی پر) خوش ہو۔ یہ (اپنی برکتوں میں) ان تمام چیزوں سے بہتر ہے جنہیں تم (زندگی کی کامرانیوں کے لئے) فراہم کرتے ہو۔

هٰذَا بَصَآئِرُ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَّ رَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ○ (٢٠:٤٥)

یہ (قرآن) لوگوں کے لئے واضح دلیلوں کی روشنی ہے اور ہدایت و رحمت ہے یقین رکھنے والوں کے لئے۔

اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّ ذِكْرٰى لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ○ (۵۱:۲۹)

کیا ان لوگوں کے لئے یہ نشانی کافی نہیں کہ ہم نے تم پر کتاب نازل کی ہے جو انہیں (برابر) سنائی جارہی ہے؟ جو لوگ یقین رکھنے والے ہیں، بلاشبہ ان کے لئے اس (نشانی) میں سرتاسر رحمت اور فہم و بصیرت ہے۔

چنانچہ اسی بناء پر اس نے داعی اسلام کے ظہور کو بھی فیضان رحمت سے تعبیر کیا ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ○ (۲۱:۱۰۷)

(اے پیغمبر!) ہم نے تمہیں نہیں بھیجا ہے مگر اس لئے کہ تمام جہان کے لئے ہماری رحمت کا ظہور ہے!

انسانی اعمال کے معنوی قوانین پر "رحمت" سے استدلال اور بقاء انفع

اسی طرح وہ "رحمت" کے مادی مظاہر سے انسانی اعمال کے معنوی قوانین پر بھی استدلال کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے جس "رحمت" کا مقتضی یہ ہوا کہ دنیا میں "بقاء انفع" کا قانون نافذ ہے، یعنی وہی چیز باقی رہتی ہے جو نافع ہوتی ہے، کیونکر ممکن تھا کہ وہ انسانی اعمال کی طرف سے غافل ہو جاتی اور نافع اور غیر نافع اعمال میں امتیاز نہ کرتی؟ پس مادیات کی طرح معنویات میں بھی یہ قانون نافذ ہے اور ٹھیک اسی طرح اپنے احکام و نتائج رکھتا ہے جس طرح مادیات میں تم دیکھ رہے ہو۔

حق اور باطل

اس سلسلہ میں وہ دو لفظ استعمال کرتا ہے "حق" اور "باطل" سورہ رعد میں جہاں قانون "بقاء انفع" کا ذکر کیا ہے وہاں یہ بھی کہہ دیا ہے کہ اس بیان سے مقصود "حق" اور "باطل" کی حقیقت واضح کرنی ہے۔

كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ ۝ (۱۳:۱۷)

اسی طرح اللہ ''حق'' اور ''باطل'' کی ایک مثال بیان کرتا ہے۔

ساتھ ہی مزید تصریح کردی

فَأَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً ۚ وَأَمَّا مَا يَنفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ ۚ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْأَمْثَالَ ۝ لِلَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِرَبِّهِمُ الْحُسْنَىٰ ۚ وَالَّذِينَ لَمْ يَسْتَجِيبُوا لَهُ لَوْ أَنَّ لَهُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا وَمِثْلَهُ مَعَهُ لَافْتَدَوْا بِهِ ۚ أُولٰئِكَ لَهُمْ سُوءُ الْحِسَابِ ۝ (۱۳:۱۷۔۱۸)

پس (دیکھو!) میل کچیل سے جو جھاگ اٹھتا ہے وہ رائیگاں جاتا ہے، کیونکہ اس میں انسان کے لئے نفع نہ تھا، لیکن جس چیز میں انسان کے لئے نفع ہے وہ زمین میں باقی رہ جاتی ہے۔ اسی طرح اللہ (اپنے قوانین عمل کی) مثالیں دیتا ہے۔ جن لوگوں نے اپنے پروردگار کا حکم قبول کیا، ان کے لئے خوبی و بہتری ہے اور جن لوگوں نے قبول نہ کیا، ان کے لئے (اپنے اعمال بد کا) سختی کے ساتھ حساب دینا ہے اور اگر ان لوگوں کے قبضے میں وہ سب کچھ ہو جو زمین میں ہے اور اتنا ہی اس پر اور بڑھا دیں اور بدلے میں دے کے (نتائج عمل سے) بچنا چاہیں (جب بھی نہ بچ سکیں گے)

عربی میں ''حق'' کا خاصہ ثبوت اور قیام ہے، یعنی جو بات ثابت ہو، اٹل ہو، انمٹ ہو، اسے حق کہیں گے۔ ''باطل'' ٹھیک اس کی نقیض ہے۔ ایسی چیز جس میں ثبات و قیام نہ ہو، ٹل جانے والی، مٹ جانے والی، باقی نہ رہنے والی۔ چنانچہ خود قرآن میں جا بجا ہے۔

لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ (۸:۸)

قانون ''قضاء بالحق''

وہ کہتا ہے جس طرح تم مادیات میں دیکھتے ہو کہ فطرت چھانٹتی رہتی ہے، جو چیز نافع ہوتی ہے باقی رکھتی ہے، جو نافع نہیں ہوتی اسے محو کر دیتی ہے، ٹھیک ایسا ہی عمل معنویات میں بھی جاری ہے۔ جو عمل حق ہوگا قائم اور ثابت رہے گا، جو باطل ہوگا مٹ جائے گا اور جب

کبھی حق اور باطل متقابل ہوں گے تو بقاء حق کے لئے ہوگی نہ کہ باطل کے لئے۔ وہ اسے ''قضاء بالحق'' سے تعبیر کرتا ہے، یعنی فطرت کا فیصلہ حق جو باطل کے لئے نہیں ہو سکتا۔

فَإِذَا جَاءَ أَمْرُ اللَّهِ قُضِيَ بِالْحَقِّ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْمُبْطِلُونَ (۴۰:۷۸)

پھر جب وہ وقت آ گیا کہ حکم الٰہی صادر ہو تو (خدا کا) فیصلہ حق نافذ ہو گیا اور اس وقت ان لوگوں کے لئے جو برسر باطل تھے تباہی ہوئی!

اس نے اس حقیقت کی تعبیر کے لئے ''حق'' اور ''باطل'' کا لفظ اختیار کر کے مجرد تعبیر ہی سے حقیقت کی نوعیت واضح کر دی، کیونکہ حق اسی چیز کو کہتے ہیں جو ثابت و قائم ہو اور باطل کے معنی ہی یہ ہیں کہ مٹ جانا، قائم و باقی نہ رہنا۔ پس جب وہ کسی بات کے لئے کہتا ہے کہ یہ ''حق'' ہے تو یہ صرف دعویٰ ہی نہیں ہوتا بلکہ دعوے کے ساتھ اس کے جانچنے کا ایک معیار بھی پیش کر دیتا ہے۔ یہ بات حق ہے، یعنی یہ ٹلنے والی، نہ مٹنے والی بات ہے۔ یہ بات باطل ہے، یعنی نہ ٹک سکنے والی، مٹ جانے والی بات ہے۔ پس جو بات اٹل ہوگی اس کا اٹل ہونا کسی نگاہ سے پوشیدہ نہیں رہ سکتا۔ جو بات مٹ جانے والی ہے اس کا مٹنا ہر آنکھ دیکھ لے گی!

اللہ کی صفت بھی ''الحق'' ہے

چنانچہ وہ اللہ کی نسبت بھی ''الحق'' کی صفت استعمال کرتا ہے، کیونکہ اس کی ہستی سے بڑھ کر اور کون سی حقیقت ہے جو ثابت اور اٹل ہو سکتی ہے؟

فَذَٰلِكُمُ اللَّهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ (۱۰:۳۲)

پس یہ ہے اللہ تمہارا پروردگار ''الحق''

فَتَعَالَى اللَّهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ (۲۰:۱۱۴)

پس کیا ہی بلند درجہ ہے اللہ کا، الملک (یعنی فرماں روا) الحق (یعنی ثابت)

وحی و تنزیل بھی ''الحق'' ہے

وحی و تنزیل کو بھی وہ ''الحق'' کہتا ہے، کیونکہ وہ دنیا کی ایک قائم و ثابت حقیقت ہے جن قوتوں نے اسے مٹانا چاہا تھا وہ مٹ گئیں۔ حتیٰ کہ آج ان کا نام و نشان بھی باقی نہیں۔ لیکن

وحی وتنزیل کی حقیقت ہمیشہ قائم رہی اور آج تک قائم ہے۔

قُلْ يَاأَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكُمْ فَمَنِ اهْتَدَىٰ فَإِنَّمَا يَهْتَدِي لِنَفْسِهِ وَمَنْ ضَلَّ فَإِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا وَمَا أَنَا عَلَيْكُمْ بِوَكِيلٍ ۝ وَاتَّبِعْ مَا يُوحَىٰ إِلَيْكَ وَاصْبِرْ حَتَّىٰ يَحْكُمَ اللَّهُ وَهُوَ خَيْرُ الْحَاكِمِينَ ۝ (۱۰:۱۰۸-۱۰۹)

(اے پیغمبر! لوگوں سے) کہہ دو کہ اے افراد نسل انسانی! بلاشبہ تمہارے پروردگار کی طرف سے وہ چیز تمہارے لئے آ گئی جو "حق" ہے پس اب جس کسی نے سیدھی راہ اختیار کی تو یہ راست روی اسی کی بھلائی کے لئے ہے، اور جس نے گمراہی اختیار کی اس کی گمراہی کا نقصان بھی اسی کے لئے ہے اور (میرا کام تو صرف راہ حق دکھا دینا ہے) میں تم پر نگہبان مقرر نہیں کیا گیا ہوں (کہ تم کو پکڑ کے زبردستی راہ پر لگا دوں) اور (اے پیغمبر!) جو کچھ تم پر وحی کی گئی ہے اس کے مطابق چلو اور صبر کرو یہاں تک کہ اللہ فیصلہ کر دے، اور وہ فیصلہ کرنے والوں میں بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔

وَبِالْحَقِّ أَنْزَلْنَاهُ وَبِالْحَقِّ نَزَلَ (۱۷:۱۰۵)

اور (اے پیغمبر!) ہماری طرف سے اس کا (یعنی قرآن کا) نازل ہونا حق ہے اور وہ حق ہی کے ساتھ نازل بھی ہوا ہے۔

قرآن کی اصطلاح میں "الحق"

اسی طرح جب وہ علامت تعریف کے ساتھ کسی بات کو "الحق" کہتا ہے تو اس سے بھی مقصود یہی حقیقت ہوتی ہے اور اسی لئے وہ اکثر حالتوں میں صرف "الحق" کہہ کر خاموش ہو جاتا ہے۔ اس سے زیادہ کچھ کہنا ضروری نہیں سمجھتا، کیونکہ اگر فطرت کائنات کا یہ قانون ہے کہ وہ حق و باطل کے نزاع میں "حق" ہی کو باقی رکھتی ہے تو کسی بات کے امر حق ہونے کے لئے صرف اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے کہ وہ "حق" ہے، یعنی باقی و قائم رہنے والی حقیقت ہے۔ اس کا بقاء و قیام خود ہی اپنی حقیقت کا اعلان کر دے گا۔ ۳۷

نزاع حق و باطل

یہ جو قرآن جا بجا حق اور باطل کے نزاع کا ذکر کرتا ہے اور پھر بطور اصل اور قاعدہ کے اس پر زور دیتا ہے کہ کامیابی حق کے لئے ہے اور ہزیمت و خسران باطل کے لئے تو یہ تمام مقامات بھی اسی قانون ''قضاء بالحق'' کی تصریحات ہیں اور اسی حقیقت کی روشنی میں ان کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ (۱۸:۲۱)

اور ہمارا قانون یہ ہے کہ حق باطل سے ٹکراتا ہے اور اسے پاش پاش کر دیتا ہے اور اچانک ایسا ہوتا ہے کہ وہ نابود ہو گیا!

وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ؕ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا (۸۱:۱۷)

اور کہہ دو حق نمودار ہو گیا اور باطل نابود ہوا اور یقیناً باطل نابود ہی ہونے والا تھا۔

اللہ کی شہادت

اور پھر حق و صداقت کے لئے یہی اللہ کی وہ شہادت ہے جو اپنے مقررہ وقت پر ظاہر ہوتی ہے اور بتا دیتی ہے کہ حق کس کے ساتھ تھا اور باطل کا کون پرستار تھا۔ یعنی ''قضاء بالحق'' کا قانون حق کو ثابت و قائم رکھ کر اور اس کے حریف کو محو و متلاشی کر کے حقیقت حال کا اعلان کر دیتا ہے۔

قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ شَهِيْدًا ۚ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْبَاطِلِ وَكَفَرُوْا بِاللّٰهِ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝ (۵۲:۲۹)

(ان لوگوں سے) کہہ دو: اب کسی اور رد و کد کی ضرورت نہیں، میرے اور تمہارے درمیان اللہ کی گواہی بس کرتی ہے۔ آسمان و زمین میں جو کچھ ہے سب اس کے علم میں ہے۔ پس جو لوگ حق کی جگہ باطل پر ایمان لائے ہیں اور اللہ کی صداقت کے منکر ہیں تو یقیناً وہی ہیں جو تباہ ہونے والے ہیں!

ایک دوسرے موقع پر فیصلہ امر کے لئے اسے سب سے بڑی شہادت قرار دیا ہے:

قُلْ اَیُّ شَیْءٍ اَکْبَرُ شَهَادَةً قُلِ اللّٰهُ شَهِیْدٌ بَیْنِیْ وَ بَیْنَكُمْ (۶:۱۹)

پوچھو! کون سی بات سب سے بڑی گواہی ہے؟ (اے پیغمبر!) کہہ دو۔ اللہ کی گواہی۔ وہی میرے اور تمہارے درمیان (فیصلہ امر کے لئے) گواہی دینے والا ہے!

قضاء بالحق مادیات اور معنویات کا عالم گیر قانون ہے

وہ کہتا ہے۔ اس قانون سے تم کیونکر انکار کر سکتے ہو جب کہ زمین و آسمان کا تمام کارخانہ اسی کی کارفرمائیوں پر قائم ہے! اگر فطرت کائنات نقصان اور برائی چھانٹتی نہ رہتی اور بقاء وقیام صرف اچھائی اور خوبی ہی کے لئے نہ ہوتا تو ظاہر ہے تمام کارخانہ ہستی درہم برہم ہو جاتا۔ جب تم جسمانیات میں اس قانون فطرت کا مشاہدہ کر رہے ہو تو معنویات میں تمہیں کیوں انکار ہو؟

وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَ هُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِیْهِنَّ (۲۳:۷۱)

اور اگر حق ان کی خواہشوں کی پیروی کرے تو یقین کرو! یہ آسمان و زمین اور جو کوئی اس میں ہے، سب درہم برہم ہو کر رہ جائے!

انتظار اور تربص

قرآن میں جہاں کہیں انتظار اور تربص پر زور دیا ہے اور کہا ہے: جلدی نہ کرو، انتظار کرو، عنقریب حق و باطل کا فیصلہ ہو جائے گا۔ مثلاً قُلْ فَانْتَظِرُوْۤا اِنِّیْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِیْنَ۔ (۱۰:۱۰۲) تو اس سے بھی مقصود یہی حقیقت ہے۔

قضاء بالحق اور تدریج و امہال

لیکن کیا ''قضاء بالحق'' کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر باطل عمل فوراً نابود ہو جائے اور ہر عمل حق فوراً فتح مند ہو جائے! قرآن کہتا ہے کہ نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا اور ''رحمت'' کا مقتضی یہی ہے

کہ ایسا نہ ہو۔ جس ''رحمت'' کا مقتضیٰ یہ ہوا کہ مادیات میں 'تدریج وامہال' کا قانون نافذ ہے، اسی رحمت کا مقتضیٰ یہ ہوا کہ معنویات میں بھی تدریج وامہال کا قانون کام کر رہا ہے۔ اور عالم مادیات ہو یا معنویات، کائنات ہستی کے ہر گوشے میں قانون فطرت ایک ہی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ممکن نہ تھا کہ دنیا میں کوئی انسانی جماعت اپنی بدعملیوں کے ساتھ مہلت حیات پاسکتی۔

وَلَوْ يُعَجِّلُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ اسْتِعْجَالَهُمْ بِالْخَيْرِ لَقُضِيَ إِلَيْهِمْ أَجَلُهُمْ (۱۰:۱۱)

اور جس طرح انسان فائدے کے لئے جلد باز ہوتا ہے، اگر اسی طرح اللہ انسان کو سزا دینے میں جلد باز ہوتا تو (انسان کی لغزشوں، خطاؤں کا یہ حال ہے کہ) کبھی کا فیصلہ ہو چکتا اور ان کا مقررہ وقت فوراً نمودار ہو جاتا۔

''تاجیل''

وہ کہتا ہے: جس طرح مادیات میں ہر حالت بتدریج نشوونما پاتی ہے اور ہر نتیجہ کے ظہور کے لئے ایک خاص مقدار، ایک خاص مدت اور ایک خاص وقت مقرر کر دیا گیا ہے، ٹھیک اسی طرح اعمال کے نتائج کے لئے بھی خاص مقدار و اوقات کے احکام مقرر ہیں۔ اور ضروری ہے کہ ہر نتیجہ ایک خاص مدت کے بعد اور ایک خاص مقدار کی نشوونما کے بعد ظہور میں آئے۔

مثلاً فطرت کا یہ قانون ہے کہ اگر پانی آگ پر رکھا جائے گا تو وہ گرم ہو کر کھولنے لگے گا لیکن پانی کے گرم ہونے اور آخر کار کھولنے کے لئے حرارت کی ایک خاص مقدار ضروری ہے اور اس کے ظہور و تکمیل کے لئے ضروری ہے کہ ایک مقررہ وقت تک انتظار کیا جائے۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم پانی چولہے پر رکھو اور وہ فوراً کھولنے لگے۔ وہ یقیناً کھولنے لگے گا، لیکن اس وقت جب حرارت کی مقررہ مقدار بتدریج تکمیل تک پہنچ جائے گی۔ ٹھیک اسی طرح یہاں انسانی اعمال کے نتائج بھی اپنے مقررہ اوقات ہی میں ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ اور ضروری ہے کہ جب تک اعمال کے اثرات ایک خاص مقررہ مقدار تک نہ پہنچ جائیں،

نتائج کے ظہور کا انتظار کیا جائے۔[۳۸]

اس صورت حال سے تدریج و امہال کی حالت پیدا ہو گئی اور عمل حق اور عمل باطل، دونوں کے نتائج کے ظہور کے لئے "تاجیل" یعنی ایک معین وقت کا ٹھہراؤ ضروری ہو گیا۔ دونوں کے نتائج فوراً ظاہر نہیں ہو جائیں گے۔ اپنی مقررہ "اجل" یعنی مقررہ وقت ہی پر ظاہر ہوں گے، البتہ حق کے لئے تاجیل اس لئے ہوتی ہے تا کہ اس کی فتح مند قوت نشوونما پائے اور باطل کے لئے اس لئے ہوتی ہے تا کہ اس کی فنا پذیر کمزوری تکمیل تک پہنچ جائے۔ اس تاجیل کے لئے کوئی ایک ہی مقررہ مدت نہیں ہے۔ ہر حالت کا ایک خاصہ ہے اور ہر گردوپیش اپنا ایک خاص مقتضی رکھتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ایک خاص حالت کے لئے مقررہ مدت کی مقدار بہت تھوڑی ہو اور ہوسکتا ہے کہ بہت زیادہ ہو۔

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ اٰذَنْتُكُمْ عَلٰى سَوَآءٍ وَاِنْ اَدْرِيْٓ اَقَرِيْبٌ اَمْ بَعِيْدٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ ○ اِنَّهٗ يَعْلَمُ الْجَهْرَ مِنَ الْقَوْلِ وَيَعْلَمُ مَا تَكْتُمُوْنَ ○ وَاِنْ اَدْرِيْ لَعَلَّهٗ فِتْنَةٌ لَّكُمْ وَمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ○ (۲۱:۱۰۹-۱۱۱)

پھر اگر یہ لوگ روگردانی کریں تو ان سے کہہ دو: میں نے تم سب کو یکساں طور پر (حقیقت حال کی) خبر دے دی اور میں نہیں جانتا اعمال بد کے جس نتیجہ کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے، اس کا وقت قریب ہے یا ابھی دیر ہے۔ جو کچھ علانیہ زبان سے کہا جاتا ہے اور جو کچھ تم پوشیدہ رکھتے ہو، خدا کو سب کچھ معلوم ہے۔ اور مجھے کیا معلوم؟ ہوسکتا ہے یہ تاخیر اس لئے ہو تا کہ تمہاری آزمائش کی جائے یا اس لئے کہ ایک خاص وقت تک تمہیں فائدہ اٹھانے کا (مزید) موقع دیا جائے!

قوانین فطرت کا معیار اوقات

قرآن کہتا ہے: تم اپنی اوقات شماری کے پیمانے سے قوانین فطرت کی رفتار عمل کا اندازہ نہ لگاؤ۔ فطرت کا دائرہ عمل تو اتنا وسیع ہے کہ تمہارے معیار حساب کی بڑی سے بڑی مدت اس کے لئے ایک دن کی مدت سے زیادہ نہیں۔

وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ وَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ وَعْدَهٗ.وَاِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ٥وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَمْلَيْتُ لَهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ ثُمَّ اَخَذْتُهَا وَاِلَيَّ الْمَصِيْرُ٥ (۲۲:۴۷۔۴۸)

یہ لوگ عذاب کے لئے جلد بازی کر رہے ہیں (یعنی انکار و شرارت کی راہ سے کہتے ہیں: اگر سچ مچ کو عذاب آنے والا ہے تو وہ کہاں ہے؟) سو یقین کرو! خدا اپنے وعدے میں کبھی خلاف کرنے والا نہیں۔ لیکن بات یہ ہے کہ تمہارے پروردگار کا ایک دن ایسا ہوتا ہے جیسے تمہارے حساب کا ہزار برس۔ چنانچہ کتنی ہی بستیاں ہیں جنہیں (عرصہ دراز تک) ڈھیل دی گئی حالانکہ وہ ظالم تھیں، پھر (جب ظہور نتائج کا وقت آ گیا تو) ہمارا مواخذہ نمودار ہو گیا اور (ظاہر ہے کہ لوٹ کر) ہماری طرف آنا ہے۔

استعجال بالعذاب

ان آیات میں فکر انسانی کی جس گمراہی کو ''استعجال بالعذاب'' سے تعبیر کیا گیا ہے، وہ صرف انہیں منکرین حق کی گمراہی نہ تھی جو ظہور اسلام کے وقت اس کی مخالفت پر کمر بستہ ہو گئے تھے، بلکہ ہر زمانے میں انسان کی ایک عالم گیر کج اندیشی رہی ہے۔ وہ بسا اوقات فطرت کی اس مہلت بخشی سے فائدہ اٹھانے کی جگہ شر و فساد میں اور زیادہ نڈر اور جری ہو جاتا ہے اور کہتا ہے: اگر فی الحقیقت حق و باطل کے لئے ان کے نتائج و عواقب ہیں تو وہ نتائج کہاں ہیں اور کیوں فوراً ظاہر نہیں ہو جاتے؟ قرآن جا بجا منکرین حق کا خیال نقل کرتا ہے اور کہتا ہے: اگر کائنات ہستی میں اس حقیقت اعلیٰ کا ظہور نہ ہوتا جسے ''رحمت'' کہتے ہیں تو یقیناً یہ نتائج یکا یک اور بہ یک دفعہ ظاہر ہو جاتے اور انسان اپنی بدعملیوں کے ساتھ کبھی زندگی کا سانس نہ لے سکتا لیکن یہاں سارے قانون اور حکموں سے بھی بالاتر ''رحمت'' کا قانون ہے اور اس کا مقتضی یہی ہے کہ حق کی طرح باطل کو بھی زندگی و معیشت کی مہلتیں دے اور توبہ و رجوع اور عفو و درگزر کا دروازہ ہر حال میں باز رکھے۔ فطرت کائنات میں اگر یہ ''رحمت'' نہ ہوتی تو یقیناً وہ جزائے عمل میں جلد باز ہوتی لیکن اس میں رحمت ہے، اس لئے نہ

تو اس کی مہلت بخشیوں کی کوئی حد ہے، نہ اس کے عفو و درگزر کے لئے کوئی کنارہ!

وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۝ قُلْ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ رَدِفَ لَكُمْ بَعْضُ الَّذِيْ تَسْتَعْجِلُوْنَ۝ وَاِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُوْنَ۝ (۲۷: ۷۱۔۷۳)

اور (اے پیغمبر!) یہ (حقیقت فراموش) کہتے ہیں: اگر تم (نتائج ظلم وطغیان سے ڈرانے میں) سچے ہو تو وہ بات کب ہونے والی ہے (اور کیوں نہیں ہو چکتی؟) ان سے کہہ دو (گھبراؤ نہیں) جس بات کے لئے تم جلدی مچا رہے ہو، عجب نہیں اس کا ایک حصہ بالکل قریب آ گیا ہو۔ (اے پیغمبر!) تمہارا پروردگار انسان کے لئے بڑا ہی فضل رکھنے والا ہے (کہ ہر حال میں اصلاح وتلافی کی مہلت دیتا ہے) لیکن (افسوس انسان کی غفلت پر!) بیش تر ایسے ہیں کہ اس کے فضل ورحمت سے فائدہ اٹھانے کی جگہ اس کی ناشکری کرتے ہیں!

وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ. وَلَوْلَآ اَجَلٌ مُّسَمًّى لَّجَآءَهُمُ الْعَذَابُ. وَلَيَاْتِيَنَّهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ۝ (۲۹: ۵۳)

اور یہ لوگ عذاب کے لئے جلدی کرتے ہیں (یعنی انکار وشرارت کی راہ سے کہتے ہیں: اگر واقعی عذاب آنے والا ہے تو کیوں نہیں آ چکتا؟) اور واقعہ یہ ہے کہ اگر ایک خاص وقت نہ ٹھہرا دیا گیا ہوتا تو کب کا عذاب آ چکا ہوتا۔ اور (یقین رکھو! جب وہ آئے گا تو اس طرح آئے گا کہ) یکایک ان پر آ گرے گا اور انہیں اس کا وہم وگمان بھی نہ ہوگا!

وَمَا نُؤَخِّرُهٗٓ اِلَّا لِاَجَلٍ مَّعْدُوْدٍ (۱۱: ۱۰۴)

اور (یاد رکھو!) اگر ہم اس معاملے میں تاخیر کرتے ہیں تو صرف اس لئے کہ ایک حساب کی ہوئی مدت کے لئے اسے تاخیر میں ڈال دیں۔

اَلْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ

وہ کہتا ہے: یہاں زندگی وعمل کی مہلتیں سب کے لئے ہیں، کیونکہ ''رحمت'' کا مقتضی یہی

تھا پس اس بات سے دھوکہ نہیں کھانا چاہئے اور یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ نتائج اعمال کے قوانین موجود نہیں۔ دیکھنا یہ چاہئے کہ نتیجے کی کامیابی کس کے حصے میں آتی ہے اور آخر کار کون آبرومند ہوتا ہے۔

قُلْ يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّىْ عَامِلٌ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ مَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ۝ (۱۳۶:۶)

(اے پیغمبر! تم ان لوگوں سے) کہہ دو کہ دیکھو! (اب میرے اور تمہارے معاملے کا فیصلہ اللہ کے ہاتھ ہے) تم جو کچھ کر رہے ہو، اپنی جگہ کیے جاؤ اور میں بھی اپنی جگہ کام میں لگا ہوں۔ عنقریب معلوم ہو جائے گا کہ کون ہے جس کے لئے آخر کار (کامیاب) ٹھکانا ہے۔ بلاشبہ (یہ اس کا قانون ہے کہ) ظلم کرنے والے کبھی فلاح نہیں پاسکتے۔

قرآن کی وہ تمام آیات جن میں ظلم وکفر کے لئے فلاح وکامیابی کی نفی کی گئی ہے

اس موقع پر یہ قاعدہ بھی معلوم کر لینا چاہئے کہ قرآن نے جہاں کہیں ظلم وفساد اور فسق وکفر وغیرہ اعمال بد کے لئے کامیابی وفلاح کی نفی کی ہے اور نیک عملی کے لئے فتح مندی وکامرانی کا اثبات کیا ہے، ان تمام مقامات میں بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ مثلاً

اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ. (۲۱:۶)

اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْمُجْرِمُوْنَ. (۱۷:۱۰)

اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ. (۱۱۷:۲۳)

لَا يُفْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِيْنَ. (۸۱:۱۰)

وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ. (۳۷:۹)

وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ. (۸۶:۳)

وغیرہ۔ اللہ ظلم کرنے والوں کو فلاح نہیں دیتا

یعنی اس کا قانون ہے کہ ظلم کے لئے کامیابی وفلاح نہیں ہوتی۔ اللہ ظلم کرنے والوں پر راہ نہیں کھولتا، یعنی اس کا قانون یہی ہے کہ ظلم کرنے والوں پر کامیابی وسعادت کی راہ نہیں کھلتی۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ اللہ ارشاد وہدایت کا دروازہ ان پر بند کر دیتا ہے اور وہ گمراہی وکوری کی زندگی پر مجبور کر دیئے جاتے ہیں۔ افسوس ہے کہ قرآن کے مفسروں نے ان مقامات کا ترجمہ غور وفکر کے ساتھ نہیں کیا، اس لئے مطالب اپنی اصلی شکل میں واضح نہ ہو سکے۔

تمتع

اور پھر اصطلاح قرآنی میں یہی وہ ''تمتع'' ہے، یعنی زندگی سے فائدہ اٹھانے کی مہلت جس کا وہ بار بار ذکر کرتا ہے اور جو یکساں طور پر سب کو دی گئی ہے۔

بَلْ مَتَّعْنَا هٰٓؤُلَاۗءِ وَاٰبَاۗءَهُمْ حَتّٰى طَالَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ (۲۱:۴۴)

بلکہ یہ بات ہے کہ ہم نے ان لوگوں کو اوران کے آباء واجداد کو مہلت حیات سے بہرہ مند ہونے کے موقعے دیے یہاں تک کہ (خوش حالی کی) ان پر بڑی بڑی عمریں گزر گئیں۔

اسی طرح وہ جا بجا مَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ (۹۸:۱۰) وَمَتَاعًا اِلٰى حِيْنٍ (۴۴:۳۶) فَتَمَتَّعُوْا فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ (۵۵:۱۶) وغیرہ تعبیرات سے بھی اسی حقیقت پر زور دیتا ہے۔

قضاء بالحق، اور اقوام وجماعات

اسی طرح وہ قانون ''قضاء بالحق'' کو جماعتوں اور قوموں کے عروج وزوال پر بھی منطبق کرتا ہے اور کہتا ہے: جس طرح فطرت کا قانون انتخاب افراد واجسام میں جاری ہے اسی طرح اقوام وجماعات میں بھی جاری ہے۔ جس طرح فطرت نافع اشیاء کو باقی رکھتی، غیر نافع کو چھانٹ دیتی ہے، ٹھیک اسی طرح جماعتوں میں بھی صرف اسی جماعت کے لئے بقا ہوتی ہے جس میں دنیا کے لئے نفع ہو۔ جو جماعت غیر نفع ہو جاتی ہے چھانٹ دی جاتی ہے۔ وہ کہتا ہے: یہ اس کی ''رحمت'' ہے۔ کیونکہ اگر ایسا نہ ہوتا تو دنیا میں انسانی ظلم وطغیان کے لئے کوئی روک تھام نظر نہ آتی۔

وَلَوْ لَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ○ (۲:۲۵۱)

اور (دیکھو!) اگر اللہ (نے جماعتوں اور قوموں میں باہم دگر تراحم پیدا نہ کر دیا ہوتا اور وہ) بعض آدمیوں کے ذریعے بعض آدمیوں کو راہ سے ہٹاتا نہ رہتا تو یقیناً زمین میں خرابی پھیل جاتی، لیکن اللہ کائنات کے لئے فضل و رحمت رکھنے والا ہے۔

ایک دوسرے موقع پر یہی حقیقت ان لفظوں میں بیان کی گئی ہے۔

وَلَوْ لَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَ بِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّ مَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ؕ وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ○ (۲۲:۴۰)

اگر ایسا نہ ہوتا کہ اللہ بعض جماعتوں کے ذریعے بعض جماعتوں کو ہٹاتا رہتا تو (یقین کرو! دنیا میں انسان کے ظلم و فساد کے لئے کوئی روک باقی نہ رہتی اور) یہ تمام خانقاہیں، گرجے، عبادت گاہیں، مسجدیں جن میں اس کثرت سے اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے، منہدم ہو کر رہ جاتیں۔ اور (یاد رکھو!) جو کوئی اللہ (کی سچائی) کی حمایت کرے گا، ضروری ہے کہ اللہ بھی اس کی مدد فرمائے۔ کچھ شبہ نہیں اللہ قوت رکھنے والا (اور سب پر) غالب ہے۔[۳۹]

''قضاء بالحق'' کے اجتماعی نفاذ میں بھی تدریج و امہال اور تاجیل ہے

لیکن وہ کہتا ہے جس طرح فطرت کائنات کے تمام کاموں میں تدریج و امہال کا قانون کام کر رہا ہے، اسی طرح قوموں اور جماعتوں کے معاملے میں بھی وہ جو کچھ کرتی ہے بتدریج کرتی ہے اور اصلاح حال اور رجوع و انابت کا دروازہ آخر وقت تک کھلا رکھتی ہے، کیونکہ ''رحمت'' کا مقتضی یہی ہے۔

وَقَطَّعْنٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اُمَمًا مِنْهُمُ الصّٰلِحُوْنَ وَمِنْهُمْ دُوْنَ ذٰلِكَ وَبَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَالسَّيِّاٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ○ (۷:۱۶۸)

اور ہم نے ایسا کیا کہ ان کے الگ الگ گروہ زمین میں پھیل گئے، ان میں سے بعض تو نیک عمل تھے، بعض دوسری طرح کے۔ پھر ہم نے انہیں اچھائیوں اور برائیوں دونوں طرح کی حالتوں سے آزمایا کہ نافرمانی سے باز آجائیں۔

جس طرح اجسام کے ہر تغیر کے لئے فطرت نے اسباب وعلل کی ایک خاص مقدار اور مدت مقرر کر دی ہے۔ اسی طرح اقوام کے زوال وہلاکت کے لئے بھی موجبات کی ایک خاص مقدار اور مدت مقرر ہے اور یہ ان کی ''اجل'' ہے۔ جب تک یہ اجل نہیں آچکتی قانون الٰہی یکے بعد دیگرے تنبہ واعتبار کی مہلتیں دیتا رہتا ہے۔

اَوَلَا یَرَوْنَ اَنَّھُمْ یُفْتَنُوْنَ فِیْ کُلِّ عَامٍ مَّرَّۃً اَوْمَرَّتَیْنِ ثُمَّ لَا یَتُوْبُوْنَ وَلَا ھُمْ یَذَّکَّرُوْنَ○ (۹:۱۲۶)

کیا یہ لوگ نہیں دیکھتے کہ ان پر کوئی برس ایسا نہیں گزرتا کہ ہم انہیں ایک مرتبہ یا دو مرتبہ آزمائشوں میں نہ ڈالتے ہوں (یعنی ان کے اعمال بد کے نتائج پیش نہ آتے ہوں) پھر بھی نہ تو توبہ کرتے ہیں نہ حالات سے نصیحت پکڑتے ہیں۔

لیکن اگر تنبہ واعتبار کی یہ تمام مہلتیں رائیگاں گئیں اور ان سے فائدہ نہ اٹھایا گیا تو پھر فیصلہ امر کا آخری وقت نمودار ہو جاتا ہے اور جب وہ وقت آجائے تو پھر یہ فطرت کا آخری، اٹل اور بے پناہ فیصلہ ہے، نہ تو اس میں ایک لمحہ کے لئے تاخیر ہوسکتی ہے نہ یہ اپنے مقررہ وقت سے ایک لمحہ پہلے آسکتا ہے۔

وَلِکُلِّ اُمَّۃٍ اَجَلٌ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُھُمْ لَا یَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَۃً وَّلَا یَسْتَقْدِمُوْنَ (۷:۳۴)

اور (دیکھو!) ہر امت کے لئے ایک مقررہ وقت ہے، سو جب ان کا مقررہ وقت آچکتا ہے تو اس سے نہ تو ایک گھڑی پیچھے رہ سکتے ہیں نہ ایک گھڑی آگے بڑھ سکتے ہیں۔

وَمَآ اَھْلَکْنَا مِنْ قَرْیَۃٍ اِلَّا وَلَھَا کِتَابٌ مَّعْلُوْمٌ○مَا تَسْبِقُ مِنْ اُمَّۃٍ اَجَلَھَا وَمَا یَسْتَاْخِرُوْنَ○ (۱۵:۴-۵)

اور ہم نے کسی بستی کو ہلاک نہیں کیا مگر یہ کہ (ہمارے ٹھہرائے ہوئے قانون کے مطابق) ایک مقررہ میعاد اس کے لئے موجود تھی۔ کوئی امت نہ تو اپنے مقررہ وقت سے آگے بڑھ سکتی ہے نہ پیچھے رہ سکتی ہے۔

اس طرح "بقاء انفع" اور "قضاء بالحق" کا قانون پچھلی قوم کو چھانٹ دیتا ہے اور اس کی جگہ ایک دوسری قوم لا کھڑی کرتا ہے اور یہ سب کچھ اس لئے ہوتا ہے کہ "رحمت" کا مقتضیٰ یہی ہے۔

ذٰلِكَ اَنْ لَّمْ يَكُنْ رَّبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّ اَهْلُهَا غٰفِلُوْنَ٥ وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ٥ وَرَبُّكَ الْغَنِيُّ ذُوالرَّحْمَةِ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَ يَسْتَخْلِفْ مِنْ بَعْدِكُمْ مَّا يَشَآءُ كَمَآ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ ذُرِّيَّةِ قَوْمٍ اٰخَرِيْنَ٥ (۶:۱۳۱-۱۳۳)

یہ (تبلیغ وہدایت کا تمام سلسلہ) اس لئے ہے کہ تمہارے پروردگار کا یہ شیوہ نہیں کہ بستیوں کو ظلم وستم سے ہلاک کر ڈالے اور ان کے بسنے والے حقیقت حال سے بے خبر ہوں۔ (اس کا قانون تو یہ ہے کہ) جیسا کچھ جس کا عمل ہے اسی کے مطابق اس کا ایک درجہ ہے (اور اسی درجے کے مطابق اچھے برے نتائج ظاہر ہوتے ہیں)، اور (یاد رکھو!) جیسے کچھ لوگوں کے اعمال ہیں، تمہارا پروردگار ان سے بے خبر نہیں ہے۔ تمہارا پروردگار رحمت والا، بے نیاز ہے۔ اگر وہ چاہے تو تمہیں راہ سے ہٹا دے اور تمہارے بعد جسے چاہے تمہارا جانشین بنا دے۔ اسی طرح جس طرح ایک دوسری قوم کی نسل سے تمہیں اوروں کا جانشین بنا دیا ہے۔

انفرادی زندگی اور مجازات دنیوی

اسی طرح وہ کہتا ہے: یہ بات کہ انفرادی زندگی کے اعمال کی جزاء دنیوی زندگی سے تعلق نہیں رکھتی، آخرت پر اٹھا رکھی گئی ہے اور دنیا میں نیک وبد سب کے لئے یکساں طور پر مہلت حیات اور فیضان معیشت ہے۔ اسی حقیقت کا نتیجہ ہے کہ یہاں "رحمت" کی

کارفرمائی ہے۔ "رحمت" کا مقتضی یہی تھا کہ اس کے فیضان و بخشش میں کسی طرح کا امتیاز نہ ہو اور مہلت حیات سب کو پوری طرح ملے۔ اس نے انسان کی انفرادی زندگی کے دو حصے کر دیئے۔ ایک حصہ دنیوی زندگی کا ہے اور سرتاسر مہلت ہے۔ دوسرا حصہ مرنے کے بعد کا ہے اور جزاء کا معاملہ اسی سے تعلق رکھتا ہے۔

وَرَبُّكَ الْغَفُوْرُ ذُوالرَّحْمَةِ لَوْ يُؤَاخِذُهُمْ بِمَا كَسَبُوْا لَعَجَّلَ لَهُمُ الْعَذَابَ بَلْ لَّهُمْ مَّوْعِدٌ لَّنْ يَّجِدُوْا مِنْ دُوْنِهٖ مَوْئِلًا ○ (۱۸:۵۸)

اور (اے پیغمبر! یقین کرو) تمہارا پروردگار بڑا بخشنے والا، صاحب رحمت ہے۔ اگر وہ ان لوگوں سے ان کے اعمال کے مطابق مواخذہ کرتا تو فوراً عذاب نازل ہو جاتا، لیکن ان کے لئے ایک میعاد مقرر کر دی گئی ہے اور جب وہ نمودار ہوگی تو اس سے بچنے کے لئے کوئی پناہ کی جگہ انہیں نہیں ملے گی۔

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ طِيْنٍ ثُمَّ قَضٰى اَجَلًا وَاَجَلٌ مُّسَمًّى عِنْدَهٗ (۶:۲)

وہی ہے جس نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا، پھر تمہاری زندگی کے لئے ایک وقت ٹھہرا دیا، اور اسی طرح اس کے پاس ایک اور بھی ٹھہرائی ہوئی میعاد ہے (یعنی قیامت کا دن)

معنوی قوانین کی مہلت بخشی اور توبہ وانابت

وہ کہتا ہے: جس طرح عالم اجسام میں تم دیکھتے ہو کہ فطرت نے ہر کمزوری وفساد کے لئے ایک لازمی نتیجہ ٹھہرا دیا ہے، لیکن پھر بھی اصلاح حال کا دروازہ بند نہیں کرتی اور مہلتوں پر مہلتیں دیتی رہتی ہے۔ نیز اگر بروقت اصلاح ظہور میں آجائے تو اسے قبول کر لیتی ہے۔ ٹھیک ٹھیک اسی طرح یہاں بھی توبہ وانابت کا دروازہ کھلا رکھا ہے۔ کوئی بدعملی، کوئی گناہ، کوئی جرم، کوئی فساد ہو اور نوعیت میں کتنا ہی سخت اور مقدار میں کتنا ہی عظیم ہو، لیکن جوں ہی توبہ وانابت کا احساس انسان کے اندر جنبش میں آتا ہے، رحمت الٰہی قبولیت کا دروازہ معاً کھول دیتی ہے اور اشک ندامت کا ایک قطرہ بدعملیوں، گناہوں کے بے شمار داغ دھبے اس طرح دھو دیتا ہے گویا اس دامن عمل پر کوئی دھبا لگا ہی نہ تھا۔ التائب من الذنب کمن لا ذنب لہ"

اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ . وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا O (۲۵:۷۰)

ہاں! مگر جس کسی نے توبہ کی، ایمان لایا اور آئندہ کے لئے نیک عملی اختیار کی تو یہ لوگ ہیں جن کی برائیوں کو اللہ اچھائیوں سے بدل دیتا ہے۔ اور اللہ بڑا بخشنے والا، بڑا رحم کرنے والا ہے!

رحمت الٰہی اور مغفرت و بخشش کی وسعت و فراوانی

اس بارے میں قرآن نے رحمت الٰہی کی وسعت اور اس کی مغفرت و بخشش کی فراوانی کا جو نقشہ کھینچا ہے اسکی کوئی حد و انتہا نہیں ہے۔ کتنے ہی گناہ ہوں، کتنے ہی سخت گناہ ہوں، کتنی ہی مدت کے گناہ ہوں، لیکن ہر اس انسان کے لئے جو اس کے دروازہ رحمت پر دستک دے، رحمت و قبولیت کے سوا کوئی صدا نہیں ہو سکتی۔

قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ O

(اے پیغمبر! لوگوں سے) کہہ دو ؐ اے میرے بندو جنہوں نے (بدعملیاں کرکے) اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے، (تمہاری بدعملیاں کتنی ہی سخت اور کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہوں، مگر) اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو، یقیناً اللہ تمہارے تمام گناہ بخش دے گا۔ یقیناً وہ بڑا بخشنے والا، بڑی ہی رحمت رکھنے والا ہے!

اسلامی عقائد کا دینی تصور اور "رحمت"

اور پھر یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں قرآن نے انسان کے لئے دینی عقائد و اعمال کا جو تصور قائم کیا ہے، اس کی بنیاد بھی تمام تر رحمت و محبت ہی پر رکھی ہے۔ کیونکہ وہ انسان کی روحانی زندگی کو کائنات فطرت کے عالم گیر کارخانہ سے کوئی الگ اور غیر متعلق چیز قرار نہیں دیتا، بلکہ اسی کا ایک مربوط گوشہ قرار دیتا ہے اور اس لئے کہتا ہے جس کارساز فطرت نے

تمام کارخانہ ہستی کی بنیاد ''رحمت'' پر رکھی ہے ضروری تھا کہ اس گوشے میں بھی اس کے تمام احکام سرتاسر ''رحمت'' کی تصویر ہوں۔

خدا اور اس کے بندوں کا رشتہ محبت کا رشتہ ہے

چنانچہ قرآن نے جا بجا یہ حقیقت واضح کی ہے کہ خدا اور اس کے بندوں کا رشتہ محبت کا رشتہ ہے اور سچی عبودیت اسی کی عبودیت ہے جس کے لئے معبود صرف معبود ہی نہ ہو، بلکہ محبوب بھی ہو۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ (۲:۱۶۵)

اور (دیکھو!) انسانوں میں سے کچھ انسان ایسے ہیں جو دوسری ہستیوں کو اللہ کا ہم پلہ بنا لیتے ہیں وہ انہیں اس طرح چاہنے لگتے ہیں جس طرح اللہ کو چاہنا ہوتا ہے، حالانکہ جو لوگ ایمان رکھنے والے ہیں ان کی زیادہ سے زیادہ محبت صرف اللہ ہی کے لئے ہوتی ہے۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۳:۳۱)

(اے پیغمبر! ان لوگوں سے) کہہ دو: اگر واقعی تم اللہ سے محبت رکھنے والے ہو تو چاہئے کہ میری پیروی کرو۔ (میں تمہیں محبت الٰہی کی حقیقی راہ دکھا رہا ہوں۔ اگر تم نے ایسا کیا تو صرف یہی نہیں ہوگا کہ تم اللہ سے محبت کرنے والے ہو جاؤ گے، بلکہ خود) اللہ تم سے محبت کرنے لگے گا اور تمہارے گناہ بخش دے گا۔ اور اللہ بخشنے والا، رحمت والا ہے!

وہ جا بجا اس حقیقت پر زور دیتا ہے کہ ایمان باللہ کا نتیجہ اللہ کی محبت اور محبوبیت ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ (۵:۵۴)

اے پیروان دعوت ایمانی! اگر تم میں سے کوئی شخص اپنے دین کی راہ سے پھر جائے گا تو (وہ یہ نہ سمجھے کہ دعوت حق کو اس سے کچھ نقصان پہنچے گا) عنقریب اللہ ایک گروہ ایسے لوگوں کا پیدا کر دے گا جنہیں اللہ کی محبت حاصل ہو گی اور وہ اللہ کو محبوب رکھنے والے ہوں گے۔

جو خدا سے محبت کرنا چاہتا ہے اسے چاہیئے اس کے بندوں سے محبت کرے

لیکن بندے کے لئے خدا کی محبت کی عملی راہ کیا ہے؟ وہ کہتا ہے خدا کی محبت کی راہ اس کے بندوں کی محبت میں سے ہو کر گزری ہے جو انسان چاہتا ہے خدا سے محبت کرے، اسے چاہیئے کہ خدا کے بندوں سے محبت کرنا سیکھے۔

وَاٰتَی الْمَالَ عَلٰی حُبِّہٖ (۲:۱۷۷)

اور جو اپنا مال اللہ کی محبت میں نکالتے اور خرچ کرتے ہیں۔

وَیُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰی حُبِّہٖ مِسْکِیْنًا وَّیَتِیْمًا وَّاَسِیْرًا ۝ اِنَّمَا نُطْعِمُکُمْ لِوَجْہِ اللّٰہِ لَانُرِیْدُ مِنْکُمْ جَزَآءً وَّلَا شُکُوْرًا (۷۶:۸-۹)

اور اللہ کی محبت میں وہ مسکینوں، یتیموں، قیدیوں کو کھلاتے ہیں (اور کہتے ہیں) ہمارا یہ کھلانا اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ محض اللہ کے لئے ہے، ہم تم سے نہ تو کوئی بدلا چاہتے ہیں نہ کسی طرح کی شکر گزاری۔

ایک حدیث قدسی میں یہی حقیقت نہایت موثر پیرائے میں واضح کی گئی ہے۔

یا ابن آدم مرضت فلم تعدنی. قال: کیف اعودك و انت رب العالمین؟ قال اما علمت ان عبدی فلانا مرض فلم تعده؟ اما علمت انك لو عدته لوجدتنی عنده؟ یا ابن آدم ! استطعمتك فلم تطعمنی. قال: یارب ! کیف اطعمك وانت رب العالمین؟ قال: اما علمت انه استطعمك عبدی فلان فلم تطعمه؟ اما علمت انك لو

اطعمته لوجدت ذلك عندی ؟یا ابن آدم! استسقیتك فلم تسقنی. قال: کیف اسقیك و انت رب العالمین ؟ قال: استسقاك عبدی فلان فلم تسقه، اما انك لوسقیته لوجدت ذلك عندی.[1]

(قیامت کے دن ایسا ہوگا کہ خدا ایک انسان سے کہے گا) اے ابن آدم! میں بیمار ہو گیا تھا مگر تو نے میری بیمار پرسی نہ کی۔ بندہ متعجب ہو کر کہے گا۔ بھلا ایسا کیونکر ہو سکتا ہے اور تو تو رب العالمین ہے؟ خدا فرمائے گا کیا تجھے معلوم نہیں میرا فلاں بندہ تیرے قریب بیمار ہو گیا تھا اور تو نے اس کی خبر نہیں لی تھی؟ اگر تو اس کی بیمار پرسی کے لئے جاتا تو مجھے اس کے پاس پاتا اسی طرح خدا فرمائے گا اے ابن آدم! میں نے تجھ سے کھانا مانگا تھا مگر تو نے نہیں کھلایا۔ بندہ عرض کرے گا بھلا ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ تجھے کسی بات کی احتیاج ہو؟ خدا فرمائے گا کیا تجھے یاد نہیں کہ میرے فلاں بھوکے بندے نے تجھ سے کھانا مانگا تھا اور تو نے انکار کر دیا تھا؟ اگر تو اسے کھلاتا تو تو اسے میرے پاس پاتا۔ ایسے ہی خدا فرمائے گا: اے ابن آدم! میں نے تجھ سے پانی مانگا مگر تو نے مجھے پانی نہ پلایا۔ بندہ عرض کرے گا بھلا ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ تجھے پیاس لگے تو تو خود پروردگار ہے؟ خدا فرمائے گا: میرے فلاں پیاسے بندے نے تجھ سے پانی مانگا لیکن تو نے اسے پانی نہ پلایا۔ اگر تو اسے پانی پلا دیتا تو اسے میرے پاس پاتا۔

اعمال و عبادات اور اخلاق و خصائل

اسی طرح قرآن نے اعمال و عبادات کی جو شکل و نوعیت قرار دی ہے، اخلاق و خصائل میں جن جن باتوں پر زور دیا ہے، اوامر و نواہی میں جو جو اصول و مبادی ملحوظ رکھے ہیں، ان سب میں بھی یہی حقیقت کام کر رہی ہے اور یہ چیز اس درجہ واضح و معلوم ہے کہ بحث و بیان کی ضرورت نہیں۔

قرآن سرتاسر رحمت الٰہی کا پیام ہے

اور پھر یہی وجہ ہے کہ قرآن نے خدا کی کسی صفت کو بھی اس کثرت کے ساتھ نہیں

دہرایا ہے اور نہ کوئی مطلب اس درجہ اس کے صفحات میں نمایاں ہے جس قدر رحمت ہے۔ اگر قرآن کے وہ تمام مقامات جمع کیے جائیں جہاں ''رحمت'' کا ذکر کیا گیا ہے تو تین سو سے زیادہ مقامات ہوں گے۔ اگر وہ تمام مقامات بھی شامل کر لئے جائیں جہاں اگرچہ لفظ رحمت استعمال نہیں ہوا ہے، لیکن ان کا تعلق رحمت ہی سے ہے، مثلاً ربوبیت، مغفرت، رافت، کرم، حلم، عفو وغیرہ تو پھر یہ تعداد اس حد تک پہنچ جاتی ہے کہ کہا جا سکتا ہے: قرآن اول سے لے کر آخر تک اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ رحمت الٰہی کا پیام ہے۔

بعض احادیث باب

ہم اس موقع پر وہ تمام تصریحات قصداً چھوڑ رہے ہیں جن کا ذخیرہ احادیث میں موجود ہے، کیونکہ یہ مقام زیادہ تفصیل و بحث کا متحمل نہیں۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے اپنے قول و عمل سے اسلام کی جو حقیقت ہمیں بتائی ہے، وہ تمام تر یہی ہے کہ خدا کی موحدانہ پرستش اور اس کے بندوں پر شفقت و رحمت۔ ایک مشہور حدیث جو ہر مسلمان واعظ کی زبان پر ہے، ہمیں بتلاتی ہے کہ:

انما یرحم اللہ من عبادہ الرحماء''[42]

خدا کی رحمت انہیں بندوں کے لئے ہے جو اس کے بندوں کے لئے رحمت رکھتے ہیں۔

حضرت مسیح (علیہ السلام) کا مشہور کلمہ وعظ ''زمین پر رحم کرو، تا کہ وہ جو آسمان پر ہے تم پر رحم کرے'' بجنسہٖ پیغمبر اسلام ﷺ کی زبان پر بھی طاری ہوا۔

الرحمن تبارک وتعالی، ارحموا من فی الارض یرحمکم من فی السماء'' [43]

اتنا ہی نہیں بلکہ اسلام نے انسانی رحمت و شفقت کی جو ذہنیت پیدا کرنا چاہی ہے وہ اس قدر وسیع ہے کہ بے زبان جانور بھی اس سے باہر نہیں ہیں۔ ایک سے زیادہ حدیثیں اس مضمون کی موجود ہیں کہ اللہ کی رحمت رحم کرنے والوں کے لئے ہے۔ اگرچہ یہ رحم ایک چڑیا ہی کے لئے کیوں نہ ہو:

''من رحم ولو ذبیحۃ عصفور رحمہ اللہ یوم القیامۃ''[44]

مقام انسانیت اور صفات الٰہی سے تخلق و تشبہ

اصل یہ ہے کہ قرآن نے خدا پرستی کی بنیاد ہی اس جذبہ پر رکھی ہے کہ انسان خدا کی صفتوں کا پرتو اپنے اندر پیدا کرے۔ وہ انسان کے وجود کو ایک ایسی سرحد قرار دیتا ہے جہاں حیوانیت کا درجہ ختم ہوتا اور ایک مافوق حیوانیت درجہ شروع ہو جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے: انسان کو جوہر انسانیت جو اسے حیوانات کی سطح سے بلند و ممتاز کرتا ہے، اس کے سوا کچھ نہیں کہ صفات الٰہی کا پرتو ہے اور اس لئے انسانیت کی تکمیل یہ ہے کہ اس میں زیادہ سے زیادہ صفات الٰہی سے تخلق و تشبہ پیدا ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے جہاں کہیں بھی انسان کی خاص صفات کا ذکر کیا ہے، انہیں براہ راست خدا کی طرف نسبت دی ہے۔ حتیٰ کہ جوہر انسانیت کو خدا کی روح پھونک دینے سے تعبیر کیا۔

ثُمَّ سَوّٰهُ وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ (۳۲:۹)

یعنی خدا نے آدم میں اپنی روح میں سے کچھ پھونک دیا اور اسی کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کے اندر عقل و حواس کا چراغ روشن ہو گیا۔

درازل پرتو حسنت ز تجلی دم زد
عشق پیدا شد و آتش بہ ہمہ عالم زد[۴۵]

پس اگر وہ خدا کی رحمت کا تصور ہم میں پیدا کرنا چاہتا ہے تو یہ اس لئے ہے کہ وہ چاہتا ہے ہم بھی سرتا پا رحمت و محبت ہو جائیں۔ اگر وہ اس کی ربوبیت کا مرقع بار بار ہماری نگاہوں کے سامنے لاتا ہے تو یہ اس لئے ہے کہ وہ چاہتا ہے کہ ہم بھی اپنے چہرہ اخلاق میں ربوبیت کے سارے خال و خط پیدا کر لیں۔ اگر وہ اس کی رافت و شفقت کا ذکر کرتا ہے، اس کے لطف و کرم کا جلوہ دکھاتا ہے، اس کے جود و احسان کا نقشہ کھینچتا ہے تو اسی لئے کہ وہ چاہتا ہے ہم میں بھی ان الٰہی صفتوں کا جلوہ نمودار ہو جائے۔ وہ بار بار ہمیں سناتا ہے کہ خدا کی بخشش و درگزر کی کوئی انتہا نہیں اور اس طرح ہمیں یاد دلاتا ہے کہ ہم میں بھی اس کے بندوں کے

لئے بخشش ودرگزر کا غیر محدود جوش پیدا ہو جانا چاہئے۔ اگر ہم اس کے بندوں کی خطائیں بخش نہیں سکتے تو ہمیں کیا حق ہے کہ اپنی خطاؤں کے لئے اس کی بخشائشوں کا انتظار کریں؟

احکام وشرائع

جہاں تک احکام وشرائع کا تعلق ہے، بلاشبہ اس نے یہ نہیں کہا کہ دشمنوں کو پیار کرو، کیونکہ ایسا کہنا حقیقت نہ ہوتی، مجاز ہوتا، لیکن اس نے کہا کہ دشمنوں کو بھی بخش دو اور جو دشمن کو بخش دینا سیکھ لے گا، اس کا دل خود بخود انسانی بغض ونفرت کی آلودگیوں سے پاک ہو جائے گا۔

وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ (۳:۱۳۴)

غصہ ضبط کرنے والے اور انسانوں کے قصور بخش دینے والے۔ اور اللہ کی محبت انہیں کے لئے ہے جو احسان کرنے والے ہیں!

وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً وَّيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ ۝ (۱۳:۲۲)

اور جن لوگوں نے اللہ کی محبت میں (تلخی وناگواری) برداشت کرلی، نماز قائم کی، خدا کی دی ہوئی روزی پوشیدہ وعلانیہ (اس کے بندوں کے لئے) خرچ کی اور برائی کا جواب برائی سے نہیں، نیکی سے دیا تو (یقین کرو!) یہی لوگ ہیں جن کے لئے آخرت کا بہتر ٹھکانا ہے۔

وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ (۴۲:۴۳)

اور (دیکھو!) جو کوئی برائی پر صبر کرے اور بخش دے تو یقیناً یہ بڑی ہی اولوالعزمی کی بات ہے!

وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ؕ اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ ۝ وَمَا

يُلَقّٰهَآ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا ۚ وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا ذُوْحَظٍّ عَظِيْمٍ ○

(۴۱:۳۴۔۳۵)

اور (دیکھو!) نیکی اور بدی برابر نہیں ہو سکتی۔ (اگر کوئی برائی کرے تو) برائی کا جواب ایسے طریقے سے دو جو اچھا طریقہ ہو۔ (اگر تم نے ایسا کیا تو تم دیکھو گے کہ) جس شخص سے تمہاری عداوت تھی یکا یک تمہارا دلی دوست ہو گیا ہے۔ (البتہ) یہ (ایسا مقام ہے جو) اسی کو مل سکتا ہے جو (بدسلوکی سہہ لینے کی) برداشت رکھتا ہو اور جسے (نیکی و سعادت کا) حصہ وافر ملا ہو۔

بلاشبہ اس نے بدلا لینے سے بالکل روک نہیں دیا اور وہ کیونکر روک سکتا تھا جب کہ طبیعت کا یہ فطری خاصہ ہے اور حفاظت نفس اس پر موقوف ہے۔ لیکن جہاں کہیں بھی اس نے اس کی اجازت دی ہے، ساتھ ہی عفو و بخشش اور بدی کے بدلے نیکی کرنے کی مؤثر ترغیب بھی دے دی ہے اور ایسی مؤثر ترغیب دی ہے کہ ممکن نہیں ایک خدا پرست انسان اس سے متاثر نہ ہو۔

وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ ۚ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ ○ (۱۲۶:۱۶)

اور (دیکھو!) اگر تم بدلا لو تو چاہئے جتنی اور جیسی کچھ برائی تمہارے ساتھ کی گئی ہے، اسی کے مطابق ٹھیک ٹھیک بدلا بھی لیا جائے (یہ نہ ہو کہ زیادتی کر بیٹھو)۔ لیکن اگر تم برداشت کر جاؤ اور بدلا نہ لو تو (یاد رکھو!) برداشت کرنے والوں کے لئے برداشت کر جانے ہی میں بہتری ہے! اور برائی کے لئے ویسا ہی اور اتنا ہی بدلا ہے جیسی اور جتنی برائی کی گئی ہے لیکن جس کسی نے درگزر کیا اور معاملے کو بگاڑنے کی جگہ سنوار لیا تو اس کا اجر اللہ پر ہے!

انجیل اور قرآن

ہم نے قرآن کی آیات عفو و بخشش نقل کرتے ہوئے ابھی کہا ہے کہ "اس نے یہ نہیں کہا کہ دشمنوں کو پیار کرو، کیونکہ ایسا کہنا حقیقت نہ ہوتی، مجاز ہوتا" ضروری ہے کہ اس کی مختصر

تشریح کردی جائے:

حضرت مسیح (علیہ السلام) نے یہودیوں کی ظاہر پرستیوں اور اخلاقی محرومیوں کی جگہ رحم ومحبت اورعفو و بخشش کی اخلاقی قربانیوں پر زور دیا تھااور ان کی دعوت کی اصلی روح یہی ہے۔چنانچہ ہم انجیل کے مواعظ میں جابجااس طرح کے خطابات پاتے ہیں''تم نے سنا ہوگا کہ اگلوں سے کہا گیادانت کے بدلے دانت اورآنکھ کے بدلے آنکھ،لیکن میں کہتا ہوں کہ شریر کامقابلہ نہ کرنا''یا''اپنے ہمسایوں ہی کونہیں بلکہ دشمنوں کوبھی پیار کرو''یا مثلاً ''اگر کوئی تمہارے ایک گال پرطمانچہ مارے تو چاہئے کہ دوسرا گال بھی آگے کر دو''۔سوال یہ ہے کہ ان خطابات کی نوعیت کیا تھی؟ یہ اخلاقی فضائل وایثار کاایک موثر پیرایہ بیان تھا یا تشریع۔یعنی قوانین وضع کرنا تھا؟

دعوت مسیح اور دنیا کی حقیقت فراموشی

افسوس کہ انجیل کے معتقدوں اورنکتہ چینوں دونوں نے یہاں ٹھوکر کھائی۔دونوں اس غلط فہمی میں مبتلا ہوگئے کہ یہ تشریع تھی۔اوراس لئے دونوں کوتسلیم کر لینا پڑا کہ یہ ناقابل عمل احکام ہیں۔معتقدوں نے خیال کیا کہ اگرچہ ان احکام پرعمل نہیں کیا جاسکتا،تاہم مسیحیت کے احکام یہی ہیں اورعملی نقطۂ خیال سے اس قدرکافی ہے کہ اوائل عہد میں چند ولیوں اور شہیدوں نے ان پرعمل کرلیا تھا۔نکتہ چینوں نے کہا کہ یہ سرتاسرایک نظری اور ناقابل عمل تعلیم ہے اور کہنے میں کتنی ہی خوش نما ہو،لیکن عملی نقطہ خیال سے اس کی کوئی قدرو قیمت نہیں۔یہ فطرت انسانی کے صریح خلاف ہے۔

فی الحقیقت نوع انسانی کی یہ بڑی ہی دردانگیز ناانصافی ہے جوتاریخ انسانیت کے اس عظیم الشان معلم کے ساتھ جائز رکھی گئی۔جس طرح بے درد نکتہ چینوں نے اسے سمجھنے کی کوشش نہ کی،اسی طرح نادان معتقدوں نے بھی فہم وبصیرت سے انکار کردیا۔

حضرت مسیح کی تعلیم کوفطرت انسانی کے خلاف سمجھنا تفریق بین الرسل ہے

لیکن کیاکوئی انسان جوقرآن کی سچائی کامعترف ہو،ایساخیال کرسکتا ہے کہ حضرت مسیح (علیہ السلام)

کی تعلیم فطرت انسانی کے خلاف تھی اور اس لئے نا قابل عمل تھی؟ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کی تصدیق کے ساتھ ایسا منکرانہ خیال جمع نہیں ہو سکتا۔ اگر ہم ایک لمحہ کے لئے بھی اسے تسلیم کر لیں تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم حضرت مسیح کی تعلیم کی سچائی سے انکار کر دیں، کیونکہ جو تعلیم فطرت انسانی کے خلاف ہے وہ کبھی انسان کے لئے سچی تعلیم نہیں ہو سکتی۔ لیکن ایسا اعتقاد نہ صرف قرآن کی تعلیم کے خلاف ہوگا، بلکہ اس کی دعوت کی اصلی بنیاد ہی متزلزل ہو جائے گی۔ اس کی دعوت کی بنیادی اصل یہ ہے کہ وہ دنیا کے تمام رہنماؤں کی یکساں طور پر تصدیق کرتا اور سب کو خدا کی ایک ہی سچائی کا پیام بر قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے: پیروان مذہب کی سب سے بڑی گمراہی "تفریق بین الرسل" ہے یعنی ایمان وتصدیق کے لحاظ سے خدا کے رسولوں میں تفریق کرنا، کسی ایک کو ماننا، دوسروں کو جھٹلانا، یا سب کو ماننا، کسی ایک کا انکار کر دینا۔ اسی لیے اس نے جا بجا اسلام کی راہ یہ بتلائی ہے کہ:

لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ (۳:۸۴)

ہم خدا کے رسولوں میں سے کسی کو بھی دوسروں سے جدا نہیں کرتے (کہ کسی کو مانیں، کسی کو نہ مانیں) ہم تو خدا کے آگے جھکے ہوئے ہیں (اس کی سچائی کہیں بھی آئی ہو اور کسی کی زبانی ہو، ہمارا اس پر ایمان ہے۔)

علاوہ بریں خود قرآن کریم نے حضرت مسیح کی دعوت کا یہی پہلو جا بجا نمایاں کیا ہے کہ وہ رحمت ومحبت کے پیامبر تھے اور یہودیوں کی اخلاقی خشونت وقساوت کے مقابلے میں مسیحی اخلاق کی رقت ورافت کی بار بار مدح کی ہے:

وَلِنَجْعَلَهٗ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِّنَّا وَكَانَ اَمْرًا مَّقْضِيًّا ○

(۱۹:۲۱)

اور تاکہ ہم اس کو (یعنی مسیح کے ظہور کو) لوگوں کے لئے ایک الٰہی نشانی اور اپنی رحمت کا فیضان بنائیں، اور یہ بات (مشیت الٰہی میں) طے شدہ تھی۔

وَجَعَلْنَا فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ رَاْفَةً وَّرَحْمَةً (۵۷:۲۷)

اور ان لوگوں کے دلوں میں جنہوں نے (مسیح کی) پیروی کی، ہم نے شفقت اور

رحمت ڈال دی۔

اس موقع پر یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ قرآن نے جس قدر اوصاف خود اپنی نسبت بیان کیے ہیں، پوری فراخ دلی کے ساتھ وہی اوصاف تورات وانجیل کے لئے بھی بیان کیے ہیں۔ مثلاً وہ جس طرح اپنے آپ کو ہدایت کرنے والا، روشنی رکھنے والا، نصیحت کرنے والا، قوموں کا امام، متقیوں کا رہنما قرار دیتا ہے، ٹھیک اسی طرح پچھلے صحیفوں کو بھی ان تمام اوصاف سے متصف قرار دیتا ہے۔ چنانچہ انجیل کی نسبت ہم جا بجا پڑھتے ہیں:

وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ فِيْهِ هُدًى وَّنُوْرٌ وَّمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝ (۵:۴۶)

یہ ظاہر ہے کہ جو تعلیم فطرت بشری کے خلاف اور نا قابل عمل ہو وہ کبھی نور وہدایت اور "مَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ" نہیں ہو سکتی۔

دعوت مسیحی کی حقیقت

اصل یہ ہے کہ حضرت مسیح (علیہ السلام) کی ان تمام تعلیمات کی وہ نوعیت نہ تھی جو غلطی سے سمجھ لی گئی اور دنیا میں ہمیشہ انسان کی سب سے بڑی گمراہی اس کے انکار سے نہیں، بلکہ کج اندیشانہ اعتراف ہی سے پیدا ہوئی ہے۔

حضرت مسیح کا ظہور ایک ایسے عہد میں ہوا تھا جب کہ یہودیوں کا اخلاقی تنزل انتہائی حد تک پہنچ چکا تھا اور دل کی نیکی اور اخلاق کی پاکیزگی کی جگہ محض ظاہری احکام ورسوم کی پرستش دین داری وخدا پرستی سمجھی جاتی تھی۔ یہودیوں کے علاوہ جس قدر متمدن قومیں قرب وجوار میں موجود تھیں مثلاً رومی، مصری، آشوری، وہ بھی انسانی رحم ومحبت کی روح سے یکسر نا آشنا تھیں۔ لوگوں نے یہ بات تو معلوم کرلی تھی کہ مجرموں کو سزائیں دینی چاہئیں، لیکن اس حقیقت سے بے بہرہ تھے کہ رحم ومحبت اور عفو وبخشش کی چارہ سازیوں سے جرموں اور گناہوں کی پیدائش روک دینی چاہیے۔ انسانی قتل وہلاکت کا تماشا دیکھنا، طرح طرح کے ہولناک طریقوں سے مجرموں کا ہلاک کرنا، زندہ انسانوں کو درندوں کے سامنے ڈال دینا،

آباد شہروں کو بلا وجہ جلا کر خاکستر کر دینا، اپنی قوم کے علاوہ تمام انسانوں کو غلام سمجھنا اور غلام بنا کر رکھنا، رحم و محبت اور حلم و شفقت کی جگہ قلبی قساوت و بے رحمی پر فخر کرنا رومی تمدن کا اخلاق اور مصری اور آشوری دیوتاؤں کا پسندیدہ طریقہ تھا۔

ضرورت تھی کہ نوع انسانی کی ہدایت کے لئے ایک ایسی ہستی مبعوث ہو جو سرتا سر رحمت و محبت کا پیام ہو اور جو انسانی زندگی کے تمام گوشوں سے قطع نظر کر کے صرف اسکی قلبی و معنوی حالت کی اصلاح و تزکیہ پر اپنی تمام پیغمبرانہ ہمت مبذول کر دے۔ چنانچہ حضرت مسیح کی شخصیت میں وہ ہستی نمودار ہوگئی۔ اس نے جسم کی جگہ روح پر، زبان کی جگہ دل پر اور ظاہر کی جگہ باطن پر نوع انسانی کو توجہ دلائی اور انسانیت اعلیٰ کا فراموش شدہ سبق تازہ کر دیا۔

مواعظ مسیح کے مجازات کو تشریع و حقیقت سمجھ لینا سخت غلطی ہے

معمولی سے معمولی کلام بھی بشرطیکہ بلیغ ہو، اپنی بلاغت کے مجازات رکھتا ہے۔ قدرتی طور پر اس الہامی بلاغت کے بھی مجازات تھے جو اس کی تاثیر کا زیور اور اس کی دل نشینی کی خوب روئی ہیں، لیکن افسوس کہ وہ دنیا جو اقانیم ثلاثہ اور کفارہ جیسے دور از کار عقائد پیدا کر لینے والی تھی، ان کے مواعظ کا مقصد و محل نہ سمجھ سکی اور مجازات کو حقیقت سمجھ کر غلط فہمیوں کا شکار ہوگئی۔

انہوں نے جہاں کہیں یہ کہا ہے کہ "دشمنوں کو پیار کرو" تو یقیناً اس کا یہ مطلب نہ تھا کہ ہر انسان کو چاہئے اپنے دشمنوں کا عاشق زار ہو جائے، بلکہ سیدھا سادا مطلب یہ تھا کہ تم میں غیظ و غضب اور نفرت و انتقام کی جگہ رحم و محبت کا پر جوش جذبہ ہونا چاہئے اور ایسا ہونا چاہئے کہ دوست تو دوست، دشمن تک کے ساتھ عفو و درگزر سے پیش آؤ۔ اس مطلب کے لئے کہ رحم کرو، بخش دو، انتقام کے پیچھے نہ پڑو، یہ ایک نہایت ہی بلیغ اور مؤثر پیرایۂ بیان ہے کہ "دشمنوں تک کو پیار کرو" ایک ایسے گردو پیش میں جہاں اپنوں اور عزیزوں کے ساتھ بھی رحم و محبت کا برتاؤ نہ کیا جاتا ہو، یہ کہنا کہ اپنے دشمنوں سے بھی نفرت نہ کرو، رحم و محبت کی ضرورت کا ایک اعلیٰ اور کامل ترین تخیل پیدا کرنا تھا۔

شنیدم کہ مردان راہ خدا
دل دشمنان ہم نہ کردند تنگ
ترا کی میسر شود این مقام
کہ باد دستانت خلاف ست و جنگ

یا مثلاً اگر انہوں نے کہا ''اگر کوئی تمہارے ایک گال پر طمانچہ مارے تو دوسرا گال بھی آگے کردو'' تو یقیناً اس کا مطلب یہ نہ تھا کہ سچ مچ کو تم اپنا گال آگے کردیا کرو بلکہ صحیح مطلب یہ تھا کہ انتقام کی جگہ عفو و درگزر کی راہ اختیار کرو۔ بلاغت کلام کے یہ وہ مجازات ہیں جو ہر زبان میں یکساں طور پر پائے جاتے ہیں۔ اور یہ ہمیشہ بڑی ہی جہالت کی بات سمجھی جاتی ہے کہ ان کے مقصود و مفہوم کی جگہ ان کے منطوق پر زور دیا جائے۔ اگر ہم اس طرح کے مجازات کو ان کے ظواہر پر محمول کرنے لگیں گے تو نہ صرف تمام الہامی تعلیمات ہی درہم برہم ہو جائیں گی بلکہ انسان کا وہ تمام کلام جو ادب و بلاغت کے ساتھ دنیا کی تمام زبانوں میں کہا گیا ہے، یک قلم مختل ہو جائے گا۔

اعمال انسانی میں اصل رحم و محبت ہے نہ کہ تعزیر و انتقام

باقی رہی یہ بات کہ حضرت مسیح نے سزا کی جگہ محض رحم و درگزر ہی پر زور دیا تو ان کے مواعظ کی اصلی نوعیت سمجھ لینے کے بعد یہ بات [46] بھی بالکل واضح ہو جاتی ہے بلاشبہ شرائع نے تعزیر و عقوبت کا حکم دیا تھا، لیکن اس لئے نہیں کہ تعزیر و عقوبت فی نفسہ کوئی مستحسن عمل ہے، بلکہ اس لئے کہ معیشت انسانی کی بعض ناگزیر حالتوں کے لئے یہ ایک ناگزیر علاج ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ ایک کم درجے کی برائی تھی جو اس لئے گوارا کر لی گئی کہ بڑے درجے کی برائیاں روکی جا سکیں، لیکن دنیا نے اسے علاج کی جگہ ایک دل پسند مشغلہ بنا لیا اور رفتہ رفتہ انسان کی تعذیب و ہلاکت کا ایک خوفناک آلہ بن گئی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ انسانی قتل و غارت گری کی کوئی ہولناکی ایسی نہیں ہے جو شریعت اور قانون کے نام سے نہ کی گئی ہو اور جو فی الحقیقت اسی بدلہ لینے اور سزا دینے کے حکم کا ظالمانہ استعمال نہ ہو۔

اگر تاریخ سے پوچھا جائے کہ انسانی ہلاکت کی سب سے بڑی قوتیں میدان ہائے جنگ سے باہر کون کون سی رہی ہیں تو یقیناً اس کی انگلیاں ان عدالت گاہوں کی طرف اٹھ جائیں گی جو مذہب اور قانون کے ناموں سے قائم کی گئیں اور جنہوں نے ہمیشہ اپنے ہم جنسوں کی تعذیب و ہلاکت کا عمل اس کی ساری وحشت انگیزیوں اور ہولناکیوں کیساتھ جاری رکھا[ؔ] ۔ پس اگر حضرت مسیح نے تعزیر وعقوبت کی جگہ سرتا سر رحم ودرگزر پر زور دیا تو یہ اس لئے نہیں تھا کہ وہ نفس تعزیر وسزا کے خلاف کوئی نئی تشریع کرنی چاہتے تھے۔ بلکہ ان کا مقصد یہ تھا کہ اس ہولناک غلطی سے انسان کونجات دلائیں جس میں تعزیر وعقوبت کے غلو نے مبتلا کر رکھا ہے۔ وہ دنیا کو بتانا چاہتے تھے کہ اعمال انسانی میں اصل عمل رحم ومحبت ہے، تعزیر وانتقام نہیں ہے۔ اور اگر تعزیر وسیاست جائز رکھی گئی ہے تو صرف اس لئے کہ بطور ایک ناگزیر علاج کے عمل میں لائی جائے۔ اس لئے نہیں کہ تمہارے دل رحم ومحبت کی جگہ سرتا سر نفرت وانتقام کا آشیانہ بن جائیں۔

شریعت موسوی کے پیروؤں نے شریعت کوصرف سزا دینے کا آلہ بنالیا تھا۔ حضرت مسیح نے بتلایا کہ شریعت سزا دینے کے لئے نہیں، بلکہ نجات کی راہ دکھانے آتی ہے اور نجات کی راہ سرتا سر رحمت ومحبت کی راہ ہے۔

''عمل'' اور ''عامل'' میں امتیاز

دراصل اس بارے میں انسان کی بنیادی غلطی یہ رہی ہے کہ وہ ''عمل'' اور ''عامل'' میں امتیاز قائم نہیں رکھتا۔ حالانکہ جہاں تک مذہب کی تعلیم کا تعلق ہے، اس بات میں کہ ایک عمل کیسا ہے، اور اس میں کہ کرنے والا کیسا ہے، بہت بڑا فرق ہے اور دونوں کا حکم ایک نہیں۔ بلاشبہ تمام مذاہب کا یہ عالم گیر مقصد رہا ہے کہ بدعملی اور گناہ کی طرف سے انسان کے دل میں نفرت پیدا کر دیں، لیکن انہوں نے کبھی گوارا نہیں کیا کہ خود انسان کی طرف سے انسان کے اندر نفرت پیدا ہو جائے۔ یقیناً انہوں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ گناہ سے نفرت کرو، لیکن یہ کبھی نہیں کہا ہے کہ گناہ گار سے نفرت کرو۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک طبیب

ہمیشہ لوگوں کو بیماری سے ڈراتا رہتا ہے اور بسا اوقات ان کے مہلک نتائج کا ایسا ہولناک نقشہ کھینچ دیتا ہے کہ دیکھنے والے سہم کر رہ جاتے ہیں۔ لیکن یہ تو کبھی نہیں کرتا کہ جو لوگ بیمار ہو جائیں ان سے ڈرنے اور نفرت کرنے لگے۔ یا لوگوں سے کہے: ڈرو اور نفرت کرو! اتنا ہی نہیں، بلکہ اس کی تو ساری توجہ اور شفقت کا مرکز بیماری کا وجود ہوتا ہے جو انسان جتنا زیادہ بیمار ہوگا اتنا ہی زیادہ اس کی توجہ اور شفقت کا مستحق ہو جائے گا۔

مرض اور مریض

پس جس طرح جسم کا طبیب بیماریوں کے لئے نفرت لیکن بیمار کے لئے شفقت اور ہمدردی کی تلقین کرتا ہے، ٹھیک اسی طرح روح و دل کے طبیب بیماریوں کے لئے نفرت لیکن گنہگاروں کے لئے سرتا پا رحمت و شفقت کا پیام ہوتے ہیں۔ یقیناً وہ چاہتے ہیں کہ گناہوں سے (جو روح و دل کی بیماریاں ہیں) ہم میں دہشت و نفرت پیدا کر دیں، لیکن گناہوں سے پیدا کریں، گنہگار انسانوں سے نہیں۔ اور یہی وہ نازک مقام ہے جہاں پیروان مذہب نے ٹھوکر کھائی ہے۔ مذاہب نے چاہا تھا انہیں برائی سے نفرت کرنا سکھائیں، لیکن برائی سے نفرت کرنے کی جگہ انہوں نے ان انسانوں سے نفرت کرنا سیکھ لیا جنہیں وہ اپنے خیال میں برائی کا مجرم تصور کرتے ہیں۔

گناہوں سے نفرت کرو مگر گناہ گاروں پر رحم کرو

حضرت مسیح کی تعلیم سرتاسر اسی حقیقت کی دعوت تھی۔ گناہوں سے نفرت کرو، مگر ان انسانوں سے نفرت نہ کرو جو گناہوں میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ اگر ایک انسان گناہ گار ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کی روح و دل کی تندرستی باقی نہیں رہی، لیکن اگر اس نے بد بختانہ اپنی تندرستی ضائع کر دی ہے تو تم اس سے نفرت کیوں کرو؟ وہ تو اپنی تندرستی کھو کر اور زیادہ تمہارے رحم و شفقت کا مستحق ہو گیا ہے۔ تم اپنے بیمار بھائی کی تیمارداری کرو گے یا اسے جلاد کے تازیانے کے حوالے کر دو گے؟ وہ موقع یاد کرو جس کی تفصیل ہمیں سینٹ لوقا (Saint Luke) کی زبانی معلوم ہوئی ہے۔ جب ایک گناہ گار عورت حضرت مسیح کی خدمت میں

آئی اور اس نے اپنے بالوں کی لٹوں سے ان کے پاؤں پونچھے تو اس پر ریا کار فریسیوں (Pharisee) کو (اور اب فریسیت کے معنی ہی ریاکاری کے ہو گئے ہیں (Pharisaism) سخت تعجب ہوا، لیکن انہوں نے کہا طبیب بیماروں کے لئے ہوتا ہے، نہ کہ تندرستوں کے لئے۔ پھر خدا اور اس کے گناہگار بندوں کا رشتہ رحمت واضح کرنے کے لئے ایک نہایت ہی موثر اور دل نشین مثال بیان کی: فرض کرو! ایک ساہوکار کے دو قرض دار تھے، ایک پچاس روپیہ کا، ایک ہزار روپیہ کا۔ ساہوکار نے دونوں کا قرض معاف کر دیا۔ بتاؤ! کس قرضدار پر اس کا احسان زیادہ ہوا اور کون اس سے زیادہ محبت کرے گا۔ وہ جسے پچاس معاف کر دیئے یا وہ جسے ہزار؟[۴۸]

نصیب ماست بہشت ای خدا شناس برو

کہ مستحق کرامت گناہ گار انند

یہی حقیقت ہے جس کی طرف بعض ائمہ تابعین نے اشارہ کیا ہے:

"انکسار العاصین احب الی اللہ من صولۃ المطیعین"

خدا کے فرماں بردار بندوں کی تمکنت سے کہیں زیادہ گناہ گار بندوں کا عجز وانکسار محبوب ہے۔

گدایاں را ازیں معنی خبر نیست

کہ سلطان جہاں باماست امروز

قرآن اور گناہ گار بندوں کے لئے صدائے تشریف ورحمت

اور پھر یہی حقیقت ہے کہ ہم قرآن میں دیکھتے ہیں جہاں کہیں خدا نے گناہگار انسانوں کو مخاطب کیا ہے یا ان کا ذکر کیا ہے تو عموماً یائے نسبت کے ساتھ کیا ہے جو تشریف ومحبت پر دلالت کرتی ہے۔

قُلۡ يٰعِبَادِيَ الَّذِيۡنَ اَسۡرَفُوۡا عَلٰٓى اَنۡفُسِهِمۡ (۳۹:۵۳)

ء انتم اضللتم عبادی (۲۵:۱۷)[۴۹]

اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے ایک باپ جوش محبت میں اپنے بیٹے کو پکارتا ہے تو

خصوصیت کے ساتھ اپنے رشتہ پدری پر زور دیتا ہے ''اے میرے بیٹے! اے میرے فرزند!
حضرت امام جعفر صادق نے سورہ زمر کی آیت رحمت کی تفسیر کرتے ہوئے کیا خوب فرمایا
ہے: ''جب ہم اپنی اولاد کو اپنی طرف نسبت دے کر مخاطب کرتے ہیں تو وہ بے خوف وخطر
ہماری طرف دوڑنے لگتے ہیں، کیونکہ سمجھ جاتے ہیں ہم ان پر غضب ناک نہیں'' قرآن میں
خدا نے بیس سے زیادہ موقعوں پر ہمیں ''یعبادی'' کہہ کر پکارا ہے۔ کیا اس سے بھی بڑھ کر
اس کی رحمت و آمرزش کا کوئی پیام ہوسکتا ہے؟

صحیح مسلم کی مشہور حدیث کا مطلب کس طرح واضح ہوجاتا ہے جب ہم اس روشنی میں
اس کا مطالعہ کرتے ہیں:

والذی نفسی بیدہ لولم تذنبوا لذھب اللہ بکم ولجاء
بقوم یذنبون فیستغفرون (مسلم عن ابی ھریرۃ ؓ)۵۰

اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! اگر تم ایسے ہو جاؤ کہ گناہ تم سے
سرزد ہی نہ ہو تو خدا تمہیں زمین سے ہٹا دے اور تمہاری جگہ ایک دوسرا گروہ پیدا کر
دے جس کا شیوہ یہ ہو کہ گناہوں میں مبتلا ہو اور پھر خدا سے بخشش و مغفرت کی طلب
گاری کرے۔

فدای شیوۂ رحمت کہ درلباس بہار
بعذر خواہیِ رندان بادہ نوش آمد

اصلاً انجیل اور قرآن کی تعلیم میں کوئی اختلاف نہیں

پس فی الحقیقت حضرت مسیح (علیہ السلام) کی تعلیم میں اور قرآن کی تعلیم میں اصلاً کوئی فرق
نہیں ہے۔ دونوں کا معیار احکام ایک ہی ہے، فرق صرف محل بیان اور پیرایہ بیان کا ہے۔
حضرت مسیح نے صرف اخلاق اور تزکیہ قلب پر زور دیا، کیونکہ شریعت موسوی موجود تھی اور وہ
اس کا ایک نقطہ بھی بدلنا نہیں چاہتے تھے، لیکن قرآن کو اخلاق اور قانون دونوں کے احکام
بیک وقت بیان کرنے تھے، اس لئے قدرتی طور پر اس نے پیرایہ بیان ایسا اختیار کیا جو

مجازات و متشابہات کی جگہ احکام و قوانین کا صاف صاف جچا تلا پیرایہ بیان تھا۔ اس نے سب سے پہلے عفو و درگزر پر زور دیا اور اسے نیکی و فضیلت کی اصل قرار دیا۔ ساتھ ہی بدلہ لینے اور سزا دینے کا دروازہ بھی کھلا رکھا کہ ناگزیر حالتوں میں اس کے بغیر چارہ نہیں، لیکن نہایت قطعی اور واضح لفظوں میں بار بار کہہ دیا کہ بدلے اور سزا میں کسی طرح کی ناانصافی اور زیادتی نہیں ہونی چاہئے۔ یقیناً دنیا کے تمام نبیوں اور شریعتوں کے احکام کا ماحصل یہی تین اصول رہے ہیں۔

وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ○ وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰۗئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍ ○ اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَيَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۭ اُولٰۗئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ○ وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ○ (۴۲:۴۰-۴۳)

اور (دیکھو!) برائی کے بدلے ویسی ہی اور اتنی ہی برائی ہے، لیکن جو کوئی بخش دے اور بگاڑنے کی جگہ سنوار لے تو (یقین کرو!) اس کا اجر اللہ کے ذمہ ہے۔ اللہ ان لوگوں کو دوست نہیں رکھتا جو زیادتی کرنے والے ہیں۔ اور جس کسی پر ظلم کیا گیا ہو اور وہ ظلم کے بعد اس کا بدلہ لے تو اس پر کوئی الزام نہیں۔

الزام ان لوگوں پر ہے جو انسانوں پر ظلم کرتے ہیں اور ناحق ملک میں فساد کا باعث ہوتے ہیں۔ سو یہی لوگ ہیں جن کے لئے عذاب الیم ہے۔ اور جو کوئی بدلہ لینے کی جگہ برائی برداشت کر جائے اور بخش دے تو یقیناً یہ بڑی ہی اولوالعزمی کی بات ہے!

اسلوب بیان پر غور کرو! اگرچہ ابتدا میں صاف صاف کہہ دیا تھا کہ:

"فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ"

اور بظاہر عفو و درگزر کے لئے اتنا کہہ دینا کافی تھا، لیکن آخر میں پھر دوبارہ اس پر زور دیا:

"وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِo "

یہ تکرار اس لئے ہے کہ عفوودرگزر کی اہمیت واضح ہو جائے، یعنی یہ حقیقت اچھی طرح آشکارا ہو جائے کہ اگر چہ بدلے اور سزا کا دروازہ کھلا رکھا گیا ہے، لیکن نیکی وفضیلت کی راہ عفوودرگزر ہی کی راہ ہے۔

پھر اس پہلو پر بھی نظر رہے کہ قرآن نے اس سزا کو جو برائی کے بدلے میں دی جائے، برائی ہی کے لفظ سے تعبیر کیا:

"وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا"

یعنی "سیئہ" کے بدلے میں جو کچھ کیا جائے گا وہ بھی "سیئہ" ہی ہوگا۔

عمل حسن نہیں ہوگا، لیکن اس کا دروازہ اس لئے باز رکھا گیا کہ اگر باز نہ رکھا جائے تو اس سے بھی زیادہ برائیاں ظہور میں آنے لگیں گی۔ پھر اس آدمی کی نسبت جو معاف کردے "اصلح" کا لفظ کہا، یعنی سنوارنے والا۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہاں بگاڑ کے اصلی سنوارنے والے وہی ہوئے جو بدلے کی جگہ عفوودرگزر کی راہ اختیار کرتے ہیں۔ [51]

قرآن کے زواجر وقوارع

ممکن ہے بعض طبیعتیں یہاں ایک خدشہ محسوس کریں۔ اگر فی الحقیقت قرآن کی تمام تعلیم کا اصل اصول رحمت ہی ہے تو پھر اس نے اپنے مخالفوں کی نسبت زجر وتوبیخ کا سخت پیرایہ کیوں اختیار کیا؟

اس کا مفصل جواب تو اپنے محل میں آئے گا، لیکن تکمیل بحث کے لئے ضروری ہے کہ یہاں مختصر اشارہ کر دیا جائے۔ بلاشبہ قرآن میں ایسے مقامات موجود ہیں جہاں اس نے مخالفوں کے لئے شدت وغلظت کا اظہار کیا ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ کن مخالفوں کے لئے؟ ان کے لئے جن کی مخالفت محض اختلاف فکر واعتقاد کی مخالفت تھی، یعنی ایسی مخالفت جو معاندانہ اور جارحانہ نوعیت نہیں رکھتی تھی۔ ہمیں اس سے قطعاً انکار ہے۔ ہم پورے وثوق

کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ تمام قرآن میں شدت و غلظت کا ایک لفظ بھی نہیں مل سکتا جو اس طرح کے مخالفوں کے لیے استعمال کیا ہو۔ اس نے جہاں کہیں بھی مخالفوں کا ذکر کرتے ہوئے سختی کا اظہار کیا ہے، اس کا تمام تر تعلق ان مخالفوں سے ہے جن کی مخالفت بغض و عناد اور ظلم و شرارت کی جارحانہ معاندت تھی۔ اور ظاہر ہے کہ اصلاح و ہدایت کی کوئی تعلیم بھی اس صورت حال سے گریز نہیں کر سکتی۔ اگر ایسے مخالفوں کے ساتھ بھی نرمی و شفقت ملحوظ رکھی جائے تو بلاشبہ یہ رحمت کا سلوک تو ہوگا، مگر انسانیت کے لئے نہیں ہوگا، ظلم و شرارت کے لئے ہوگا اور یقیناً سچی رحمت کا معیار یہ نہیں ہونا چاہئے کہ ظلم و فساد کی پرورش کرے۔ ابھی چند صفحوں کے بعد تمہیں معلوم ہوگا کہ قرآن نے صفات الٰہی میں رحمت کے ساتھ عدالت کو بھی اس کی جگہ دی ہے۔ اور سورہ فاتحہ میں ربوبیت اور رحمت کے بعد عدالت ہی کی صفت جلوہ گر ہوئی ہے کہ وہ رحمت سے عدالت کو الگ نہیں کرتا، بلکہ اسے عین رحمت کا مقتضی قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے: تم انسانیت کے ساتھ رحم و محبت کا برتاؤ کر ہی نہیں سکتے، اگر ظلم و شرارت کے لئے تم میں سختی نہیں ہے۔ انجیل میں ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت مسیح بھی اپنے زمانے کے مفسدوں کو "سانپ کے بچے" اور "ڈاکوؤں کا مجمع" کہنے پر مجبور ہوئے۔

کفر محض اور کفر جارحانہ

قرآن نے "کفر" کا لفظ انکار کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ انکار دو طرح کا ہوتا ہے، ایک یہ کہ انکار محض ہو، ایک یہ کہ جارحانہ ہو۔

انکار محض سے مقصود یہ ہے کہ ایک شخص تمہاری تعلیم قبول نہیں کرتا، اس لئے کہ اس کی سمجھ میں نہیں آتی یا اس لئے کہ اس میں طلب صادق نہیں ہے یا اس لئے کہ جو راہ چل رہا ہے اسی پر قانع ہے۔ بہر حال کوئی وجہ ہو، لیکن وہ تم سے متفق نہیں ہے۔

جارحانہ انکار سے مقصود وہ حالت ہے جو صرف اتنے ہی پر قناعت نہیں کرتی، بلکہ اس میں تمہارے خلاف ایک طرح کی کد اور ضد پیدا ہو جاتی ہے اور پھر یہ ضد بڑھتے بڑھتے بغض و عناد اور ظلم و شرارت کی سخت سے سخت صورتیں اختیار کر لیتی ہے۔ اس طرح کا مخالف

صرف یہی نہیں کرتا کہ تم سے اختلاف رکھتا ہے، بلکہ اس کے اندر تمہارے خلاف بغض وعناد کا ایک غیر محدود جوش پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی زندگی اور زندگی کی ساری قوتوں کے ساتھ تمہاری بربادی وہلاکت کے درپے ہو جائے گا۔ تم کتنی ہی اچھی بات کہو، وہ تمہیں جھٹلائے گا۔ تم کتنا ہی اچھا سلوک کرو، وہ تمہیں اذیت پہنچائے گا۔ تم کہو: روشنی تاریکی سے بہتر ہے، تو وہ کہے: تاریکی سے بہتر کوئی چیز نہیں۔ تم کہو: کڑواہٹ سے مٹھاس اچھی ہے، تو وہ کہے: نہیں، کڑواہٹ ہی میں دنیا کی سب سے بڑی لذت ہے۔

یہی حالت ہے جسے قرآن انسانی فکر وبصیرت کے تعطل سے تعبیر کرتا ہے اور اسی نوعیت کے مخالف ہیں جن کیلئے اس کے تمام زواجر وقوارع ظہور میں آئے ہیں۔

لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا ۚ أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ ۝ (۷:۱۷۹)

ان کے پاس دل ہیں مگر سوچتے نہیں، ان کے پاس آنکھیں ہیں مگر دیکھتے نہیں، ان کے پاس کان ہیں مگر سنتے نہیں۔ وہ ایسے ہو گئے ہیں جیسے چارپائے نہیں بلکہ چارپایوں سے بھی زیادہ کھوئے ہوئے۔ بلاشبہ یہی لوگ ہیں جو غفلت میں ڈوب گئے ہیں۔

ہمارے مفسر اسی دوسری حالت کو "کفر جحود" سے تعبیر کرتے ہیں۔

دنیا میں جب کبھی سچائی کی کوئی دعوت ظاہر ہوئی ہے تو کچھ لوگوں نے اسے قبول کر لیا ہے، کچھ نے انکار کیا ہے، لیکن کچھ لوگ ایسے ہوئے ہیں جنہوں نے سچائی کی دعوت صیغۂ واحد 'اس' ہونا چاہیے ان کے خلاف طغیان وجحود اور ظلم وشرارت کی جتھابندی کر لی ہے۔ قرآن کا جب ظہور ہوا تو اس نے بھی یہ تینوں جماعتیں اپنے سامنے پائیں۔ اس نے پہلی جماعت کو اپنی آغوش تربیت میں لے لیا، دوسری کو دعوت وتذکیر کا مخاطب بنایا، مگر تیسری کے ظلم وطغیان پر حسب حالت وضرورت زجر وتوبیخ کی۔ اگر ایسے گروہ کے لئے بھی اس کے لب ولہجہ کی سختی "رحمت" کے خلاف ہے تو بلاشبہ اس معنی میں قرآن رحمت کا معترف نہیں اور یقیناً اس ترازو

سے اس کی رحمت تولی نہیں جاسکتی۔

تم بار بار سن چکے ہو کہ وہ دین حق کے معنوی قوانین کو کائنات فطرت کے عام قوانین سے الگ نہیں قرار دیتا، بلکہ انہیں کا ایک گوشہ قرار دیتا ہے۔ فطرت کائنات کا اپنے فعل وظہور کے ہر گوشے میں کیا حال ہے؟ یہ حال ہے کہ وہ اگرچہ سرتاسر رحمت ہے، لیکن رحمت کے ساتھ عدالت، اور بخشش کے ساتھ جزا کا قانون بھی رکھتی ہے۔ پس قرآن کہتا ہے: میں فطرت سے زیادہ کچھ نہیں دے سکتا۔ تمہاری جس مزعومہ رحمت سے فطرت کا خزانہ خالی ہے، یقیناً میرے آستین ودامن میں نہیں مل سکتی۔

فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۭ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ڎ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝

(۳۰:۳۰)

اللہ کی فطرت جس پر اللہ نے انسان کو پیدا کیا ہے۔ اللہ کی بناوٹ میں کبھی تبدیلی نہیں ہوسکتی۔ یہی (اللہ کی ٹھہرائی ہوئی فطرت) سچا اور ٹھیک دین ہے۔ لیکن اکثر انسان ایسے ہیں جو اس حقیقت سے بے خبر ہیں۔

قرآن کے ان تمام مقامات پر نظر ڈالو جہاں اس نے سختی کے ساتھ منکروں کا ذکر کیا ہے، یہ حقیقت بیک نظر واضح ہو جائے گی۔ [۵۲]

(۵)

مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ

''ربوبیت'' اور ''رحمت'' کے بعد جس صفت کا ذکر کیا گیا ہے وہ ''عدالت'' ہے اور اس کے لئے ''مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ'' کی تعبیر اختیار کی گئی ہے۔

الدّین

سامی زبانوں کا ایک قدیم مادہ ''دان'' اور ''دین'' ہے جو بدلے اور مکافات کے معنوں میں بولا جاتا تھا اور پھر آئین وقانون کے معنوں میں بھی بولا جانے لگا۔ چنانچہ عبرانی اور آرامی میں اس کے متعدد مشتقات ملتے ہیں۔ آرامی زبان ہی سے غالباً یہ لفظ قدیم ایران میں بھی پہنچا اور پہلوی میں ''دینیہ'' نے شریعت وقانون کا مفہوم پیدا کرلیا۔ خورد اوستا میں ایک سے زیادہ موقع پر یہ لفظ مستعمل ہوا ہے اور زردشتیوں کی قدیم ادبیات میں انشاء وکتابت کے آئین وقواعد کو بھی ''دین دبیرہ'' کے نام سے موسوم کیا ہے۔ علاوہ بریں زردشتیوں کی ایک مذہبی کتاب کا نام ''دین کارت'' ہے جو غالباً نویں صدی مسیحی میں عراق کے ایک موبد نے مرتب کی تھی[۵۳]

بہر حال عربی میں ''الدین'' کے معنی بدلے اور مکافات کے ہیں، خواہ اچھائی کا ہو یا برائی کا۔

ستعلم لیلی ایّ دین تداینت
وایّ غریم فی التقاضی غریمها

پس ''مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ'' کے معنی ہوئے: وہ جو جزا کے دن کا حکمران ہے یعنی روز قیامت کا اس سلسلے میں کئی باتیں قابل غور ہیں۔

''دین'' کے لفظ نے جزا کی حقیقت واضح کر دی

اولاً، قرآن نے نہ صرف اس موقع پر بلکہ عام طور پر جزا کے لئے ''الدین'' کا لفظ اختیار کیا ہے اور اسی لئے وہ قیامت کو بھی عموماً ''یوم الدین'' سے تعبیر کرتا ہے۔ یہ تعبیر اس لئے اختیار کی گئی کہ جزا کے بارے میں جو اعتقاد پیدا کرنا چاہتا تھا، اس کے لئے یہی تعبیر سب سے زیادہ موزوں اور واقعی تعبیر تھی۔ وہ جزا کو اعمال کا قدرتی نتیجہ اور مکافات قرار دیتا ہے۔

نزول قرآن کے وقت پیروان مذاہب کا عالم گیر اعتقاد یہ تھا کہ جزا محض خوشنودی اور اس کے قہر و غضب کا نتیجہ ہے، اعمال کے نتائج کو اس میں دخل نہیں۔ الوہیت اور شاہیت کا تشابہ تمام مذہبی تصورات کی طرح، اس معاملے میں بھی گمراہی فکر کا موجب ہوا تھا۔ لوگ دیکھتے تھے کہ ایک مطلق العنان بادشاہ کبھی خوش ہو کر انعام و اکرام دینے لگتا ہے، کبھی بگڑ کر سزائیں دینے لگتا ہے، اس لئے خیال کرتے تھے کہ خدا کا بھی ایسا ہی حال ہے۔ وہ کبھی ہم سے خوش ہو جاتا ہے کبھی غیظ و غضب میں آجاتا ہے۔ طرح طرح کی قربانیوں اور چڑھاووں کی رسم اسی اعتقاد سے پڑی تھی۔ لوگ دیوتاؤں کا جوش وغضب ٹھنڈا کرنے کے لئے قربانیاں کرتے اور ان کی نظر التفات حاصل کرنے کے لئے نذریں چڑھاتے۔

یہودیوں اور عیسائیوں کا عام تصور دیوبانی تصورات سے بلند ہو گیا تھا، لیکن جہاں تک اس معاملے کا تعلق ہے، ان کے تصور نے بھی کوئی وقیع ترقی نہیں کی تھی۔

یہودی بہت سے دیوتاؤں کی جگہ خاندان اسرائیل کا ایک خدا مانتے تھے۔ لیکن پرانے دیوتاؤں کی طرح یہ خدا بھی شاہی اور مطلق العنانی کا خدا تھا۔ وہ کبھی خوش ہو کر انہیں اپنی چہیتی قوم بنالیتا، کبھی جوش وانتقام میں آکر بربادی و ہلاکت کے حوالے کر دیتا۔ عیسائیوں کا اعتقاد تھا کہ آدم کے گناہ کی وجہ سے اس کی پوری نسل مغضوب ہو گئی اور جب تک خدا نے اپنی صفت ابنیت کو بشکل مسیح (علیہ السلام) قربان نہیں کر دیا، اس کے نسلی گناہ اور مغضوبیت کا کفارہ نہ ہو سکا۔

مجازات عمل کا معاملہ بھی دنیا کے عالمگیر قانون فطرت کا ایک گوشہ ہے

لیکن قرآن نے جزا وسزا کا اعتقاد ایک دوسری ہی شکل ونوعیت کا پیش کیا ہے۔ وہ اسے خدا کا کوئی ایسا فعل نہیں قرار دیتا جو کائنات ہستی کے عام قوانین ونظام سے الگ ہو، بلکہ اسی کا ایک قدرتی گوشہ قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے: کائنات ہستی کا عالمگیر قانون یہ ہے کہ ہر حالت کوئی نہ کوئی اثر رکھتی ہے اور ہر چیز کا کوئی نہ کوئی خاصہ ہے۔ ممکن نہیں یہاں کوئی شے اپنا وجود رکھتی ہو اور اثرات ونتائج کے سلسلہ سے باہر ہو۔ پس جس طرح خدا نے اجسام ومواد میں خواص ونتائج رکھے ہیں، اسی طرح اعمال میں بھی خواص ونتائج ہیں۔ اور جس طرح جسم انسانی کے قدرتی انفعالات ہیں، اسی طرح روح انسانی کے لئے بھی قدرتی انفعالات ہیں۔ جسمانی موثرات جسم پر مرتب ہوتے ہیں، معنوی موثرات سے روح متاثر ہوتی ہے۔ اعمال کے یہی قدرتی خواص ونتائج ہیں جنہیں جزا وسزا سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اچھے عمل کا نتیجہ اچھائی ہے اور یہ ثواب ہے۔ برے عمل کا نتیجہ برائی ہے اور یہ عذاب ہے۔ ثواب اور عذاب کے ان اثرات کی نوعیت کیا ہوگی؟ وحی الٰہی نے ہماری فہم واستعداد کے مطابق اس کا نقشہ کھینچا ہے۔ اس نقشہ میں ایک مرقع بہشت کا ہے، ایک دوزخ کا۔ بہشت کے نعائم ان کے لئے ہیں جن کے اعمال بہشتی ہوں گے۔ دوزخ کی عقوبتیں ان کے لئے ہیں جن کے اعمال دوزخی ہوں گے۔

لَا يَسْتَوِيْٓ اَصْحٰبُ النَّارِ وَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ؕ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ۝ (۵۹:۲۰)

اصحاب جنت اور اصحاب دوزخ [۵۴] (اپنے اعمال ونتائج میں) یکساں نہیں ہو سکتے۔ کامیاب انسان وہی ہیں جو اصحاب جنت ہیں!

جس طرح مادیات میں خواص ونتائج ہیں اسی طرح معنویات میں بھی ہیں

وہ کہتا ہے: تم دیکھتے ہو کہ فطرت ہر گوشہ وجود میں اپنا قانون مکافات رکھتی ہے۔ ممکن نہیں کہ اس میں تغیر یا تساہل ہو۔ فطرت نے آگ میں خاصہ رکھا ہے کہ جلائے۔ اب سوزش

وتپش فطرت کی وہ مکافات ہوگئی جو ہر اس انسان کے لئے ہے جو آگ کے شعلوں میں ہاتھ ڈال دے گا۔ ممکن نہیں کہ آگ میں کودو اور اس فعل کے مکافات سے بچ جاؤ۔ پانی کا خاصہ ٹھنڈک اور رطوبت ہے۔ یعنی ٹھنڈک اور رطوبت وہ مکافات ہے جو فطرت نے پانی میں ودیعت کر دی ہے۔ اب ممکن نہیں کہ تم دریا میں اترو اور اس مکافات سے بچ جاؤ۔ پھر جو فطرت کائنات ہستی کی ہر چیز اور ہر حالت میں مکافات رکھتی ہے، کیونکر ممکن ہے کہ انسان کے اعمال کے لئے مکافات نہ رکھے؟ یہی مکافات جزا وسزا ہے۔

آگ جلاتی ہے، پانی ٹھنڈک پیدا کرتا ہے، سنکھیا کھانے سے موت، دودھ سے طاقت آتی ہے، کونین سے بخار رک جاتا ہے۔ جب اشیاء کی ان تمام مکافات پر تمہیں تعجب نہیں ہوتا، کیونکہ یہ تمہاری زندگی کی یقینیات ہیں تو پھر اعمال کے مکافات پر کیوں تعجب ہوتا ہے؟ افسوس تم پر! تم اپنے فیصلوں میں کتنے ناہموار ہو۔

تم گیہوں بوتے ہو اور تمہارے دل میں کبھی یہ خدشہ نہیں گزرتا کہ گیہوں پیدا نہیں ہو گا۔ اگر کوئی تم سے کہے کہ ممکن ہے گیہوں کی جگہ جوار پیدا ہو جائے تو تم اسے پاگل سمجھو گے کیوں؟ اس لئے کہ فطرت کے قانون مکافات کا یقین تمہاری طبیعت میں راسخ ہو گیا ہے۔ تمہارے وہم وگمان میں بھی یہ خطرہ نہیں گزر سکتا کہ فطرت گیہوں لے کر اس کے بدلے میں جوار دے دے گی۔ اتنا ہی نہیں، بلکہ تم یہ بھی نہیں مان سکتے کہ اچھے قسم کا گیہوں لے کر برے قسم کا گیہوں دے گی، تم جانتے ہو کہ وہ بدلا دینے میں قطعی اور شک وشبہ سے بالاتر ہے۔ پھر بتاؤ! جو فطرت گیہوں کے بدلے گیہوں اور جوار کے بدلے جوار دے رہی ہے، کیونکر ممکن ہے کہ اچھے عمل کے بدلے اچھا اور برے عمل کے بدلے برا نتیجہ نہ رکھتی ہو؟

اَمۡ حَسِبَ الَّذِيۡنَ اجۡتَرَحُوا السَّيِّاٰتِ اَنۡ نَّجۡعَلَهُمۡ كَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَوَآءً مَّحۡيَاهُمۡ وَمَمَاتُهُمۡ ؕ سَآءَ مَا يَحۡكُمُوۡنَ ۝ وَخَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ بِالۡحَقِّ وَلِتُجۡزٰى كُلُّ نَفۡسٍۢ بِمَا كَسَبَتۡ وَهُمۡ لَا يُظۡلَمُوۡنَ ۝ (۴۵:۲۱-۲۲)

جو لوگ برائیاں کرتے ہیں، کیا وہ سمجھتے ہیں ہم انہیں ان لوگوں جیسا کر دیں گے جو ایمان رکھتے ہیں اور جن کے اعمال اچھے ہیں؟ دونوں برابر ہو جائیں زندگی میں بھی اور موت میں بھی؟ (اگر ان لوگوں کی فہم و دانش کا یہی فیصلہ ہے تو) افسوس ان کے فیصلے پر! اور اللہ نے آسمان و زمین کو (بے کار اور عبث نہیں بنایا ہے، بلکہ) حکمت و مصلحت کے ساتھ بنایا ہے اور اس لئے بنایا ہے کہ ہر جان کو اس کی کمائی کے مطابق بدلا ملے، اور یہ بدلا ٹھیک ملے گا، کسی پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔

چنانچہ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے جزا و سزا کے لئے ''الدین'' کا لفظ اختیار کیا، کیونکہ مکافات عمل کا مفہوم ادا کرنے کے لئے سب سے زیادہ موزوں لفظ یہی تھا۔

اصطلاح قرآنی میں ''کسب''

اور پھر یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں اس نے اچھے برے کام کرنے کو جا بجا ''کسب'' کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ ''کسب'' کے معنی عربی میں ٹھیک وہی ہیں جو اردو میں کمائی کے ہیں، یعنی ایسا کام جس کے نتیجے سے تم کوئی فائدہ حاصل کرنا چاہو، اگرچہ فائدے کی جگہ نقصان بھی ہو جائے۔ مطلب یہ ہوا کہ انسان کے لئے جزا اور سزا خود انسان ہی کی کمائی ہے جیسی کسی کی کمائی ہوگی ویسا ہی نتیجہ پیش آئے گا۔ اگر ایک انسان نے اچھے کام کر کے اچھی کمائی کر لی ہے تو اس کے لئے اچھائی ہے۔ اگر کسی نے برائی کر کے برائی کمائی ہے تو اس کے لئے برائی ہے:

كُلُّ امْرِئٍۢ بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ ○ (۲۱:۵۲)

ہر انسان اس نتیجے کے ساتھ جو اس کی کمائی ہے، بندھا ہوا ہے۔

سورہ بقرہ میں جزا و سزا کا قاعدہ کلیہ بتا دیا۔

لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ؕ (۲:۲۸۶)

(ہر انسان کے لئے وہی ہے جیسی کچھ اس کی کمائی ہوگی) جو کچھ اسے پانا ہے وہ بھی اس کی کمائی ہے اور جس کے لئے اسے جواب دہ ہونا ہے وہ بھی اس کی کمائی ہے۔

اسی طرح قوموں اور جماعتوں کی نسبت بھی ایک عام قاعدہ بتادیا۔

تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُم مَّا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝ (۲:۱۳۴)

یہ ایک امت تھی جو گزر چکی۔ اس کے لئے وہ نتیجہ تھا جو اس نے کمایا اور تمہارے لئے وہ نتیجہ ہے جو تم کماؤ گے۔ تم سے اس کی پوچھ گچھ نہیں ہوگی کہ ان لوگوں کے اعمال کیسے تھے۔

علاوہ بریں صاف صاف لفظوں میں جابجا یہ حقیقت واضح کردی کہ اگر دین الٰہی نیک عملی کی ترغیب دیتا ہے اور بدعملی سے روکتا ہے تو یہ صرف اس لئے ہے کہ انسان نقصان وہلاکت سے بچے اور نجات وسعادت حاصل کرے۔ یہ بات نہیں ہے کہ خدا کا غضب وقہر اسے عذاب دینا چاہتا ہو اور اس سے بچنے کے لئے مذہبی ریاضتوں اور عبادتوں کی ضرورت ہو۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهِ وَمَنْ أَسَاءَ فَعَلَيْهَا ۗ وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيدِ ۝ (۴۱:۴۶)

جس کسی نے نیک کام کیا تو اپنے لئے کیا اور جس کسی نے برائی کی تو خود اسی کے آگے آئے گی۔ اور ایسا نہیں ہے کہ تمہارا پروردگار اپنے بندوں کے لئے ظلم کرنے والا ہو۔

ایک مشہور حدیث قدسی میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

یاعبادی! لوان اولکم وآخرکم وانسکم وجنکم کانوا علی اتقی قلب رجل واحد منکم، مازاد فی ملکی شیئا ، یا عبادی!لوان اولکم وآخرکم وانسکم وجنکم کانو اعلی افجر قلب رجل واحد منکم، ما نقص ذلک من ملکی شیئا یاعبادی! لوان اولکم وآخر کم وانسکم و جنکم قاموا فی صعید واحد فسالونی فاعطیت کل

انسان مسالته، مانقص ذلك مما عندی الا كما ينقص المخيط اذا ادخل البحر. يا عبادی انما هی اعمالكم احصيها لكم ثم اوفيكم اياها. فمن وجد خيرا فليحمد الله، ومن وجد غير ذلك فلا يلومن الا نفسه (مسلم عن ابی ذر)۔[55]

اے میرے بندو! اگر تم میں سے سب انسان جو پہلے گزر چکے اور وہ سب جو بعد کو پیدا ہوں گے اور تمام انس اور تمام جن اس شخص کی طرح نیک ہو جاتے جو تم میں سب سے زیادہ متقی ہے تو یاد رکھو! اس سے میری خداوندی میں کچھ بھی اضافہ نہ ہوتا۔ اے میرے بندو! اگر وہ سب جو پہلے گزر چکے اور وہ سب جو بعد کو پیدا ہوں گے اور تمام انس اور تمام جن اس شخص کی طرح بدکار ہو جاتے جو تم میں سب سے بدکار ہے تو اس سے میری خداوندی میں کچھ بھی نقصان نہ ہوتا۔ اے میرے بندو! اگر وہ سب جو پہلے گزر چکے اور وہ سب جو بعد کو پیدا ہوں گے ایک مقام پر جمع ہو کر مجھ سے سوال کرتے اور میں ہر انسان کو اس کی منہ مانگی مراد بخش دیتا تو میری رحمت وبخشش کے خزانے میں اس سے زیادہ کمی نہ ہوتی جتنی کمی سوئی کے ناکے جتنا پانی نکل جانے سے سمندر میں ہو سکتی ہے۔

اے میرے بندو! یاد رکھو! یہ تمہارے اعمال ہی ہیں جنہیں میں تمہارے لئے انضباط اور نگرانی میں رکھتا ہوں اور پھر انہیں کے نتائج بغیر کسی کمی بیشی کے تمہیں واپس دے دیتا ہوں۔ پس جو کوئی تم میں اچھائی پائے چاہیے کہ اللہ کی حمد وثنا کرے۔ اور جس کسی کو برائی پیش آئے تو چاہئے کہ خود اپنے وجود کے سوا اور کسی کو ملامت نہ کرے۔

یہاں یہ خدشہ کسی کے دل میں واقع نہ ہو کہ خود قرآن نے بھی جابجا خدا کی خوشنودی اور نارضامندی کا ذکر کیا ہے۔ بلاشبہ کیا ہے! اتنا ہی نہیں بلکہ وہ انسان کی نیک عملی کا اعلیٰ درجہ یہی قرار دیتا ہے کہ جو کچھ کرے، صرف اللہ کی خوشنودی ہی کے لئے کرے۔ لیکن خدا کے جس رضا وغضب کا وہ اثبات کرتا ہے، وہ جزا وسزا کی علت نہیں، بلکہ جزا وسزا کا قدرتی نتیجہ ہے، یعنی

یہ نہیں کہتا کہ جزا وسزا محض خدا کی خوشنودی اور ناراضی کا نتیجہ ہے، نیک و بداعمال کا نتیجہ نہیں ہے، بلکہ وہ کہتا ہے جزا وسزا تمام انسان کے اعمال کا نتیجہ ہے اور خدا نیک عملی سے خوشنود ہوتا ہے، بد عملی ناپسند کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ تعلیم قدیم اعتقاد سے نہ صرف مختصر ہے، بلکہ یکسر متضاد ہے۔

بہر حال جزا وسزا کی اس حقیقت کے لئے ''الدین'' کا لفظ نہایت موزوں لفظ ہے اور ان تمام گمراہیوں کی راہ بند کر دیتا ہے جو اس بارے میں پھیلی ہوئی تھیں۔ سورہ فاتحہ میں مجرد اس لفظ کے استعمال نے جزا وسزا کی اصلی حقیقت آشکارا کر دی۔

الدین بمعنی قانون و مذہب

ثانیاً، یہی وجہ ہے کہ مذہب اور قانون کے لئے بھی ''الدین'' کا لفظ استعمال کیا گیا، کیونکہ مذہب کا بنیادی اعتقاد ہی مکافات عمل کا اعتقاد ہے اور قانون کی بنیاد بھی تعزیر و سیاست پر ہے۔ سورہ یوسف میں جہاں یہ واقعہ بیان کیا ہے کہ حضرت یوسف (علیہ السلام) نے اپنے چھوٹے بھائی کو اپنے پاس روک لیا تھا، وہاں فرمایا:

مَا كَانَ لِيَأْخُذَ اَخَاهُ فِيْ دِيْنِ الْمَلِكِ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ (۷۶:۱۲)

یہاں بادشاہ مصر کے دین سے مقصود اس کا قانون ہے۔

''مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ'' میں عدالت الٰہی کا اعلان ہے

ثالثاً یہاں ربوبیت اور رحمت کے بعد صفات قہر وجلال میں سے کسی صفت کا ذکر نہیں کیا گیا، بلکہ ''مالک یوم الدین'' کی صفت بیان کی گئی جس سے عدالت الٰہی کا تصور ہمارے ذہن میں پیدا ہو جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ قرآن نے خدا کی صفات کا جو تصور قائم کیا ہے اس میں قہر وغضب کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ البتہ عدالت ضرور ہے اور صفات قہر یہ جس قدر بیان کی گئی ہیں، دراصل اسی کے مظاہر ہیں[۵۶]

فی الحقیقت صفات الٰہی کے تصور کا یہی مقام ہے جہاں فکر انسانی نے ہمیشہ ٹھوکر کھائی۔ یہ ظاہر ہے کہ فطرت کائنات، ربوبیت و رحمت کے ساتھ اپنے مجازات بھی رکھتی ہے اور اگر

ایک طرف اس میں پرورش و بخشش ہے تو دوسری طرف مواخذہ و مکافات بھی ہے۔ فکر انسانی کے لئے فیصلہ طلب سوال یہ تھا کہ فطرت کے مجازات اس کے قہر و غضب کا نتیجہ ہیں یا عدل و قسط کے؟ اس کا فکر نارسا عدل و قسط کی حقیقت معلوم نہ کر سکا۔ اس نے مجازات کو قہر و غضب پر محمول کر لیا اور یہیں سے خدا کی صفات میں خوف و دہشت کا تصور پیدا ہو گیا حالانکہ اگر وہ فطرت کائنات کو زیادہ قریب ہو کر دیکھ سکتا تو معلوم کر لیتا کہ جن مظاہر کو قہر و غضب پر محمول کر رہا ہے، وہ قہر و غضب کا نتیجہ نہیں ہیں، بلکہ عین مقتضاء رحمت ہیں۔ اگر فطرت کائنات میں مکافات کا مواخذہ نہ ہوتا یا تعمیر کی تحسین و تکمیل کے لئے تخریب نہ ہوتی تو میزان عدل قائم نہ رہتا اور تمام نظام ہستی درہم برہم ہو جاتا۔

کارخانہ ہستی کے تین معنوی عناصر۔ ربوبیت، رحمت، عدالت

رابعاً جس طرح کارخانہ خلقت اپنے وجود و بقا کے لئے ربوبیت اور رحمت کا محتاج ہے، اسی طرح عدالت کا بھی محتاج ہے۔ یہی تین معنوی عنصر ہیں جن سے خلقت و ہستی کا قوام ظہور میں آیا ہے۔ ربوبیت پرورش کرتی ہے، رحمت افادہ و فیضان کا سرچشمہ ہے اور عدالت سے بناؤ اور خوبی ظہور میں آتی اور نقصان و فساد کا ازالہ ہوتا ہے۔

تعمیر و تحسین کے تمام حقائق دراصل عدل و توازن کا نتیجہ ہیں

تم نے ابھی ربوبیت اور رحمت کے مقامات کا مشاہدہ کیا ہے۔ اگر ایک قدم آگے بڑھو تو اسی طرح عدالت کا مقام بھی نمودار ہو جائے۔ تم دیکھو گے کہ اس کارخانہ ہستی میں بناؤ، سلجھاؤ، خوبی اور جمال میں سے جو کچھ بھی ہے، اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ عدل و توازن کی حقیقت کا ظہور ہے۔ ایجاب و تعمیر کو تم اس کی بے شمار شکلوں میں دیکھتے ہو اور اس لئے بے شمار ناموں سے پکارتے ہو، لیکن اگر حقیقت کا سراغ لگاؤ تو دیکھ لو کہ ایجابی حقیقت یہاں صرف ایک ہی ہے اور وہ عدل و اعتدال ہے۔

"عدل" کے معنی ہیں برابر ہونا، زیادہ نہ ہونا۔ اسی لئے معاملات اور قضایا میں فیصلہ کر دینے کو عدالت کہتے ہیں کہ حاکم دو فریقوں کی باہم دگر زیادتیاں دور کر دیتا ہے۔ ترازو کی

تول کو بھی معادلت کہتے ہیں، کیونکہ وہ دونوں پلوں کا وزن برابر کر دیتا ہے۔ یہی عدالت جب اشیاء میں نمودار ہوتی ہے تو ان کی کمیت اور کیفیت میں تناسب پیدا کر دیتی ہے۔ ایک جزء کا دوسرے جزء سے کمیت یا کیفیت میں مناسب و موزوں ہونا عدالت ہے۔

اب غور کرو! کارخانۂ ہستی میں بناؤ اور خوبی کے جس قدر مظاہر ہیں کس طرح اسی حقیقت سے ظہور میں آئے ہیں۔ وجود کیا ہے؟ حکیم بتلاتا ہے کہ عناصر کی ترکیب کا اعتدال ہے۔ اگر اس اعتدالی حالت میں ذرا بھی فتور واقع ہو جائے، وجود کی نمود معدوم ہو جائے۔ جسم کیا ہے؟ جسمانی مواد کی ایک خاص اعتدالی حالت ہے۔ اگر اس کا کوئی ایک جزء بھی غیر معتدل ہو جائے، جسم کی ہیئت ترکیبی بگڑ جائے۔ صحت و تندرستی کیا ہے؟ اخلاط کا اعتدال ہے۔ جہاں اس کا قوام بگڑا، صحت میں انحراف ہو گیا۔ حسن و جمال کیا ہے؟ تناسب و اعتدال کی ایک کیفیت ہے۔ اگر انسان میں ہے تو خوب صورت انسان ہے۔ نباتات میں ہے تو پھول ہے، عمارت میں ہے تو تاج محل ہے۔ نغمہ کی حلاوت کیا ہے؟ سروں کی ترکیب کا تناسب و اعتدال۔ اگر ایک سر بھی بے میل ہوا، نغمے کی کیفیت جاتی رہی۔

پھر کچھ اشیاء و اجسام ہی پر موقوف نہیں، کارخانۂ ہستی کا تمام نظام ہی عدل و توازن پر قائم ہے۔ اگر ایک لمحہ کے لئے یہ حقیقت غیر موجود ہو جائے تو تمام نظام عالم درہم برہم ہو جائے۔ یہ کیا بات ہے کہ نظام شمسی کا ہر کرہ اپنی اپنی جگہ معلق ہے، اپنے اپنے دائروں میں حرکت کر رہا ہے اور ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ ذرا بھی انحراف و میلان واقع ہو؟ یہی عدالت کا قانون ہے جس نے سب کو ایک خاص نظم کے ساتھ جکڑ بند کر رکھا ہے۔ تمام کرے اپنی اپنی کشش رکھتے ہیں اور ان کے مجموعی جذب و انجذاب کے توازن سے ایسی حالت پیدا ہو گئی ہے کہ ہر کرہ اپنی جگہ قائم و معلق ہے۔ اگر کوئی کرہ اس قانون عدالت سے باہر ہو جائے تو معاً دوسرے کروں سے ٹکرا جائے اور تمام نظام شمسی مختل ہو جائے۔

اعداد کے تناسب کی عظیم الشان صداقت جس پر ریاضی اور حساب کے تمام حقائق کا دار و مدار ہے، کیا ہے؟ یہی عدل و تعادل کی حقیقت ہے۔ جس دن یہ حقیقت ذہن انسانی پر کھلی

تھی، علوم و معارف کے تمام دروازے باز ہو گئے تھے۔

وضع میزان

چنانچہ قرآن نے اس حقیقت کی طرف جابجا اشارات کیے ہیں:

وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيزَانَ ○ أَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيزَانِ ○

(۵۵:۷۔۸)

اور اس نے آسمان کو بلند کر دیا اور (اجرام سماویہ کے قیام کے لئے قانون عدالت کا) میزان بنا دیا (تاکہ تم تولنے میں کمی بیشی نہ کرو[۵۷]

یہ ''الْمِيزَان'' یعنی ترازو کیا ہے؟ تعادل و توازن کا قانون ہے جو تمام اجرام سماویہ کو ان کی مقررہ جگہ میں تھامے ہوئے ہے اور کبھی ایسا نہیں ہو سکتا کہ اس کے توازن کا پلا کسی ایک طرف کو جھک پڑے۔ اجرام سماویہ کا یہی وہ غیر مرئی ستون ہے جس کی نسبت سورہ رعد میں فرمایا:

اَللّٰهُ الَّذِیْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَیْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا (۱۳:۲)

اللہ جس نے آسمانوں کو (یعنی اجرام سماویہ کو) بغیر ستون کے بلند کر دیا ہے اور تم (اس کی یہ حکمت) دیکھ رہے ہو!

اور سورہ لقمان میں بھی اسی کی طرف اشارہ کیا ہے:

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ بِغَیْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا (۳۱:۱۰)

اس نے آسمانوں کو (یعنی اجرام سماویہ کو) پیدا کر دیا اور تم دیکھ رہے ہو کہ کوئی ستون انہیں تھامے ہوئے نہیں ہے۔

یہ کہنا ضروری نہیں کہ عدل و تعادل کی حقیقت سمجھانے کے لئے میزان یعنی ترازو سے بہتر کوئی عام فہم اور دل نشین تعبیر نہیں ہو سکتی تھی۔

اسی طرح سورہ آل عمران کی مشہور آیت شہادت میں قَآئِمًا بِالْقِسْطِ (۳:۱۸) کہہ کر اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے، یعنی کائنات خلقت میں اس کے تمام کام عدالت کے ساتھ قائم ہیں اور اس نے قیام ہستی کے لئے یہی قانون ٹھہرا دیا ہے۔

اعمالِ انسانی کا عدل وقسط پر مبنی ہونا قرآن کی اصطلاح میں "عمل صالح" ہے

قرآن کہتا ہے: جب عدالت کا یہ قانون کائنات خلقت کے ہر گوشے میں نافذ ہے تو کیونکر ممکن ہے کہ انسان کے افکار واعمال کے لئے بے اثر ہو جائے! پس اس گوشے میں بھی وہی عمل مقبول ہوتا ہے جو افراط وتفریط اور میل وانحراف کی جگہ فطرت کے عدل وقسط پر مبنی ہوتا ہے۔ اور اسی کو وحی الٰہی "عمل صالح" کے نام سے تعبیر کرتی ہے۔ اگر تعمیر و جمال کے سینکڑوں ناموں سے تمہیں مغالطہ نہیں ہوتا اور یہ بات پالیتے ہو کہ ان سب میں اصل حقیقت ایک ہی ہے اور وہ عدالت ہے تو اس گوشے میں ایمان وعمل کی اصطلاح سے تمہیں کیوں توحش ہو اور کیوں بے تحاشا انکار کر بیٹھو؟

اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ۝ (۸۳:۳)

کیا یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اللہ کا ٹھہرایا ہوا دین چھوڑ کر کوئی دوسرا دین تلاش کریں؟ حالانکہ آسمان اور زمین میں جو کوئی بھی ہے سب اسی کے حکم کی اطاعت کر رہے ہیں، خوشی سے ہو یا ناخوشی سے مگر سب کے لئے چلنا اسی کے ٹھہرائے ہوئے قانون پر ہے) اور آخر کار سب اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔

بدعملی کے لئے قرآن کے اختیارات لغویہ

یہی وجہ ہے کہ قرآن نے بدعملی اور برائی کے لئے جتنی تعبیرات اختیار کی ہیں سب ایسی ہیں کہ اگر ان کے معانی پر غور کیا جائے تو عدل وتوازن کی ضد اور مخالف ثابت ہوں گی۔ گویا قرآن کے نزدیک برائی کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ حقیقت عدل سے انحراف ہو، مثلاً ظلم، طغیان، اسراف، تبذیر، افساد، اعتداء، عدوان وغیر ذلک۔

"ظلم" کے معنی "وضع الشیء فی غیر موضعه" کے ہیں، یعنی جو بات جس جگہ ہونی چاہیے وہاں نہ ہو، بے محل ہو تو لغت میں اس حالت کو "ظلم" کہیں گے۔ اسی لئے قرآن نے شرک کو "ظلم عظیم" کہا ہے، کیونکہ اس سے زیادہ کوئی بے محل بات نہیں ہوسکتی۔ اور یہ ظاہر ہے کہ

کسی چیز کا اپنی صحیح جگہ میں نہ ہونا، ایک ایسی حالت ہے جو حقیقت عدل کے عین منافی ہے۔

''طغیان'' کے معنی ہیں کسی چیز کا اپنی حد سے گزر جانا۔ دریا کا پانی اپنی حد سے بلند ہو جاتا ہے تو کہتے ہیں: طغی الماء، ظاہر ہے کہ حد سے تجاوز عین عدالت کی ضد ہے۔

''اسراف'' ''سرف'' سے ہے'' کے معنی یہ ہیں کہ جو چیز جتنی مقدار میں جہاں خرچ کرنی چاہئے، اس سے زیادہ خرچ کر دی جائے۔

''تبذیر'' کے معنی کسی چیز کو ایسی جگہ خرچ کرنا ہے جہاں خرچ نہیں کرنا چاہئے ''اسراف'' اور ''تبذیر'' میں مقدار اور محل کا فرق ہوا۔ کھانے میں خرچ کرنا خرچ کا صحیح محل ہے، لیکن اگر ضرورت سے زیادہ خرچ کیا جائے تو یہ اسراف ہو گا۔ دریا میں روپیہ پھینک دینا روپیہ خرچ کرنے کا صحیح محل نہیں ہے۔ اگر تم روپیہ پانی میں پھینک دو تو یہ فعل تبذیر ہو گا۔ دونوں صورتیں عدالت کے منافی ہیں کیونکہ حقیقت عدل، مقدار اور محل دونوں میں تناسب چاہتی ہے۔

''فساد'' کے معنی ہی ''خروج الشیء عن الاعتدال'' کے ہیں، یعنی کسی چیز کا حالت اعتدال سے باہر ہو جانا۔

''اعتداء'' اور ''عدوان'' ایک ہی مادہ سے ہیں اور دونوں کے معنی حد سے گزر جانا ہے۔

قرآن اور صفاتِ الٰہی کا تصور

قرآن نے خدا کی صفات کا جو تصور قائم کیا ہے، سورۂ فاتحہ اس کی سب سے پہلی رونمائی ہے۔ ہم اس مرقع میں وہ شبیہ دیکھ سکتے ہیں جو قرآن نے نوعِ انسانی کے سامنے پیش کی ہے یہ ربوبیت، رحمت اور عدالت کی شبیہہ ہے۔ انہیں تین صفتوں کے تفکر سے ہم اس کے تصورِ الٰہی کی معرفت حاصل کر سکتے ہیں۔

خدا کا تصور ہمیشہ انسان کی روحانی و اخلاقی زندگی کا محور رہا ہے۔ یہ بات کہ مذہب کا معنوی اور نفسیاتی مزاج کیسا ہے، اور وہ اپنے پیروؤں کے لئے کس طرح کے اثرات رکھتا ہے، صرف یہ بات دیکھ کر معلوم کر لی جا سکتی ہے کہ اس کے تصورِ الٰہی کی نوعیت کیا ہے[۵۸]

انسان کا ابتدائی تصور

جب ہم انسان کے تصوراتِ الوہیت کا ان کے مختلف عہدوں میں مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں ان کے تغیرات کی رفتار کچھ عجیب طرح کی دکھائی دیتی ہے[۵۹] اور تعلیل و توجیہ کے عام اصول کام نہیں دیتے۔ موجوداتِ خلقت کے ہر گوشے میں تدریجی ارتقاء (Evolution) کا قانون کام کرتا رہا ہے اور انسان کا جسم و دماغ بھی اس سے باہر نہیں۔ جس طرح انسان کا جسم بتدریج ترقی کرتا ہوا نچلی کڑیوں سے اونچی کڑیوں تک پہنچا، اسی طرح اس کے دماغی تصورات بھی نچلے درجوں سے بلند ہوتے ہوتے بتدریج اونچے درجوں تک پہنچے، لیکن جہاں تک خدا کی ہستی کے تصورات کا تعلق ہے، معلوم ہوتا ہے کہ صورت حال اس سے بالکل برعکس رہی اور ارتقاء کی جگہ ایک طرح کے تنزل اور ارتجاع کا قانون یہاں کام کرتا رہا۔ ہم جب ابتدائی عہد کے انسانوں کا سراغ لگاتے ہیں تو ہمیں ان کے قدم آگے بڑھنے کی جگہ پیچھے ہٹتے دکھائی دیتے ہیں۔

انسانی دماغ کا سب سے زیادہ پرانا تصور جو قدامت کی تاریکی میں چمکتا ہے وہ توحید کا تصور ہے۔ یعنی صرف ایک ان دیکھی اور اعلیٰ ہستی کا تصور جس نے انسان کو اور ان تمام چیزوں کو جنہیں وہ اپنے چاروں طرف دیکھ رہا تھا، پیدا کیا، لیکن پھر اس کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اس جگہ سے اس کے قدم بتدریج پیچھے ہٹنے لگے اور توحید کی جگہ آہستہ آہستہ ''اشراک'' اور تعدد الٰہ'' کا تصور پیدا ہونے لگا، یعنی اب اس ایک ہستی کے ساتھ جو سب سے بالاتر ہے، دوسری قوتیں بھی شریک ہونے لگیں اور ایک معبود کی جگہ بہت سے معبودوں کی چوکھٹوں پر انسان کا سر جھک گیا۔

اگر خدا کے تصور میں وحدت کا تصور انسانی دماغ کا بلند تر تصور ہے اور اشراک اور تعدد کے تصورات نچلے درجے کے تصورات ہیں تو ہمیں اس نتیجہ تک پہنچنا پڑتا ہے کہ یہاں ابتدائی کڑی جو نمایاں ہوئی وہ نچلے درجے کی نہ تھی، اونچے درجے کی تھی اور اس کے بعد جو کڑیاں ابھریں، انہوں نے بلندی کی جگہ پستی کی طرف رخ کیا۔ گویا ارتقاء کا عام قانون یہاں بے اثر ہو گیا، ترقی کی جگہ رجعت کی اصل کام کرنے لگی۔

انیسویں صدی کے نظریے اور ارتقائی مذہب

انیسویں صدی کے علماء اجتماعیات کا عام خیال یہ تھا کہ انسان کے دینی عقائد کی ابتداء ان اوہامی تصورات سے ہوئی جو اس کی ابتدائی معیشت کے طبعی تقاضوں اور احوال وظروف کے قدرتی اثرات سے نشوونما پانے لگے تھے۔ یہ تصورات قانون ارتقاء کے ماتحت درجہ بدرجہ مختلف کڑیوں سے گزرتے رہے اور آخرکار انہوں نے اپنی ترقی یافتہ صورت میں ایک اعلیٰ ہستی اور خالق کل کے عقیدے کی نوعیت پیدا کر لی۔ گویا اس سلسلۂ ارتقاء کی ابتدائی کڑی اوہامی تصورات تھے جن سے طرح طرح کی الٰہی قوتوں کا تصور پیدا ہوا اور پھر اسی تصور نے ترقی کرتے ہوئے خدا کے ایک توحیدی اعتقاد کی شکل اختیار کر لی۔ بے جا نہ ہوگا اگر اختصار کے ساتھ یہاں ان تمام نظریوں پر ایک اجمالی نظر ڈال لی جائے جو اس سلسلے میں یکے بعد دیگرے نمایاں ہوئے اور وقت کے علمی حلقوں کو متاثر کیا۔

دینی عقائد اور تصورات کی تاریخ بہ حیثیت ایک مستقل شاخ علم کے انیسویں صدی کی پیداوار ہے۔ اٹھارھویں صدی کے اواخر میں جب انڈو جرمن (Indo-German) قبائل (یعنی وسط ایشیا کے آریائی قبائل) اور ان کی زبانوں کی تاریخ روشنی میں آئی تو ان کے دینی تصورات بھی نمایاں ہوئے اور اس طرح بحث وتنقید کا ایک نیا میدان پیدا ہو گیا۔ یہی میدان تھا جس کے مباحث نے انیسویں صدی کے اوائل میں بحث ونظر کی ایک مستقل شاخ پیدا کر دی یعنی دینی عقائد کی پیدائش اور ان کے نشوونما کی تاریخ کا علم مدون ہونے لگا۔ اسی دور میں عام خیال یہ تھا کہ خدا پرستی کی ابتداء نیچر متھس (Nature-myths) کے تصورات سے ہوئی، یعنی ان خرافاتی اساطیر سے ہوئی جو مظاہر فطرت کے متعلق بننا شروع ہو گئے تھے۔ مثلاً روشنی کی ایک مستقل ہستی کا تصور پیدا ہو گیا بارش کی قوت نے ایک دیوتا کی شکل اختیار کر لی۔ قدیم آریائی تصورات سے جو مظاہرِ فطرت کی پرستش پر مبنی تھے اس خیال کا مواد فراہم ہوا تھا۔

لیکن انیسویں صدی کے نصف ابتدائی دور میں جب افریقہ اور امریکہ کے وحشی قبائل کے حالات روشنی میں آئے تو ان کے دینی تصورات کی تحقیقات نے ایک نئے نظریئے کا سامان فراہم کر دیا۔ سنہ ۱۷۶۰ء میں ڈی بروسے (De Brosses) نے انہیں وحشی قبائل کے تصورات سے فیٹش ورشپ (Fetish-worship) کا استنباط کیا تھا، یعنی ایسی اشیاء کی پرستش کا جن سے کسی جنی روح کی وابستگی یقین کی جاتی تھی۔ اب پھر سنہ ۱۸۰۱ء میں اے۔ کامٹ (A. Comte) نے اسی پرستش سے خدا پرستی کی پیدائش کا نظریہ اختیار کیا اور سر جان لبک (Sir John Lubbofk) نے (جو آگے چل کر لارڈ اویبری (Lord Avebury) کے لقب سے مشہور ہوا) اسے مزید بحث و نظر کا جامہ پہنایا۔ اس نظریے کا اس عہد میں عام طور پر استقبال کیا گیا تھا اور وقت کے علمی حلقوں کی قبولیت اس نے حاصل کر لی تھی۔

تقریباً اس عہد میں مین ازم (Manism) یعنی اجداد پرستی کے نظریے نے سر اٹھایا اس نظریے کی بنیاد اس قیاس پر رکھی گئی تھی کہ انسان کو آباء و اجداد کی محبت وعظمت نے پہلے ان کی پرستش کی راہ دکھائی، پھر اسی پرستش نے قانون ارتقاء کے ماتحت ترقی کر کے خدا پرستی

کی نوعیت پیدا کرلی۔صحرانشین اور چراگاہوں کی جستجو کرنے والے قبیلوں کے ابتدائی تصورات میں اجداد پرستی کا ذہنی مواد موجود تھا۔چین کی قدیم تاریخ میں بھی اس پرستش کا سراغ بہت دور تک ملنے لگا تھا۔اس لئے اس نئے نظریے کے لئے ضروری مواد فراہم ہوگیا اور سنہ ۱۸۷۰ء میں جب ہربرٹ (Herbert Spencer) نے اپنے آسیبی نظریے (Ghost-theory) کی بنیاد اسی تخیل پر استوار کی تو وقت کے فلسفیوں اور اجتماعیات کے عالموں کے حلقے میں اس نے فوراً مقبولیت پیدا کرلی۔

اسی عہد میں دوسرا نظریہ بھی بروئے کار آیا اور اس نے غیر معمولی مقبولیت حاصل کرلی۔ یہ ای۔بی۔ٹیلر (E.B.Tylor) کا اینمزم (Animism) کا نظریہ تھا۔سنہ ۱۸۷۱ء میں اس نے اپنی مشہور کتاب پری می ٹیو کلچر (Primitive Culture) شائع کی اور اس میں دینی عقائد کی کم از کم تعریف اینمزم کے ذریعے کی۔اینمزم سے مقصود یہ ہے کہ انسان کے تصورات میں اس کی جسمانی زندگی کے علاوہ ایک مستقل روحانی زندگی کا تصور بھی پیدا ہوجائے۔اس ''مستقل روحانی زندگی'' کا تصور ٹیلر کے نزدیک خدا پرستی اور دینی عقائد کا بنیادی مادہ تھا۔اسی مادہ نے نشوونما پاکر خدا کی ہستی کے عقیدے کی نوعیت پیدا کرلی۔غالباً دینی عقائد کی پیدائش کے تمام نظریوں میں یہ پہلا نظریہ ہے جو علمی طریقے پر پوری طرح مرتب کیا گیا اور بحث ونظر کے تمام اطراف وجوانب منظم اور آراستہ کیے گئے۔چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ وقت کے تمام علمی حلقوں پر اس نظریے نے ایک خاص اثر ڈالا تھا اور عام طور پر اسے ایک مقررہ اور طے شدہ اصل کی شکل میں پیش کیا جانے لگا تھا۔انیسویں صدی کے اختتام تک اس نظریے کا یہ اقتدار بلا استثناء قائم رہا۔

اسی اثناء میں مصر، بابل اور اشوریا کے قدیم آثار وکتبات کے حل سے تاریخ قدیم کا ایک بالکل نیا میدان روشنی میں آنے لگا تھا اور ان آثار کے مباحث نے مستقل علوم کی حیثیت پیدا کرلی تھی۔اس نئے مواد نے مظاہر فطرت کی پرستش کی اصل کو از سر نو اہمیت دے کر ابھار دیا، کیونکہ وادی نیل اور وادی دجلہ وفرات کے یہ دونوں قدیم تمدن دینی عقائد

کے یہی تصورات نمایاں کرتے ہیں۔ چنانچہ اب پھر ایک نیا مذہب (اسکول) پیدا ہو گیا جو خدا پرستی کی پیدائش کی ابتدائی بنیاد مظاہر فطرت کے تاثرات کو قرار دیتا تھا اور خصوصیت کے ساتھ اجرام سماوی کے تاثرات پر زور دیتا تھا۔ اس نظریے کے حامیوں نے اینمزم (Animism) کی مخالفت کی اور ایسٹرل اینڈ نیچر میتھالوجسٹس (Astral and nature mythologiats) کے نام سے مشہور ہوئے۔

لیکن انیسویں صدی کے نصف آخری حصے میں جب کہ یہ تمام نظریے سر اٹھا رہے تھے، دوسری طرف ایک خاص علمی حلقہ ایک دوسرے نظریے کی بنیادیں بھی چن رہا تھا۔ اس نظریے کا مواد قدیم ترین تمدنی عہد کے شکار پیشہ قبائل کے تصورات نے بہم پہنچایا تھا جن کے حالات اب تاریخ کی دسترس سے باہر نہیں رہے تھے۔ یہ نظریہ ٹوٹمزم (Totemism) کے نام سے مشہور ہوا اور بہت جلد اس نے وقت کے علمی حلقوں کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ ٹوٹمزم سے مقصود مختلف اشیاء اور جانوروں کے وہ انتسابات ہیں جو جمعیت بشری کی ابتدائی قبائلی زندگی میں پیدا ہو گئے تھے اور پھر کچھ عرصے کے بعد ان اشیاء اور جانوروں کا غیر معمولی احترام کیا جانے لگا تھا۔ اس نظریے کی رو سے خیال کیا گیا کہ ہندوستان کی گائے، مصر کا مگرمچھ اور بیل، شمالی خطوں کا ریچھ اور صحرا نشین قبائل کا سفید بچھڑا دراصل ٹوٹمزم ہی کے بقایا ہیں۔ سب سے پہلے سنہ ۱۸۸۰ء میں رابرٹسن سمتھ (Robertson Smith) نے اس نظریے کا اعلان کیا تھا۔ پھر وقت کے دوسرے نظار نے بھی اسی رخ پر قدم اٹھایا۔

لیکن کچھ عرصے کے بعد اس نظریے کی مقبولیت مجروح ہونا شروع ہو گئی۔ پروفیسر جے۔ جی۔ فریزر (J.G.Frazer) کا جمع کیا ہوا مواد جب منظر عام پر آیا تو معلوم ہوا کہ ٹوٹمزم (totemism) کے تصورات نہ تو دینی تصورات کی نوعیت رکھتے تھے نہ دینی تصورات کا مبدا بننے کی ان میں صلاحیت تھی۔ ان کی اصلی نوعیت زیادہ سے زیادہ ایک اجتماعی نظام کی تھی جس کے ساتھ طرح طرح کے تصورات کا ایک سلسلہ وابستہ ہو گیا

تھا۔اس سے زیادہ انہیں اس سلسلے میں اہمیت نہیں دی جاسکتی۔

مگراس سلسلے میں معاملہ کا ایک اور گوشہ بھی نمایاں ہوا تھا۔فریزر نے ٹوٹمزم کے تصورات میں ایک خاص قسم ایسی بھی پائی تھی جس میں دینی عقائد کا ابتدائی مواد بننے کی صلاحیت دکھائی دیتی تھی، یعنی وہ قسم جو جادو کے اعتقاد سے تعلق رکھتی ہے۔ بحث ونظر کے اس گوشے نے مفکروں کی ایک بڑی تعداد کو اپنی طرف متوجہ کرلیا اور جادو کا نظریہ علمی حلقوں میں روشناس ہو گیا۔سنہ ۱۸۹۲ء میں ایک امریکی عالم جے۔کے۔کینگ (J.K.Kenneg) اس پہلو پر توجہ دلا چکا تھا۔اب بیسویں صدی کی ابتدائی برسوں میں بیک وقت جرمنی، انگلینڈ، فرانس اور امریکہ کے علمی حلقوں سے اس کی بازگشت شروع ہوگئی اور اینمزم کے خلاف ردِ فعل کام کرنے لگا۔اب یہ خیال عام طور پر پھیل گیا کہ اینمزم کے تصورات سے پیش تر بھی انسانی تصورات کا ایک دور رہ چکا ہے اور یہ ماقبل اینمزم (Pre-animism) دور جادو کے تصورات کا دور تھا۔اسی جادو کے اعمال کے عقیدے نے آگے چل کر روحانی عقائد کی شکل اختیار کرلی اور خدا پرستی اور دینی عقائد کے مبادیات پیدا ہوگئے۔

اب جادو کا نظریہ ایک عام مقبول نظریہ بن گیا اور پچھلے نظریے اپنی جگہ کھونے لگے۔سنہ ۱۸۹۵ء میں آر۔آر۔میرٹ (R.R.Merett) نے، سنہ ۱۹۰۲ء میں ہیوٹ (Hewitt) نے، سنہ ۱۹۰۴ء میں کے پریو (K.Preuss) نے سنہ ۱۹۰۷ء میں اے فیرکنڈٹ (A.vier Kandt) نے اور سنہ ۱۹۰۸ء میں ای۔ایس۔ھارٹ لینڈ (E.S.Hartland) نے اسی نظریے پر اپنے بحث وفکر کی تمام دیواریں اٹھائیں اور اسے دور تک پھیلاتے چلے گئے۔سب سے زیادہ حصہ اس میں فرانس کے علماء اجتماعیات کے اس طبقے نے لیا جو درخیم (Durkheim) کے مسلک نظر سے تعلق رکھتا تھا۔اس طبقے کا زعیم پہلے ایچ۔ہیوبرٹ (H.Hubert) اور ایم۔ماس (M.Mauss) تھا۔پھر سنہ ۱۹۱۲ء میں خود درخیم آگے بڑھا اور اس نظریے کا سب سے بڑا علم بردار بن گیا۔ اس گروہ کی رائے میں ٹوٹمزم (Totemism) اور جادو کے تصورات کا مرکب مجموعہ جیسا کہ وسط آسٹریلیا کے قبائل کے

اوہام میں پایا جاتا ہے، جمعیت بشری کے دینی تصورات کا اصلی مبدا تھا۔قانون ارتقاء کے ماتحت انہیں تصورات نے خداپرستی کے عقائد کی ترقی یافتہ شکل پیدا کرلی۔

اس زمانے کے چند سال بعد بعض پروٹسٹنٹ (Protestant) علماء نے جو دینی عقائد کے نفسیاتی مطالعے میں مشغول تھے، مسئلے پر نفسیاتی نقطہ نگاہ سے نظر ڈالی اور اس نظریے کی حمایت شروع کردی۔ وہ اس طرف گئے کہ خداپرستی کے عقیدے کا مبدا ہمیں مذہب اور سحر کاری دونوں کے مرکب تصورات میں ڈھونڈنا چاہئے۔اس جماعت کا پیش رو آرچ بشپ سوڈربلوم (Soderblom) تھا جس کے مباحث سنہ ۱۹۱۶ء میں شائع ہوئے۔

اس کے بعد کا زمانہ پہلی عالمگیر جنگ کا زمانہ تھا جو بیسویں صدی کا ایک دور ختم کر کے دوسرے دور کا دروازہ کھول رہی تھی۔اس نئے دور نے جہاں علم ونظر کے بہت سے گوشوں کو انقلابی تغیرات سے آشنا کیا، وہاں علم کی اس شاخ میں بھی ایک نیا انقلابی دور شروع ہوگیا۔

یہ تمام پچھلے نظریے مادی مذہب ارتقاء (Evolutioism Materialistic) کی اصل پر مبنی تھے۔ان سب کے اندر یہ بنیادی اصل کام کررہی تھی کہ اجسام ومواد کی طرح انسان کا دینی عقیدہ بھی بتدریج نچلی کڑیوں سے ترقی کرتا ہوا اعلیٰ کڑیوں تک پہنچا ہے۔اور خداپرستی کے عقیدے میں توحید (Monotheism) کا تصور ایک طول طویل سلسلہ ارتقاء کا نتیجہ ہے۔انیسویں صدی کا نصف آخر ڈارونزم (Darwinism) کے شیوع واحاطے کا زمانہ تھا اور بخنر (Buchner)، ویلز (Wells)، اسپنسر (Spencer)، نے اسے اپنے فلسفیانہ مباحث سے انسانی فکروعمل کے تمام دائروں میں پھیلا دیا تھا۔قدرتی طور پر خدا کے اعتقاد کی پیدائش کا مسئلہ بھی اس سے متاثر ہوا اور نظر وبحث کے جتنے قدم اٹھے وہ اسی راہ پر گامزن ہونے لگے۔

مذہب ارتقاء کا خاتمہ اور زمانہ حال کی تحقیقات

لیکن ابھی بیسویں صدی اپنے انقلاب انگیز انکشافوں میں بہت آگے نہیں بڑھی تھی کہ ان تمام نظریوں کی عمارتیں متزلزل ہونا شروع ہوگئیں اور پہلی عالمگیر جنگ کے بعد کے عہد

نے تو انہیں یک قلم منہدم کر دیا۔ اب تمام اہل نظر بالاتفاق دیکھنے لگے کہ اس راہ میں جتنے قدم اٹھائے گئے تھے وہ سرے سے اپنی بنیاد میں ہی غلط تھے، کیونکہ ان سب کی بنیاد قانون ارتقاء کی اصل پر رکھی گئی تھی اور ارتقائی اصل کی رہنمائی یہاں سودمند ہونے کی جگہ گمراہ کن ثابت ہوئی ہے۔ اب انہیں ٹھوس اور ناقابل انکار تاریخی شواہد کی روشنی میں صاف صاف نظر آ گیا کہ انسان کے دینی عقائد کی جس نوعیت کو انہوں نے اعلیٰ اور ترقی یافتہ قرار دیا تھا وہ بعد کے زمانوں کی پیداوار نہیں ہے، بلکہ جمعیت بشری کی سب سے زیادہ پرانی متاع ہے۔ مظاہر فطرت کی پرستش، حیوانی انتسابات کے تصورات، اجداد پرستی کی رسوم اور جادو کے توہمات کی اشاعت سے بھی بہت پہلے جو تصور انسانی دل و دماغ کے افق پر طلوع ہوا تھا، وہ ایک اعلیٰ ترین ہستی کی موجودگی کا بے لاگ تصور تھا، یعنی خدا کی ہستی کا توحیدی اعتقاد تھا۔

چنانچہ اب بحث و نظر کے اس گوشے میں ارتقائی مذہب کا یک قلم خاتمہ ہو چکا تھا۔

ڈبلیو۔ شمٹ (W.schmidt) پروفیسر وائنا یونیورسٹی جنہوں نے اس موضوع پر زمانہ حال کی سب سے بہتر کتاب لکھی ہے، لکھتے ہیں

"علم شعوب وقبائل انسانی کے پورے میدان میں اب پرانا ارتقائی مذہب یکسر دیوالیہ ثابت ہو چکا ہے۔ نشوونما کی مرتب کڑیوں کا وہ خوش نما سلسلہ جو اس مذہب نے پوری آمادگی کے ساتھ تیار کر دیا تھا اب ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا اور نئے تاریخی رجحانوں نے اسے اٹھا کر پھینک دیا ہے"[60]

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:

"اب یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ انسان کے ابتدائی عمران وتمدن کے تصور کی 'اعلیٰ ترین ہستی' فی الحقیقت توحیدی اعتقاد کا خدائے واحد تھا اور انسان کا دینی عقیدہ جو اس سے ظہور پذیر ہوا وہ پوری طرح ایک توحیدی دین تھا یہ حقیقت اب اس درجہ نمایاں ہو چکی ہے کہ ایک سرسری نظر تحقیق بھی اس کے لئے کفایت کرے گی۔ نسل انسانی کے قدیم پستہ قد قبائل میں سے اکثروں کی نسبت یہ بات وثوق کے ساتھ کہی

جاسکتی ہے۔اسی طرح ابتدائی عہد کے جنگلی قبیلوں کے جو حالات روشنی میں آئے ہیں، اور کرنائی (Kurnai) جولین (Julin) اور جنوب مشرقی آسٹریلیا کے یائن (Yuin) قبیلوں کی نسبت جس قدر تاریخی مواد مہیا ہوا ہے، ان سب کی تحقیقات ہمیں اس نتیجے تک پہنچاتی ہے۔آرکٹک (Arctic) تہذیب کے قبیلوں کے روایتی آثار اور شمالی امریکہ کے قبائل کے دینی تصورات کی چھان بین نے بھی آخر کار اسی نتیجے کو نمایاں کیا"۔[1]

زمانہ حال کے نظارے نے اب اس مسئلے کا موسوعاتی (Pantologic) طریق نظر سے مطالعہ کیا ہے اور قدیم معلومات و مباحث کی تمام شاخیں جمع کر کے مجموعی نتائج نکالے ہیں۔ضروری ہے کہ اس سلسلے کی بعض جدید تحقیقات پر ایک سرسری نظر ڈال لی جائے، کیونکہ ابھی وہ اس درجہ شائع نہیں ہوئی ہیں کہ عام طور پر نظر و مطالعے میں آچکی ہوں۔

آسٹریلیا اور جزائر کے وحشی قبائل اور مصر کے قدیم ترین آثار کی جدید تحقیقات

آسٹریلیا اور جزائر بحر محیط کے وحشی قبائل ایک غیر معین قدامت سے اپنی ابتدائی ذہنی طفولیت کی زندگی بسر کرتے رہے۔زندگی و معیشت کی وہ تمام ترقی یافتہ کڑیاں جو عام طور پر انسانی جماعتوں کے ذہنی ارتقاء کا سلسلہ مربوط کرتی ہیں، یہاں یک سر مفقود رہیں۔ابتدائی عہد کی بشری جمعیت کے تمام جسمانی اور دماغی خصائص ان کی قبائلی زندگی میں دیکھ لئے جاسکتے تھے۔ان کے تصور اس درجہ محدود تھے کہ اوہام و خرافات میں بھی کسی طرح کا ارتقائی نظم نہیں پایا جاتا، تاہم ان کا ایک اعتقادی تصور بالکل واضح تھا۔ایک بالاتر ہستی ہے جس نے ان کی زمین اور ان کا آسمان پیدا کیا اور ان کا مرنا اور جینا اسی کے قبضہ و تصرف میں ہے۔مصر کے قدیم باشندوں کی صدائیں آٹھ ہزار برس پیشتر تک کی ہمارے کانوں سے ٹکرا چکی ہیں۔قدیم مصری تصورات کا پورا سلسلہ اپنی عہد بعہد کی تبدیلیوں کے ساتھ ہمارے سامنے ابھر آیا ہے۔ہمیں صاف نظر آرہا ہے کہ ایک خدا کی پرستش کا تصور اس سلسلے میں بعد کو

نہیں ابھرا، بلکہ سلسلے کی سب سے زیادہ پرانی کڑی ہے۔ مصر کے وہ تمام معبود جن کے مرقعوں سے اس کے مشہور عالم ھیکلوں اور مناروں کی دیواریں منقش کی گئی ہیں، اس قدیم ترین عہد میں اپنی کوئی نمود نہیں رکھتے تھے۔ جب صرف ایک ''اوسیریز'' (Osiris) کی ان دیکھی ہستی کا اعتقاد دریائے نیل کی تمام آباد وادیوں پر چھایا ہوا تھا[62]

دجلہ وفرات کی وادیوں کی قدیم آبادیاں اور خدا کی ہستی کا توحیدی تصور

پہلی عالمگیر جنگ کے بعد عراق کے مختلف حصوں میں کھدائی کی جو نئی مہمیں شروع کی گئی تھیں اور جو موجودہ جنگ کی وجہ سے ناتمام رہ گئیں، ان کے انکشافات نے اس مسئلے کے لئے نئی روشنیاں بہم پہنچائی ہیں۔ اب اس بارے میں کوئی شبہ نہیں کیا جاتا کہ دریائے نیل کی طرح دجلہ اور فرات کی وادیوں میں بھی جب انسان نے پہلے پہل اپنے خدا کو پکارا تو وہ بہت سی ہستیوں میں بٹا ہوا نہیں تھا، بلکہ ایک ہی ان دیکھی ہستی کی صورت میں نمایاں ہوا تھا۔ کالڈیا (Chaldea) کے سومیری (Sumerian) اور عکادی (Akadian) قبائل جن انسانی نسلوں کے وارث ہوئے تھے، وہ ''شمس'' یعنی سورج اور ''نانعار'' یعنی چاند کی پرستش نہیں کرتے تھے، بلکہ اس ایک ہی لازوال ہستی کی ''جس نے سورج اور چاند اور تمام چمک دار ستاروں کو بنایا ہے''۔

مہنجو دارو کا خدائے واحد ''اون''

ہندوستان میں مہنجو دارو (Mohenjodaro) کے آثار ہمیں آریاؤں کے عہد ورود سے بھی آگے لے جاتے ہیں۔ ان کے مطالعہ و تحقیق کا کام ابھی پورا نہیں ہوا ہے۔ تاہم ایک حقیقت بالکل واضح ہوگئی ہے۔ اس قدیم ترین انسانی بستی کے باشندوں کا بنیادی تصور توحید الٰہی کا تصور تھا، اصنام پرستانہ تصور نہ تھا۔ وہ اپنے یگانہ خدا کو اون (Oun) کے نام سے پکارتے تھے جس کی مشابہت ہمیں سنسکرت کے لفظ اندوان (Undwan) میں مل جاتی ہے۔ اس یگانہ ہستی کی حکومت سب پر چھائی ہوئی ہے۔ طاقت کی تمام ہستیاں اسی کے ٹھہرائے ہوئے قانون کے ماتحت کام کر رہی ہیں۔ اس کی صفت ویدوکن

(Vedukun) ہے، یعنی ایسی ہستی جس کی آنکھیں کبھی غافل نہیں ہوسکتیں۔

لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ"(۲:۲۵۵)

اللہ کی یگانہ اوران دیکھی ہستی کا قدیم سامی تصور

سامی قبائل کا اصلی سرچشمہ صحرائے عرب کے بعض شاداب علاقے تھے۔جب اس چشمے میں نسل انسانی کا پانی بہت بڑھ جاتا تو اطراف میں پھیلنے لگتا، یعنی قبائل کے جتھے عرب سے نکل کر اطراف وجوانب کے ملکوں میں منتشر ہونے لگتے اور پھر چند صدیوں کے بعد نیا رنگ روپ اور نئے نام اختیار کر لیتے

شاید انسانی قبائل کا انشعاب کرہ ارضی کے دو مختلف حصوں میں بہ یک وقت جاری رہا اور زمانۂ مابعد کی مختلف قوموں اور تمدنوں کا بنیادی مبداء بنا۔صحرائے گوبی کے سرچشمے سے وہ قبائل نکلے جو ہندی یورپی (انڈو یورپین)(Indo-European) آریاؤں کے نام سے پکارے گئے۔صحرائے عرب سے وہ قبائل نکلے جن کا پہلا نام سامی پڑا اور پھر یہ نام بے شمار ناموں کے ہجوم میں گم ہوگیا۔تاریخ کی موجودہ معلومات اس حد تک پہنچ کر رک گئی ہیں اور آگے کی خبر نہیں رکھتیں۔

عرب قبائل کا یہ انشعاب بتدریج مغربی ایشیا اور قریبی افریقہ کے تمام دور دراز حصوں تک پھیل گیا تھا۔فلسطین، شام، مصر، نوبیا، عراق اور سواحل خلیج فارس سب ان کے دائرہ انشعاب میں آگئے تھے۔ عاد، ثمود، عمالقہ، ھکسوس، موابی، آشوری، عکادی، سومیری، عیلامی، آرامی اور عبرانی وغیرھم مختلف مقاموں اور مختلف عہدوں کی قوموں کے نام ہیں۔ مگر دراصل سب ایک ہی قبائلی سرچشمے سے نکلے ہوئے ہیں یعنی عرب سے۔

اب جدید سامی اثریات کے مطالعہ سے جو ان تمام قوموں سے تعلق رکھتی ہیں، ایک حقیقت بالکل واضح ہوگئی ہے، یعنی ان تمام قوموں میں ایک ان دیکھے خدا کی ہستی کا اعتقاد موجود تھا اور وہ ''ال۔الاہ'' یا ''اللہ'' کے نام سے پکارا جاتا تھا۔یہی ''الاہ'' ہے جس نے کہیں ''ایل'' کی صورت اختیار کی، کہیں ''الوہ'' کی اور کہیں ''الاھیا'' کی۔

سرحد حجاز کی وادی عقبہ اور شمالی شام کے راس شمر کے جو آثار گزشتہ جنگ کے بعد منکشف ہوئے، ان سے یہ حقیقت اور زیادہ آشکارا ہوگئی ہے، مگر یہ موقع تفصیل کا نہیں۔

انسان کی پہلی راہ ہدایت کی تھی، گمراہی بعد کو آئی

بہرحال بیسویں صدی کی علمی جستجو اب ہمیں جس طرف لے جارہی ہے وہ انسان کا قدیم ترین توحیدی اور غیر اصنامی اعتقاد ہے۔ اس سے زیادہ اس کے تصورات کی کوئی بات پرانی نہیں۔ اس نے اپنے عہد طفولیت میں ہوش و خرد کی آنکھیں جونہی کھولی تھیں، ایک یگانہ ہستی کا اعتقاد اپنے اندر موجود پایا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ اس کے قدم بھٹکنے لگے اور بیرونی اثرات کی جولانیاں اسے نئی نئی صورتوں اور نئے نئے ڈھنگوں سے آشنا کرنے لگیں۔ اب ایک سے زیادہ مافوق الفطرت طاقتوں کا تصور نشوونما پانے لگا اور مظاہر فطرت کے بے شمار جلوے اسے اپنی طرف کھینچنے لگے۔ یہاں تک کہ پرستش کی ایسی چوکھٹیں بننا شروع ہوگئیں جنہیں اس کی جبین نیاز چھوسکتی تھی اور تصورات کی ایسی صورتیں ابھرنے لگیں جو اس کے دیدہ صورت پرست کے سامنے نمایاں ہوسکتی تھیں۔ یہیں اسے ٹھوکر لگی، لیکن راہ ایسی تھی کہ ٹھوکر سے بچ بھی نہیں سکتا تھا۔

کمند کوتہ و بازوی ست و بام بلند
یمن حوالۂ و نو مبدیم گنہ گیرند

پس معلوم ہوا کہ اس راہ میں ٹھوکر بعد کو لگی۔ پہلی حالت ٹھوکر کی نہ تھی، راہ راست پر گام فرسائیوں کی تھی۔

من ملک بودم و فردوس بریں جایم بود
آدم آورد دریں خانہ خراب آبادم

اگر اس صورت حال کو گمراہی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے تو ماننا پڑے گا کہ پہلی حالت جو انسان کو پیش آئی تھی وہ گمراہی کی نہ تھی، ہدایت کی تھی۔ اس نے آنکھیں روشنی میں کھولی تھیں، پھر آہستہ آہستہ تاریکی پھیلنے لگی۔

دینی نوشتوں کی شہادت اور قرآن کا اعلان

زمانہ حال کی عملی تحقیقات کا یہ نتیجہ ادیان عالم کے مقدس نوشتوں کی تصریحات کے عین مطابق ہے۔ مصر، یونان، کالڈیا، ہندوستان، چین، ایران سب کی مذہبی روایتیں ایک ایسے ابتدائی عہد کی خبر دیتی ہیں جب نوع انسانی گمراہی اور غمنا کی سے آشنا نہیں ہوئی تھی اور فطری ہدایت کی زندگی بسر کرتی تھی۔ افلاطون نے کریطیاس (Critias) میں آبادی عالم کی جو حکایت درج کی ہے، اس میں اس اعتقاد کی پوری جھلک موجود ہے۔ اور طیماؤس (Timaeus) کی حکایت جو ایک مصری پجاری کی زبانی ہے، مصری روایت کی خبر دیتی ہے۔ تورات کی کتاب پیدائش نے آدم کا قصہ بیان کیا ہے۔ اس قصے میں آدم کی پہلی زندگی ہدایت کی بہشتی زندگی تھی۔ پھر لغزش ہوئی اور بہشتی زندگی مفقود ہوگئی۔ اس قصے میں بھی یہی اصل کام کر رہی ہے کہ یہاں پہلا دور فطری ہدایت کا تھا، انحراف و گمراہی کی راہیں بعد کو کھلیں۔ قرآن نے تو صاف صاف اعلان کر دیا ہے کہ:

وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلَّآ أُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا (۱۰۔۱۹)

ابتداء میں تمام انسان ایک ہی گروہ تھے (یعنی الگ الگ راہوں میں بھٹکے ہوئے نہ تھے) پھر اختلاف میں پڑ گئے۔

دوسری جگہ مزید تشریح کی:

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ (۲:۲۱۳)

ابتدا میں تمام انسانوں کا ایک ہی گروہ تھا (یعنی فطری ہدایت کی ایک ہی راہ پر تھے، پھر اس کے بعد اختلافات پیدا ہوگئے) پس اللہ نے ایک کے بعد ایک نبی مبعوث کیے۔ وہ نیک عملی کے نتیجوں کی خوشخبری دیتے تھے، بد عملی کے نتیجوں سے متنبہ کرتے

تھے۔ نیز ان کے ساتھ نوشتے نازل کیے، تاکہ جن باتوں میں لوگ اختلاف کرنے لگے ہیں، ان کا فیصلہ کر دیں۔

ارتقائی نظریہ خدا کی ہستی کے اعتقاد میں نہیں، مگر اس کی صفات کے تصورات کے مطالعے میں مدد دیتا ہے

پس خدا کی ہستی کے عقیدے کے بارے میں انیسویں صدی کا ارتقائی نظریہ اب اپنی عملی اہمیت کھو چکا ہے اور بحث ونظر میں بہت کم مدد دے سکتا ہے۔ البتہ جہاں تک انسان کے ان تصوروں کا تعلق ہے جو خدا کی صفات کی نقش آرائیاں کرتے رہے، ہمیں ارتقائی نقطہ خیال سے ضرور مدد ملتی ہے۔ کیونکہ بلاشبہ یہاں تصورات کے نشوو ارتقاء کا ایک ایسا سلسلہ موجود ہے جس کی ارتقائی کڑیاں ایک دوسرے سے الگ کی جا سکتی ہیں اور نچلے درجوں سے اونچے درجے کی طرف ہم بڑھ سکتے ہیں۔

خدا کی ہستی کا اعتقاد انسان کے ذہن کی پیداوار نہ تھا کہ ذہنی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ وہ بھی بدلتا رہتا۔ وہ اس کی فطرت کا ایک وجدانی احساس تھا اور وجدانی احساسات میں نہ تو ذہن وفکر کے موثرات مداخلت کر سکتے ہیں نہ باہر کے اثرات سے ان میں تبدیلی ہو سکتی ہے۔ لیکن انسان کی عقل ذات مطلق کے تصور سے عاجز ہے۔ وہ جب کسی چیز کا تصور کرنا چاہتی ہے تو گو تصور ذات کا کرنا چاہیئے، لیکن تصور میں صفات وعوارض ہی آتے ہیں اور صفات ہی کے جمع وتفرقہ سے وہ ہر چیز کا تصور آراستہ کرتی ہے۔ پس جب فطرت کے اندرونی جذبے نے ایک بالاتر ہستی کے اعتراف کا ولولہ پیدا کیا تو ذہن نے چاہا اس کا تصور آراستہ کرے، لیکن جب تصور کیا تو وہ اس کی ذات کا تصور نہ تھا، اس کی صفات کا تصور تھا اور صفات میں سے بھی انہیں صفات کا، جن کا ذہن انسانی تخیل کر سکا تھا۔ یہیں سے خدا پرستی کے فطری جذبے میں ذہن وفکر کی مداخلت شروع ہو گئی۔

عقلِ انسانی کی درماندگی اور صفاتِ الٰہی کی صورت آرائی

عقلِ انسانی کا ادراک محسوسات کے دائرے میں محدود ہے۔ اس لئے اس کا تصور اس دائرے سے باہر قدم نہیں نکال سکتا۔ وہ جب کسی ان دیکھی اور غیر محسوس چیز کا تصور کرے گی تو ناگزیر ہے کہ تصور میں وہی صفات آئیں جنہیں وہ دیکھتی اور سنتی ہے اور جو اس کے حاسہ ذوق و لمس کی دسترس سے باہر نہیں ہیں۔ پھر اس کے ذہن و تفکر کی جتنی بھی رسائی ہے، بیک دفعہ ظہور میں نہیں آئی ہے، بلکہ ایک طول طویل عرصے کے نشو و ارتقاء کا نتیجہ ہے۔ ابتدا میں اس کا ذہن عہدِ طفولیت میں تھا۔ اس لئے اس کے تصورات بھی اسی نوعیت کے ہوتے تھے۔ پھر جوں جوں اس میں اور اس کے ماحول میں ترقی ہوتی گئی، اس کا ذہن بھی ترقی کرتا گیا اور ذہن کی ترقی و تزکیے کے ساتھ اس کے تصورات میں بھی شائستگی اور بلندی آتی گئی۔

اس صورتِ حال کا نتیجہ یہ تھا کہ جب کبھی ذہنِ انسانی نے خدا کی صورت بنانی چاہی تو ہمیشہ ویسی بنائی جیسی صورت خود اس نے اور اس کے احوال و ظروف نے پیدا کرلی تھی۔ جوں جوں اس کا معیارِ فکر بدلتا گیا، وہ اپنے معبود کی شکل و شباہت بھی بدلتا گیا۔ اسے اپنے آئینہ تفکر میں ایک صورت نظر آتی تھی۔ وہ سمجھتا تھا یہ اس کے معبود کی صورت ہے، حالانکہ وہ اس کے معبود کی صورت نہ تھی، خود اسی کے ذہن و صفات کا عکس تھا۔

فکرِ انسانی کی سب سے پہلی درماندگی یہی ہے جو اس راہ میں پیش آئی۔

حرم جویان دری را می پرستند
فقیہان دفتری را می پرستند
برافگن پردہ تا معلوم گردد
کہ یاران دیگری را می پرستند

یہی درماندگی ہے جس سے نجات دلانے کے لئے وحیِ الٰہی کی ہدایت ہمیشہ نمودار ہوتی رہی[۶۳] انبیاءِ کرام (علیہم السلام) کی دعوت کی ایک بنیادی اصل یہ رہی ہے کہ انہوں نے ہمیشہ خدا پرستی کی تعلیم ویسی ہی شکل و اسلوب میں دی جیسی شکل و اسلوب کے فہم و تحمل کی استعداد

مخاطبوں میں پیدا ہوگئی تھی۔ وہ مجمع انسانی کے معلم و مربی تھے اور معلم کا فرض ہے کہ متعلموں میں جس درجے کی استعداد پائی جائے، اسی درجے کا سبق بھی دے۔ پس انبیاء کرام نے بھی وقتاً فوقتاً خدا کی صفات کے لئے جو پیرایہ تعلیم اختیار کیا، وہ اس سلسلہ ارتقاء سے باہر نہ تھا، بلکہ اسی کی مختلف کڑیاں مہیا کرتا ہے۔

ارتقاءِ تصور کے نقاط ثلاثہ

اس سلسلے کی تمام کڑیوں پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں اور ان کے فکری عناصر کی تحلیل کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ ان کی بے شمار نوعیتیں قرار دی جاسکتی ہیں، لیکن ارتقائی نقطے ہمیشہ تین ہی رہے اور انہیں سے اس سلسلے کی بدایت و نہایت معلوم کی جاسکتی ہے:

(۱) تجسم [۶۴] سے تنزیہ کی طرف۔

(۲) تعدد و اشراک (Polytheism) سے توحید (Monotheism) کی طرف۔

(۳) صفات قہر و جلال سے صفات رحمت و جمال کی طرف۔

یعنی تجسم اور صفات قہریہ کا تصور اس کا ابتدائی درجہ ہے اور تنزہ اور صفات رحمت و جمال سے اتصاف، اعلیٰ و کامل درجہ۔ جو تصور جس قدر ابتدائی اور ادنیٰ درجے کا ہے، اتنا ہی تجسم اور صفات قہریہ کا عنصر اس میں زیادہ ہے۔ جو تصور جس قدر زیادہ ترقی یافتہ ہے، اتنا ہی زیادہ منزہ اور صفات رحمت و جلال سے متصف ہے۔

انسان کا تصور صفات قہریہ کے تاثر سے کیوں شروع ہوا؟

انسان کا تصور صفات قہریہ کے تخیل سے کیوں شروع ہوا؟ اس کی علت واضح ہے۔ فطرت کائنات کی تعمیر، تخریب کے نقاب میں پوشیدہ ہے۔ انسانی فکر کی طفولیت تعمیر کا حسن نہ دیکھ سکی، تخریب کی ہولناکیوں سے سہم گئی۔ تعمیر کا حسن و جمال دیکھنے کے لئے فہم و بصیرت کی دور رس نگاہ مطلوب تھی اور وہ ابھی اس کی آنکھوں نے پیدا نہیں کی تھی۔

دنیا میں ہر چیز کی طرح ہر فعل کی نوعیت بھی اپنا مزاج رکھتی ہے۔ بناؤ ایک ایسی حالت ہے

جس کا مزاج سرتاسر سکون اور خاموشی ہے اور بگاڑ ایک ایسی حالت ہے کہ اس کا مزاج سرتا سر شورش اور ہولناکی ہے۔ بناؤ ایجاب ہے، نظم ہے، جمع وترتیب ہے۔ بگاڑ سلب ہے، برہمی ہے، تفرقہ واختلال ہے۔ جمع ونظم کی حالت ہی سکون کی حالت ہوتی ہے اور تفرقہ وبرہمی کی حالت ہی شورش وانفجار کی حالت ہے۔ دیوار جب بنتی ہے تو تمہیں کوئی شورش محسوس نہیں ہوتی۔ لیکن جب گرتی ہے تو دھماکہ ہوتا ہے اور تم بے اختیار چونک اٹھتے ہو۔ اس صورت حال کا قدرتی نتیجہ یہ ہے کہ حیوانی طبیعت سلبی افعال سے فوراً متاثر ہو جاتی ہے۔ کیوں کہ ان کی نمود میں شورش اور ہولناکی ہے، لیکن ایجابی افعال سے متاثر ہونے میں دیر لگاتی ہے، کیونکہ ان کا حسن وجمال یکا یک مشاہدے میں نہیں آجاتا اور ان کا مزاج شورش کی جگہ خاموشی اور سکون ہے[۶۵]

فطرت کے سلبی مظاہر کی قہرمانی اور ایجابی مظاہر کا حسن وجمال۔ انسان پر شیفتگی سے پہلے دہشت طاری ہوئی

اسی بناء پر عقل انسانی نے جب صفات الٰہی کی صورت آرائی کرنی چاہی تو فطرت کائنات کے سلبی مظاہر کی دہشت سے فوراً متاثر ہوگئی۔ کیونکہ زیادہ نمایاں اور پر شور تھے۔ اور ایجابی وتعمیری حقیقت سے متاثر ہونے میں بہت دیر لگ گئی کیونکہ ان میں شورش اور ہنگامہ نہ تھا۔ بادلوں کی گرج، بجلی کی کڑک، آتش فشاں پہاڑوں کا انفجار، زمین کا زلزلہ، آسمان کی ژالہ باری، دریا کا سیلاب، سمندر کا تلاطم، ان تمام سلبی مظاہر میں اس کیلئے رعب وہیبت تھی اور اسی ہیبت کے اندر وہ ایک غضبناک خدا کی ڈراؤنی صورت دیکھنے لگا تھا۔ اسے بجلی کی کڑک میں کوئی حسن محسوس نہیں ہوسکتا تھا، وہ بادلوں کی گرج میں کوئی شان محبوبیت نہیں پاسکتا تھا، وہ آتش فشاں پہاڑوں کی سنگ باری سے پیار نہیں کرسکتا تھا اور اس کی عقل ابھی خدا کے انہیں کاموں سے آشنا ہوئی تھی!

خود اس کی ابتدائی معیشت کی نوعیت بھی ایسی ہی تھی کہ انس ومحبت کی جگہ خوف ووحشت کے جذبات برانگیختہ ہوتے۔ وہ کمزور اور نہتا تھا اور دنیا کی ہر چیز اسے دشمنی اور ہلاکت پر تلی نظر آتی تھی۔ دلدل کے مچھروں کے جھنڈ چاروں طرف منڈلا رہے تھے۔ زہریلے جانور

ہر طرف رینگ رہے تھے۔ درندوں کے حملوں سے ہر وقت مقابل رہنا پڑتا تھا۔ سر پر سورج کی تپش بے پناہ تھی اور چاروں طرف موسم کے اثرات ہولناک تھے۔ غرض کہ اس کی زندگی سرتاسر جنگ اور محنت تھی اور اس ماحول کا قدرتی نتیجہ تھا کہ اس کا ذہن خدا کا تصور کرتے ہوئے خدا کی ہلاکت آفرینیوں کی طرف جاتا، رحمت و فیضان کا ادراک نہ کرسکتا۔

بالآخر صفات رحمت و جمال کا اشتمال

لیکن جوں جوں اس میں اور اس کے ماحول میں تبدیلی ہوتی گئی، اس کے تصور میں بھی یاس ودہشت کی جگہ امید ورحمت کا عنصر شامل ہوتا گیا، یہاں تک کہ معبودیت کے تصور میں صفات رحمت و جمال نے بھی ویسی ہی جگہ پالی جیسی صفات قہر وجلال کے لئے تھی۔ چنانچہ اگر قدیم اقوام کے اصنام پرستانہ تصورات کا مطالعہ کریں تو ہم دیکھیں گے کہ ان کی ابتداء ہر جگہ صفات قہر وتصور ہی سے ہوئی ہے اور پھر آہستہ آہستہ رحمت و جمال کی طرف قدم اٹھا ہے۔ آخری کڑیاں وہ نظر آئیں گی جن میں قہر وغضب کے ساتھ رحمت و جمال کا تصور بھی مساویانہ حیثیت سے قائم ہوگیا ہے۔ مثلاً قہر و ہلاکت کے دیوتاؤں اور قوتوں کے ساتھ زندگی، ذوق، دولت اور حسن وعلم کے دیوتاؤں کی بھی پرستش شروع ہوگئی ہے۔ یونان کا علم الاصنام اپنے لطافت تخیل کے لحاظ سے تمام اصنامی تخیلات میں اپنی خاص جگہ رکھتا ہے، لیکن اس کی پرستش کے بھی قدیم معبود وہی تھے جو قہر وغضب کی خوفناک قوتیں سمجھی جاتی تھیں۔ ہندوستان میں اس وقت تک زندگی اور بخشش کے دیوتاؤں سے کہیں زیادہ ہلاکت کے دیوتاؤں کی پرستش ہوتی ہے۔

ظہور قرآن کے وقت دنیا کے عام تصورات

بہر حال ہمیں غور کرنا چاہیے کہ قرآن کے ظہور کے وقت صفات الٰہی کے عام تصورات کی نوعیت کیا تھی اور قرآن نے جو تصور پیش کیا اس کی حیثیت کیا ہے؟

ظہور قرآن کے وقت پانچ دینی تصور[66] فکر انسانی پر چھائے ہوئے تھے۔

۱۔ چینی ۲۔ ہندوستانی ۳۔ مجوسی ۴۔ یہودی اور ۵۔ مسیحی

ا۔ چینی تصور

دنیا کی تمام قدیم قوموں میں چینیوں کی یہ خصوصیت تسلیم کرنی پڑتی ہے کہ ان کے تصور الوہیت نے ابتدا میں جو ایک سادہ اور مبہم نوعیت اختیار کر لی تھی، وہ بہت حد تک برابر قائم رہی اور زمانہ مابعد کی ذہنی وسعت پذیریاں اس میں زیادہ مداخلت نہ کر سکیں۔ تاہم تصور کا کوئی مرقع بغیر رنگ و روغن کے بن نہیں سکتا، اس لئے آہستہ آہستہ اس سادہ خاکے میں بھی مختلف رنگتیں نمایاں ہونے لگیں اور آخر کار ایک رنگین تصویر متشکل ہو گئی۔

چین میں قدیم زمانے میں مقامی خداؤں کے ساتھ ایک ''آسمانی'' ہستی کا اعتقاد بھی موجود تھا۔ ایک ایسی بلند اور عظیم ہستی جس کی علویت کے تصور کے لئے ہم آسمان کے سوا اور کسی طرف نظر نہیں اٹھا سکتے۔ آسمان حسن و بخشایش کا بھی مظہر ہے۔ قہر و غضب کی بھی ہولناکی ہے۔ اس کا سورج روشنی اور حرارت بخشتا ہے، اس کے ستارے اندھیر راتوں میں قندیلیں روشن کرتے ہیں، اس کی بارش زمین کو طرح طرح کی روئیدگیوں سے معمور کر دیتی ہے، لیکن اس کی بجلیاں ہلاکت کا بھی پیام ہیں اور اس کی گرج دلوں کو دہلا بھی دیتی ہے۔ اس لئے آسمانی خدا کے تصور میں بھی دونوں صفتیں نمودار ہوئیں۔ ایک طرف اس کی جود و بخشایش ہے، دوسری طرف اس کا قہر و غضب ہے۔ چینی شاعری کی قدیم کتاب میں ہم قدیم ترین چینی تصورات کی جھلک دیکھ سکتے ہیں۔ ان میں جا بجا ہمیں ایسے مخاطبات ملتے ہیں جن میں آسمانی اعمال کی ان متضاد نمودوں پر حیرانی و سرگشتگی کا اظہار کیا گیا ہے۔ ''یہ کیا بات ہے کہ تیرے کاموں میں یکسانی اور ہم آہنگی نہیں؟ تو زندگی بھی بخشتا ہے اور تیرے پاس ہلاکت کی بجلیاں بھی ہیں''۔

یہ ''آسمان'' چینی تصور کا ایک ایسا بنیادی عنصر بن گیا کہ چینی جمعیت آسمانی جمعیت اور چینی مملکت آسمانی مملکت کے نام سے پکاری جانے لگی۔ رومی جب پہلے پہل چین سے آشنا ہوئے تو انہیں ایک ''آسمانی مملکت'' ہی کی خبر ملی تھی۔ اس وقت سے (Coelum) کے مشتقات کا چین کے لئے استعمال ہونے لگا۔ یعنی ''آسمان والے'' اور ''آسمانی''۔ اب بھی

انگریزی میں چین کے باشندوں کے لئے مجازاً ''سلے شیل'' (Celestial) کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے، یعنی آسمانی ملک کے باشندے۔

اس آسمانی ہستی کے علاوہ گزرے ہوئے انسانوں کی روحیں بھی تھیں جنہیں دوسرے عالم میں پہنچ کر تدبیر و تصرف کی طاقتیں حاصل ہوگئی تھیں اور اس لئے پرستش کی مستحق سمجھی گئی تھی۔ ہر خاندان اپنی معبود روحیں رکھتا تھا اور ہر علاقہ اپنا مقامی خدا۔

لاؤ۔تزو اور کنگ فوزی کی تعلیم

سنہ مسیحی سے پانچ سو برس پہلے لاؤ۔ تزو (Lao-Tzu) اور کنگ فوزی (Kung-Fu,Tsc)[67] کا ظہور ہوا۔ کنگ فوزی نے ملک کو علمی زندگی کی سعادتوں کی راہ دکھائی اور معاشرتی حقوق و فرائض کی ادائیگی کا ایک قانون مہیا کر دیا۔ لیکن جہاں تک خدا کی ہستی کا تعلق ہے ''آسمان'' کا قدیمی تصور بدستور قائم رہا اور اجداد پرستی کے عقائد نے اس کے ساتھ مل کر ایک ایسی نوعیت پیدا کر لی گویا آسمانی خدا تک پہنچنے کا ذریعہ گزری ہوئی روحوں کا وسیلہ اور تشفع ہے۔ روحانی تصورات میں وسیلے کا اعتقاد ہمیشہ عابدانہ پرستش کی نوعیت پیدا کر لیتا ہے، چنانچہ یہ توسل بھی عملاً تعبد تھا اور ہر طرح کے دینی اعمال و رسوم کا مرکزی نقطہ بن گیا تھا۔

ہندوستان اور یونان میں دیوتاؤں کے تصور نے نشوونما پائی تھی جو خدائی کی ایک بالاتر ہستی کے ساتھ کارخانہ عالم کے تصرفات میں شرکت رکھتے تھے۔ چینی تصور میں یہ خانہ بزرگوں کی روحوں نے بھرا اور اس طرح اشراک اور تعدد کے تصور کی پوری نقش آرائی ہوگئی۔

کنگ فوزی کے ظہور سے پہلے قربانیوں کی رسم عام طور پر رائج تھی۔ کنگ فوزی نے اگرچہ ان پر زور نہیں دیا، لیکن ان سے تعرض بھی نہیں کیا۔ چنانچہ وہ چینی مندروں کا تقاضا برابر پورا کرتی رہیں۔ قربانیوں کے عمل کے پیچھے طلب بخشش اور جلب تحفظ دونوں کے تصور کام کرتے تھے۔ قربانیوں کے ذریعہ ہم اپنے مقاصد بھی حاصل کر سکتے ہیں اور خدا کے قہر و غضب سے محفوظ بھی ہو جا سکتے ہیں۔ پہلی غرض کے لئے وہ نذر ہیں، دوسری غرض کے لئے فدیہ!

لاؤ۔تزو نے ’’تاؤ‘‘ یعنی طریقت کے مسلک کی بنیاد ڈالی۔اسے چین کا تصوف اور ویدانت سمجھنا چاہیے۔تاؤ نے چینی زندگی کو روحانی استغراق اور داخلی مراقبے کی راہوں سے آشنا کیا اور مذہبی اور اخلاقی تصورات میں ایک طرف گہرائی اور دقت آفرینی پیدا ہوئی، دوسری طرف لطافت فکر اور رقت خیال کے نئے نئے دروازے کھلے لیکن تصوف ملک کا عام دینی تصور نہیں بن سکتا تھا۔اس کی محدود جگہ چین میں بھی وہی رہی جو ویدانت کی ہندوؤں میں اور تصوف کی مسلمانوں میں رہی ہے۔

چین کا شمنی تصور

اس کے بعد وہ زمانہ آیا جب ہندوستان کے شمنی [۶۸] (یعنی بدھ مذہب) کی چین میں اشاعت ہوئی۔ یہ مہایانا بدھ مذہب تھا جو مذہب کے اصلی مبادیات سے بہت دور جا چکا تھا اور جس نے تبدل پذیری کی ایسی بے روک لچک پیدا کر لی تھی کہ جس شکل وقطع کا خانہ ملتا تھا، ویسا ہی جسم بنا کر اس میں سما جاتا تھا۔ یہ جب چین ،کوریا اور جاپان میں پہنچا تو اسے ہندوستان اور سیلون سے مختلف قسم کی فضا ملی اور اس نے فوراً مقامی وضع وقطع اختیار کر لی۔

بدھ مذہب کی نسبت یقین کیا جاتا ہے کہ خدا کی ہستی کے تصور سے خالی ہے، لیکن پیروان بدھ نے خود بدھ کو خدا کی جگہ دے دی اور اس کی پرستش کا ایک ایسا عالمگیر نظام قائم کر دیا جس کی کوئی دوسری نظیر اصنامی مذاہب کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ چنانچہ چین ،کوریا اور جاپان کی عبادت گاہیں بھی اب اس نئے معبود کے بتوں سے معمور ہو گئیں۔

۲۔ ہندوستانی تصور

ہندوستان کے تصور الوہیت کی تاریخ متضاد تصوروں کا ایک حیرت انگیز منظر ہے۔ایک طرف اس کا توحیدی فلسفہ ہے، دوسری طرف اس کا عملی مذہب ہے۔توحیدی فلسفے نے استغراق فکر وعمل کے نہایت گہرے اور دقیق مرحلے طے کیے اور معاملے کو فکری بلندیوں کی ایک ایسی اونچی سطح تک پہنچا دیا جس کی کوئی دوسری مثال ہمیں قدیم قوموں کے مذہبی تصورات میں نہیں ملتی۔ عملی مذہب نے اشراک تعدد الٰہ کی بے روک راہ اختیار کی اور اصنامی

تصوروں کو اتنی دور تک پھیلنے دیا کہ ہر پتھر معبود ہو گیا، ہر درخت خدائی کرنے لگا اور ہر چوکھٹ سجدہ گاہ بن گئی۔ وہ بیک وقت زیادہ سے زیادہ بلندی کی طرف بھی اڑا اور زیادہ سے زیادہ پستی میں بھی گرا۔ اس کے خواص نے اپنے لئے توحید کی جگہ پسند کی اور عوام کے لئے اشراک اور اصنام پرستی کی راہ مناسب سمجھی۔

اپنشد کا توحیدی اور وحدۃ الوجودی تصور

رگ وید کے زمزموں میں ہمیں ایک طرف مظاہر قدرت کی پرستش کا ابتدائی تصور بتدریج پھیلتا اور مجسم ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ دوسری طرف ایک بالاتر اور خالق کل ہستی کا توحیدی تصور بھی آہستہ آہستہ ابھرتا نظر آتا ہے۔ خصوصاً دسویں حصے کے زمزموں میں تو اس کی نمود صاف صاف دکھائی دینے لگتی ہے۔ یہ توحیدی تصور کسی بہت پرانے گزشتہ عہد کے بنیادی تصور کا بقیہ تھا یا مظاہر قدرت کی کثرت آرائیوں کا تصور اب خود بخود کثرت سے وحدت کی طرف ارتقائی قدم اٹھانے لگا تھا۔ اس کا فیصلہ مشکل ہے، لیکن بہر حال ایک ایسے قدیم عہد میں بھی جب کہ رگ وید کے تصوروں نے نظم و سخن کا جامہ پہننا شروع کیا تھا، توحیدی تصور کی جھلک صاف صاف دیکھی جا سکتی ہے۔ خداؤں کا وہ ہجوم جس کی تعداد تین سو تینتیس یا اسی طرح کی ثلاثی کثرت تک پہنچ گئی تھی[۶۹] آخر کار تین دائروں میں سمٹنے لگا، یعنی زمین، فضا اور آسمان میں۔ اور پھر اس نے ایک رب الاربابی[*] کے تصور (Henotheism) کی نوعیت پیدا کر لی۔ پھر یہ رب الاربابی تصور اور زیادہ سمٹنے لگتا ہے اور ایک سب سے بڑی اور سب پر چھائی ہوئی ہستی نمایاں ہونے لگتی ہے۔ یہ ہستی کبھی ''ورون'' میں نظر آتی ہے، کبھی ''اندر'' میں اور کبھی ''اگنی'' میں، لیکن بالآخر ایک خالق کل ہستی کا تصور پیدا ہو جاتا ہے جو ''پرجاپتی'' (پروردگار عالم) اور ''وشوا کرمن'' (خالق کل) کے نام سے پکاری جانے لگتی ہے اور جو تمام کائنات کی اصل و حقیقت ہے۔ ''وہ ایک ہے مگر علم والے اسے مختلف ناموں سے پکارتے ہیں: اگنی، یم، ماتری شوان'' (۱۶۴۔۴۶) ''وہ ایک، نہ تو آسمان ہے، نہ زمین ہے، نہ سورج کی روشنی ہے، نہ ہوا کا طوفان ہے۔ وہ کائنات کی

روح ہے، تمام قوتوں کا سر چشمہ، ہمیشگی، لازوالی۔ وہ کیا ہے؟ وہ شاید رٹ ہے جو ہر کے روپ میں، ادیتی ہے روحانیت کے بھیس میں۔ وہ بغیر سانس کے سانس لینے والی ہستی!'' (حصہ دوم۔۱۲۱۔۲) ''ہم اسے دیکھ نہیں سکتے، ہم اسے پوری طرح بتا نہیں سکتے'' (ایضاً۔۱۲۱) وہ ''ایکم است'' ہے۔ یعنی حقیقت یگانہ، الحق۔ یہی وحدت ہے جو کائنات کی تمام کثرت کے اندر دیکھی جاسکتی ہے[۱]

یہی مبادیات ہیں جنہوں نے اپنشدوں میں توحیدی وجودی (Pantheism) کے تصور کی نوعیت پیدا کرلی اور پھر ویدانت کے مابعد الطبیعیات (Metaphysics) نے انہیں بنیادوں پر استغراق فکر ونظر کی بڑی بڑی عمارتیں تیار کردیں۔

وحدۃ الوجودی اعتقاد ذات مطلق کے کشفی مشاہدات پر مبنی تھا، نظری عقائد کو اس میں دخل نہ تھا۔ اس لئے اصلاً یہاں صفات آرائیوں کی گنجائش ہی نہ تھی اور اگر تھی بھی تو صرف سلبی صفات (Negative Attributes) ہی ابھر سکتی تھیں۔ ایجابی (Positive) صفات کی صورت آرائی نہیں کی جاسکتی تھی۔ یعنی یہ تو کہا جاسکتا تھا کہ وہ ایسا نہیں ہے، لیکن یہ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ وہ ایسا ہے اور ایسا ہے۔ کیونکہ ایجابی صفات کا جو نقشہ بھی بنایا جائے گا وہ ہمارے ذہن وفکر ہی کا بنایا ہوا نقشہ ہوگا اور ہمارا ذہن وفکر امکان واضافت کی چار دیواری میں اس طرح مقید ہے کہ مطلق اور غیر محدود حقیقت کا تصور کر ہی نہیں سکتا۔ وہ جب تصور کرے گا تو ناگزیر ہے کہ مطلق کو مشخص بنا کر سامنے لائے اور جب تشخص آیا تو اطلاق باقی نہیں رہا۔ بابا فغانی نے دو مصرعوں کے اندر معاملے کی پوری تصویر کھینچ دی تھی:

مشکل حکایتیست کہ ہر ذرہ تین اوست
اما نمی توان کہ اشارت بہ او کنند

یہی وجہ ہے کہ اپنشد نے پہلے ذات مطلق (برھان) کو ذات مشخص (ایشور) کے مرتبے میں اتارا[۲] اور جب اطلاق نے تشخص کا نقاب چہرہ پر ڈال لیا تو پھر اس نقاب پوش

چہرے کی صفتوں کی نقش آرائیاں کی گئیں اور اس طرح وحدۃ الوجودی عقیدے نے ذات مشخص ومتصف (سارگون) کے تصور کا مقام بھی مہیا کر دیا۔

جب ان صفات کا ہم مطالعہ کرتے ہیں تو بلا شبہ ایک نہایت بلند تصور سامنے آجاتا ہے جس میں سلبی اور ایجابی دونوں طرح کی صفتیں اپنی پوری نمودار یاں رکھتی ہیں۔اس کی ذات یگانہ ہے،اس ایک کے لئے دوسرا نہیں،وہ بے ہمتا ہے، بے مثال ہے،ظرف وزمان اور مکان کے قیود سے بالاتر،ازلی وابدی،ناممکن الادراک،واجب الوجود،وہی پیدا کرنے والا ہے، وہی حفاظت کرنے والا اور وہی فنا کر دینے والا۔وہ علۃ العلل اور علت مطلقہ (''اپادنا'' اور ''نیمتا کارنا'') ہے۔تمام موجودات اسی سے بنیں،اسی سے قائم رہتی ہیں اور پھر اسی کی طرف لوٹنے والی ہیں۔وہ نور ہے، کمال ہے، حسن ہے، سرتا سر پاکی ہے۔سب سے زیادہ رحم ومحبت والا،ساری عبادتوں اور عاشقیوں کا مقصود حقیقی!

لیکن ساتھ ہی دوسری طرف یہ حقیقت بھی ہمیں صاف صاف دکھائی دیتی ہے کہ توحیدی تصور کی یہ بلندی بھی اشراک اور تعدد کی آمیزش سے خالی نہیں رہی اور توحید فی الذات کے ساتھ توحید فی الصفات کا بے میل عقیدہ جلوہ گر نہ ہو سکا۔زمانہ حال کے ایک قابل ہندو مصنف کے لفظوں میں ''دراصل اشراکی اور تعددی تصور (polytheistic) ہندوستانی دل ودماغ میں اس درجہ جڑ پکڑ چکا تھا کہ اب اسے یک قلم اکھاڑ کے پھینک دینا آسان نہ تھا۔اس لئے ایک یگانہ ہستی کی جلوہ طرازی کے بعد بھی دوسرے خدا نابود نہیں ہو گئے۔البتہ اس یگانہ ہستی کا قبضہ واقتدار ان سب پر چھا گیا اور سب اس کی ماتحتی میں آگئے۔''[۳۷]

اب اس طرح کی تصریحات ہمیں ملنے لگتی ہیں کہ بغیر اس بالاتر ہستی (برھمان) کے ''اگنی'' دیبی کچھ نہیں کر سکتی۔''یہ اسی کا (برھمان کا) خوف ہے جو تمام دیوتاؤں سے ان کے فرائض منصبی انجام دلاتا ہے''۔(تیتریا اپنشد) راجہ اشواپتی نے جب پانچ گھر والوں سے پوچھا ''تم اپنے دھیان میں کس کی پرستش کرتے ہو؟ تو ان میں ہر ایک نے ایک ایک دیوتا کا نام لیا۔اس پر اشواپتی نے کہا''تم میں سے ہر ایک نے حقیقت کے صرف ایک ہی حصے کی

پرستش کی، حالانکہ وہ سب کے ملنے سے شکل پذیر ہوتی ہے۔ ''اندر، اسکا سر ہے، ''سوریہ'' (سورج) اس کی آنکھیں ہیں، ''وایو'' سانس ہے، ''آکاش'' (ایتھر) جسم ہے، ''دھرتی'' (زمین) اس کا پاؤں ہے (ایضا) [۳۴]

لیکن پھر ساتھ ہی یہ بھی ہے کہ جب حقیقت کی قیومیت اور احاطے پر زور دیا جاتا ہے تو تمام موجودات کے ساتھ دیوتاؤں کی ہستی بھی غائب ہو جاتی ہے، کیونکہ تمام موجودات اسی پر موقوف ہیں وہ کسی پر موقوف نہیں۔ ''جس طرح رتھ کے پہیے کی تمام شاخیں ایک ہی دائرے کے اندر اپنا وجود رکھتی ہیں، اسی طرح تمام چیزیں، تمام دیوتا، تمام دنیائیں اور تمام آلات اسی ایک وجود کے اندر ہیں''۔ (برھادریناک، اپنشد باب ۲-۵) ''یہاں وہ درخت موجود ہے جس کی جڑ اوپر کی طرف چلی گئی ہے اور شاخیں نیچے کی طرف پھیلی ہوئی ہیں۔ یہ برھمان ہے لافانی، تمام کائنات اس میں ہے، کوئی اس سے باہر نہیں''۔ (تیتریا-۱-۱۰)

یہاں مصنف موصوف کے الفاظ پھر مستعار لیتے ہیں ''یہ دراصل ایک سمجھوتہ تھا جو چند خاص دماغوں کے فلسفیانہ تصور نے انسانی بھیڑ کے وہم پرست ولولوں کے ساتھ کر لیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ خواص اور عوام کی فکری موافقت کی ایک آب وہوا پیدا ہو گئی اور وہ برابر قائم رہی''۔

آگے چل کر ویدانت کے فلسفے نے بڑی وسعتیں اور گہرائیاں پیدا کیں، لیکن خواص کے توحیدی تصور میں عوام کے اشراکی تصور سے مفاہمت کا جو میلان پیدا ہو گیا تھا وہ متزلزل نہ ہوسکا، بلکہ اور زیادہ مضبوط اور وسیع ہوتا گیا۔ یہ بات عام طور پر تسلیم کر لی گئی کہ سالک جب عرفان حقیقت کی منزلیں طے کر لیتا ہے تو پھر ماسوی کی تمام ہستیاں معدوم ہو جاتی ہیں اور ماسوی میں دیوتاؤں کی ہستیاں بھی داخل ہیں، گویا دیوتاؤں کی ہستیاں مظاہر وجود کی ابتدائی تعینات ہوئیں، لیکن ساتھ ہی یہ بنیاد بھی برابر قائم رکھی گئی کہ جب تک اس آخری مقام عرفان تک رسائی حاصل نہ ہو جائے، دیوتاؤں کی پرستش کے بغیر چارہ نہیں اور ان کی پرستش کا جو نظام قائم ہو گیا ہے، اسے چھیڑنا نہیں چاہئے۔ اس طرح گویا ایک طرح کے توحیدی اشراکی

تصور (Monotheistic Polytheism) کا مخلوط مزاج پیدا ہو گیا جو بیک وقت فکر و نظر کا توحیدی تقاضا بھی پورا کرنا چاہتا تھا اور ساتھ ہی اصنامی عقائد کا نظام عمل بھی سنبھالے رکھنا چاہتا تھا۔ ویدانت کے بعض مذہبوں میں تو یہ مخلوط نوعیت بنیادی تصوروں تک سرایت کر گئی۔ مثلاً نیمبارک اور اس کا شاگرد سری نواس، برہم سوتر کی شرح کرتے ہوئے ہمیں بتلاتے ہیں کہ ''اگرچہ برھما یا کرشن کی طرح کوئی نہیں، مگر اس سے ظہور میں آئی ہوئی دوسری قوتیں بھی ہیں جو اس کے ساتھ اپنی نمود رکھتی ہیں اور اسی کی طرح کارفرمائی میں شریک ہیں۔ چنانچہ کرشن کے بائیں طرف رادھا ہے۔ یہ بخشش و نوال کی ہستی ہے، تمام نتائج و ثمرات بخشنے والی۔ ہمیں چاہئے کہ برھما کے ساتھ رادھا کی بھی پرستش کریں''۔[۵]

اس موقع پر یہ حقیقت بھی پیش نظر رکھنی چاہئے کہ فطرت کائنات کے جن قوائے مدبرہ کو سامی تصور نے ''ملاک'' اور ''ملائکہ'' سے تعبیر کیا تھا اسی کو آریائی تصور نے ''دیو'' اور ''یرتا'' سے تعبیر کیا۔ یونانیوں کا ''تھیوس'' (Theos) رومیوں کا ڈےیوس (Dous) پارسیوں کا ''یزتا'' (یزدان) سب کے اندر وہی ایک بنیادی مادہ اور وہی ایک بنیادی تصور کام کرتا رہا۔ سنسکرت میں ''دیو'' ایک لچک دار لفظ ہے جو متعدد معنوں میں مستعمل ہوا ہے، لیکن جب مافوق الفطرت ہستیوں کے لئے بولا جاتا ہے تو اس کے معنی ایک ایسی غیر مادی اور روحانی ہستی کے ہو جاتے ہیں جو اپنے وجود میں روشن اور درخشاں ہو۔ سامی ادیان نے ان روحانی ہستیوں کی حیثیت اس سے زیادہ نہیں دیکھی کہ وہ خدا کی پیدا کی ہوئی کارکن ہستیاں ہیں۔ لیکن آریائی تصور نے ان میں تدبیر و تصرف کی بالااستقلال طاقتیں دیکھیں اور جب توحیدی تصور کے قیام سے وہ استقلال باقی نہیں رہا تو توسل اور تزلف کا درمیانی مقام انہوں نے پیدا کر لیا۔ یعنی اگرچہ وہ خود خدا نہیں ہیں، لیکن خدا تک پہنچنے کے لئے ان کی پرستش ضروری ہوئی۔ ایک پرستار کی پرستش اگرچہ ہوگی معبود حقیقی کے لئے، مگر ہوگی انہیں کے آستانوں پر۔ ہم براہ راست خدا کے آستانے تک پہنچ نہیں سکتے، ہمیں پہلے دیوتاؤں کے آستانوں کا وسیلہ پکڑنا چاہئے۔ دراصل یہی توسل و تزلف کا عقیدہ ہے جس نے ہر جگہ

توحیدی اعتقادِ عمل کی تکمیل میں خلل ڈالا، ورنہ ایک خدا کی یگانگی اور بالاتری سے تو کسی کو بھی انکار نہ تھا۔ عرب جاہلیت کے بت پرستوں کا بھی یہی عقیدہ قرآن نے نقل کیا ہے کہ:

''مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِیُقَرِّبُوْنَآ اِلَی اللّٰهِ زُلْفٰی'' (۳:۳۹)

بہر حال شرک فی الصفات اور شرک فی العبادت کا یہی وہ عنصری مادہ تھا جس نے ہندوستان کے عملی مذہب کو سرتا سر اشراک اور اصنام پرستی کے عقائد سے معمور کر دیا اور آخر کار یہ صورت حال اس درجہ گہری اور عام ہوگئی کہ جب تک ایک سراغ رساں جستجو اور تفحص کی دور دراز مسافتیں طے نہ کرلے، ہندو عقیدے کے توحیدی تصور کا کوئی نشان نہیں پا سکتا۔ توحیدی تصور نے یہاں ایک ایسے راز کی نوعیت پیدا کرلی جس تک صرف خاص خاص عارفوں ہی کی رسائی ہوسکتی ہے۔ ہم اس کا سراغ پہاڑوں کی غاروں میں پاسکتے ہیں، لیکن کوچہ و بازار میں نہیں پا سکتے۔ گیارھویں صدی مسیحی میں جب ابوریحان بیرونی ہندوستان کے علوم وعقائد کے سراغ میں نکلا تھا تو یہ متضاد صورت حال دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔ سولہویں صدی میں ویسی ہی حیرانی ابوالفضل کو پیش آئی اور پھر اٹھارویں صدی میں سرولیم جونس (Sir William Jones) کو۔

بہترین معذرت جو اس صورت حال کی کی جاسکتی ہے، وہ ہی ہے جس کا اشارہ گیتا کے شہرہ آفاق ترانوں میں ہمیں ملتا ہے اور جس نے البیرانی کے فلسفیانہ دماغ کو بھی اپنی طرف متوجہ کرلیا تھا۔ یعنی یہاں پہلے دن سے عقائد و عمل کی مختلف راہیں مصلحتاً کھلی رکھی گئیں تاکہ خواص اور عوام دونوں کی فہم واستعداد کی رعایت ملحوظ رہے۔ توحیدی تصور خواص کے لئے تھا، کیونکہ وہی اس بلند مقام کے متحمل ہوسکتے تھے۔ اصنامی تصور عوام کے لئے تھا، کیونکہ ان کی طفلانہ عقول کے لئے یہی راہ موزوں تھی۔ اور پھر چونکہ خواص بھی جمعیت و معاشرت کے عام ضبط و نظم سے باہر نہیں رہ سکتے، اس لئے عملی زندگی میں انہیں بھی اصنام پرستی کے تقاضے پورے ہی کرنے پڑتے تھے اور اس طرح ہندو زندگی کی بیرونی وضع قطع بلا استثنا اشراک اور اصنام پرستی ہی کی رہتی آئی۔

البیرونی نے حکماء یونان کے اقوال نقل کر کے دکھایا ہے کہ اس بارے میں ہندوستان اور یونان دونوں کا حال ایک ہی طرح کا رہا۔ پھر گیتا کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "بہت سے لوگ مجھ تک (یعنی خدا تک) اس طرح پہنچنا چاہتے ہیں کہ میرے سوا دوسروں کی عبادت کرتے ہیں۔ لیکن میں ان کی مرادیں بھی پوری کر دیتا ہوں، کیونکہ میں اس سے اور ان کی عبادت سے بے نیاز ہوں۔[۶]

بے محل نہ ہوگا اگر اس موقعے پر زمانہ حال کے ایک ہندو مصنف کی رائے پر بھی نظر ڈال لی جائے۔ گوتم بدھ کے ظہور سے پہلے ہندو مذہب کے تصور الوہیت نے جو عام شکل وصورت پیدا کر لی تھی، اس پر بحث کرتے ہوئے یہ قابل مصنف لکھتا ہے:

"گوتم بدھ کے عہد میں جو مذہب ملک پر چھایا ہوا تھا، اس کے نمایاں خدوخال یہ تھے کہ لین دین کا ایک سودا تھا جو خدا اور انسانوں کے درمیان ٹھہر گیا تھا۔ جب کہ ایک طرف اپنشد کا برہمان تھا جو ذات الوہیت کا ایک اعلیٰ اور شائستہ تصور پیش کرتا تھا تو دوسری طرف ان گنت خداؤں کا ہجوم تھا جن کے لئے کوئی حد بندی نہیں ٹھہرائی جا سکتی تھی۔ آسمان کے سیارے، مادے کے عناصر، زمین کے درخت، جنگل کے حیوان، پہاڑوں کی چٹانیں، دریاؤں کی جدولیں، غرضیکہ موجودات خلقت کی کوئی قسم ایسی نہ تھی جو خدائی حکومت میں شریک نہ کر لی گئی ہو۔ گویا ایک بے لگام اور خود رو تخیل کو پروانہ مل گیا تھا کہ دنیا کی جتنی چیزوں کو خدائی مسند پر بٹھا سکتا ہے، بے روک ٹوک بٹھاتا رہے پھر جیسے خداؤں کی یہ بیشمار بھیڑیں بھی اس کے ذوق خدا سازی کے لئے کافی نہ ہوئی ہوں، طرح طرح کے عفریتوں اور عجیب الخلقت جسموں کی متخیلہ صورتوں کا بھی ان پر اضافہ ہوتا رہا۔ اس میں شبہ نہیں کہ اپنشدوں نے فکر ونظر کی دنیا میں ان خداؤں کی سلطانی درہم برہم کر دی تھی، لیکن عمل کی زندگی میں انہیں نہیں چھیڑا گیا، وہ بدستور اپنی مسندوں پر جمے رہے"۔[۷]

شمنی مذہب اور اس کے تصورات

قدیم برہمنی مذہب کے بعد شمنی مذہب (یعنی بدھ مذہب) کا ظہور ہوا۔ اسلام کے ظہور

سے پہلے ہندوستان کا عام مذہب یہی تھا۔ شمنی مذہب کی اعتقادی مبادیات کی مختلف تفسیریں کی گئی ہیں۔ انیسویں صدی کے مستشرقوں کے ایک گروہ نے اسے اپ نشدوں کی تعلیم ہی کا ایک عملی استغراق قرار دیا تھا اور خیال کیا تھا کہ ''نروان'' میں جذب وانفصال کی روحانی اصل پوشیدہ ہے۔ یعنی جس سرچشمے سے انسانی ہستی نکلی ہے، پھر اسی میں واصل ہو جانا ''نروان'' یعنی نجات کامل ہے۔ لیکن اب عام طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے کہ شمنی مذہب خدا اور روح کی ہستی کا کوئی تصور نہیں رکھتا۔ اس کا دائرہ اعتقاد و عمل صرف زندگی کی سعادت اور نجات کے مسئلے میں محدود ہے۔ وہ صرف پرکرتی یعنی مادہ ازلی کا حوالہ دیتا ہے جسے کائناتی طبیعت حرکت میں لاتی ہے۔ نروان سے مقصود یہ ہے کہ ہستی کی انانیت فنا ہو جائے اور زندگی کے چکر سے نجات مل جائے اس میں شک نہیں کہ جہاں تک مابعد زمانے کی شمنی مفکروں کی تصریحات کا تعلق ہے، یہی تفسیر صحیح معلوم ہوتی ہے۔ اگر ان کا ایک گروہ لاادریت (Agnosticism) تک پہنچ کر رک گیا ہے تو دوسرا گروہ اس سے بھی آگے نکل گیا ہے اور مدیمانہ انکار کی راہ اختیار کی ہے موکشا کر گپتا نے ''ترک بھاشا''[8] میں ان تمام دلائل کا رد کیا ہے جو نیائے[9] اور ویشیسیک طریق نظر کے نظار خدا کی ہستی کے اثبات میں پیش کرتے تھے۔ تاہم یہ بات بھی قطعی طور پر نہیں کہی جاسکتی کہ خود گوتم بدھ کا سکوت وتوقف بھی انکار پر مبنی تھا۔ اس کے سکوتی تحفظات متعدد مسئلوں میں ثابت ہیں اور اس کے متعدد محمل قرار دیئے جاسکتے ہیں۔ اگر ان تمام اقوال پر جو براہ راست اس کی طرف منسوب ہیں، غور کیا جائے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس کا مسلک نفی ذات کا نہ تھا، نفی صفات کا تھا۔ اور نفی صفات کا مقام ایسا ہے کہ انسانی فکر وزبان کی تمام تعبیرات معطل ہو جاتی ہیں اور سکوت کے سوا چارہ کار باقی نہیں رہتا۔

علاوہ بریں یہ حقیقت بھی فراموش نہیں کرنی چاہئے کہ اس کے ظہور کے وقت اصنامی خدا پرستی کے مفاسد بہت گہرے ہو چکے تھے اور اصنامی خدا پرستی بجائے خود راہ حقیقت کی سب سے بڑی روک بن گئی تھی۔ اس نے اس روک سے راستہ صاف کر دینا چاہا اور تمام توجہ زندگی

کی عملی سعادت کے مسئلے پر مرکوز کر دی۔ اس صورت حال کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ برہمنی خدا پرستی کے عقائد سے انکار کیا جائے اور اس پر زور دیا جائے کہ نجات کی راہ ان معبودوں کی پرستش میں نہیں ہے، بلکہ علم حق اور عمل حق میں ہے، یعنی ''اشٹانگ مارگ''[80] میں ہے آگے چل کر اس اضافی انکار نے مطلق انکار کی شکل پیدا کر لی اور پھر برہمنی مذہب کی مخالفت کے غلو نے معاملے کو دور تک پہنچا دیا[81]

بہرحال خود گوتم بدھ اور اس کی تعلیم کے شارحوں کی تصریحات اس بارے میں کچھ ہی رہی ہوں، مگر یہ واقعہ ہے کہ اس کے پیرووں نے خدا کے تصور کی خالی مسند بہت جلد بھر دی ۔انہوں نے اس مسند کو خالی دیکھا تو خود گوتم بدھ کو وہاں لاکر بٹھا دیا اور پھر اس نئے معبود کی پرستش اس جوش وخروش کے ساتھ شروع کر دی کہ آدھی سے زیادہ دنیا اس کے بتوں سے معمور ہوگئی!

آوارۂ غربت نہ تو ان دید صنم را

وقتست دگر بتکدہ سازند حرم را

گوتم بدھ کی وفات پر ابھی زیادہ زمانہ نہیں گزرا تھا کہ پیروان بدھ کی اکثریت نے اس کی شخصیت کو عام انسانی سطح سے بالاتر دیکھنا شروع کر دیا تھا اور اس کے آثار وتبرکات کی پرستش کا میلان بڑھنے لگا تھا۔ اس کی وفات کے کچھ عرصے بعد جب مذہب کی پہلی مجلس اعظم راج گیری میں منعقد ہوئی اور اس کے شاگرد خاص آنند نے اس کی آخری وصایا بیان کیں تو بیان کیا جاتا ہے کہ لوگ اس کی روایت پر مطمئن نہ ہوئے اور اس کے مخالف ہو گئے ۔کیونکہ اس کی روایتوں میں انہیں وہ ماوراء انسانیت عظمت نظر نہیں آئی جسے اب ان کی طبیعت ڈھونڈنے لگی تھی۔ تقریباً سو برس بعد جب دوسری مجلس ویشالی (مظفر پور حالی) میں منعقد ہوئی تو اب مذہب کی بنیادی سادگی اپنی جگہ کھو چکی تھی اور اس کی جگہ نئے تصورں اور مخلوط عقیدوں نے لے لی تھی۔ اب مسیحی مذہب کے اقالیم ثلاثہ کی طرح جو پانچ سو برس بعد ظہور میں آنے والا تھا، ایک ثمنی اقالیم کا عقیدہ بدھ کی شخصیت کے گرد ھالے کی طرح

چمکنے لگا اور عام انسانی سطح سے وہ ماوراء تسلیم کر لی گئی۔ یعنی بدھ کی ایک شخصیت کے اندر تین وجودوں کی نمود ہوگئی۔ اس کی تعلیم کی شخصیت، اس کے دنیاوی وجود کی شخصیت، اس کے حقیقی وجود کی شخصیت جو لوک (بہشت) میں رہتی ہے۔ دنیا میں جب کبھی بدھ کا ظہور ہوتا ہے تو یہ اس حقیقی وجود کا ایک پرتو ہوتا ہے۔ نجات پانے کے معنی یہ ہوئے کہ آدمی حقیقی بدھ کے اسی ماوراء عالم مسکن میں پہنچ جائے۔

پہلی صدی مسیح میں بعہد کوشان جب چوتھی مجلس برشادر (پشاور حالی) میں منعقد ہوئی تو اب بنیادی مذہب کی جگہ ایک طرح کا کلیسائی مذہب قائم ہو چکا تھا اور بدھ کے اشٹا نگ مارگ (طریق ثمانیہ) کی عملی روح طرح طرح کی رسوم پرستیوں اور قواعد آرائیوں میں معدوم ہو چکی تھی۔

آخر کار پیروان بدھ دو بڑے فرقوں میں بٹ گئے۔ ''ھین یان'' (Hinayana) اور ''مہایان'' (Mohayana) پہلا فرقہ بدھ کی شخصیت میں ایک رہنما اور معلم کی انسانی شخصیت دیکھنی چاہتا تھا، لیکن دوسرے نے اسے پوری طرح ماوراء انسانیت کی زبانی سطح پر متمکن کر دیا تھا اور پیروان بدھ کی عام راہ وہی ہوگئی تھی۔ افغانستان، بامیان، وسط ایشیا، چین کوریا، جاپان، تبت، سب میں مہایان مذہب ہی کی تبلیغ و اشاعت ہوئی۔ چینی سیاح فاھین (Fa-Hien) جب چوتھی صدی مسیحی میں ہندوستان آیا تھا تو اس نے پورب کے ھین یان شمنیوں سے مباحثہ کیا تھا اور مہایان طریقے کی صداقت کے دلائل پیش کئے تھے۔ موجودہ زمانے میں سیلون کے سوا جہاں ھین یان طریقے کا ایک محرف بقیہ ''تھیراداد'' کے نام سے پایا جاتا ہے، تمام پیروان بدھ کا مذہب مہایان ہے۔

موجودہ زمانے کے بعض محققین ثمنیہ کا خیال ہے کہ اشوک کے زمانے تک بدھ مذہب میں بت پرستی کا عام رواج نہیں ہوا تھا، کیونکہ اس عہد تک کے جو بدھ آثار ملتے ہیں یاان میں بدھ کی شخصیت کسی بت کے ذریعے نہیں، بلکہ صرف ایک کنول کے پھول یا ایک خالی کرسی کی شکل میں دکھائی گئی ہے۔ پھر کنول اور خالی کرسی کی جگہ دو قدم نمودار ہونے لگے اور پھر

بتدریج قدموں کی جگہ خود بدھ کا پورا مجسمہ نمودار ہو گیا۔ اگر یہ استنباط صحیح تسلیم کر لیا جائے، جب بھی ماننا پڑے گا کہ اشوک کے زمانے کے بعد سے بدھ کے بتوں کی عام پرستش جاری ہو گئی تھی۔ اشوک کا عہد سنہ ۲۵۰ قبل از مسیح تھا۔

۳۔ ایرانی مجوسی تصور

زردشت کے ظہور سے پہلے مادا (میڈیا-Media) اور پارس میں ایک قدیم ایریانی[۸۲] طریق پرستش رائج تھا۔ ہندوستان کے ویدوں میں دیوتاؤں کی پرستش اور قربانیوں کے اعمال و رسوم جس طرح پائے جاتے ہیں، قریب قریب ویسے ہی عقائد و رسوم پارس اور مادا میں بھی پھیلے ہوئے تھے۔ دیوتائی طاقتوں کو ان کے دو بڑے مظہروں میں تقسیم کر دیا تھا۔ ایک طاقت روشن ہستیوں کی تھی جو انسان کو زندگی کی تمام خوشیاں بخشتی تھی۔ دوسری برائی کے تاریک عفریتوں کی تھی جو ہر طرح کی مصیبتوں اور ہلاکتوں کا سرچشمہ تھی۔ آگ کی پرستش کے لئے قربان گاہیں بنائی جاتی تھیں اور ان کے پجاریوں کو ''موگوش'' کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ اوستا کے گاتھا میں انہیں ''کارپان'' اور ''کاری'' کے نام سے بھی پکارا گیا ہے۔ آگے چل کر اسی ''موگوش'' نے آتش پرستی کا مفہوم پیدا کر لیا اور غیر قومیں ایرانیوں کو ''مگ'' اور ''مگوش'' کے نام سے پکارنے لگیں۔

عربوں نے اسی ''موگوش'' کو ''مجوس'' کر دیا۔

مزدیسنا

زردشت کا جب ظہور ہوا تو اس نے ایرانیوں کو ان قدیم عقائد سے نجات دلائی اور ''مزدیسنا'' کی تعلیم دی، یعنی دیوتاؤں کی جگہ ایک خدائے واحد ''اھورا مزدا'' کی پرستش کی۔ یہ اھورا مزدا یگانہ ہے، بے ہمتا ہے، بے مثال ہے، نور ہے، پاکی ہے، سرتا سر حکمت اور خیر ہے اور تمام کائنات کا خالق ہے۔ اس نے انسان کے لئے دو عالم بنائے۔ ایک عالم دنیوی زندگی کا ہے، دوسرا مرنے کے بعد کی زندگی کا: مرنے کے بعد جسم فنا ہو جاتا ہے۔ مگر روح باقی رہتی ہے اور اپنے اعمال کے مطابق جزا پاتی ہے۔

دیوتاؤں کی جگہ اس نے ''امش سپند'' اور ''یزتا'' کا تصور پیدا کیا'' یعنی فرشتوں کا۔ یہ فرشتے اھورا مزدا کے احکام کی تعمیل کرتے ہیں۔ برائی اور تاریکی کی طاقتوں کی جگہ ''انگرامے نیوش'' (Angrame Niyush) کی ہستی کی خبر دی، یعنی شیطان کی۔ یہی ''انگرامے نیوش'' پازندی زبان میں ''اھرمز'' ہو گیا۔

زردشت کی تعلیم میں ہندوستانی آریاؤں کے ویدی عقائد کا رد صاف نمایاں ہے۔ ایک ہی نام ایران اور ہندوستان دونوں جگہ ابھرتا ہے اور متضاد معنی پیدا کر لیتا ہے۔ اوستا کا ''اھورا'' سام اور یجر وید میں ''اسوار'' ہے اور اگرچہ رگ وید میں اس کا اطلاق اچھے معنوں پر ہوا تھا، مگر اب وہ برائی کی شیطانی روح بن گیا ہے، ویدوں کا 'اندرا' اوستہ کا ''انگرا'' ہو گیا۔ ویدوں میں وہ آسمان کا خدا تھا، اوستا میں زمین کا شیطان ہے۔ ہندوستان اور یورپ میں ''دیو'' (Dev) اور ''ڈے یوس'' (Deus) اور ''تھیوس'' (Theus) خدا کے لئے بولا گیا، لیکن ایران میں ''دیو'' کے معنی عفریتوں کے ہو گئے۔ گویا دونوں عقیدے ایک دوسرے سے لڑ رہے تھے۔ ایک کا خدا دوسرے کا شیطان ہو جاتا تھا اور دوسرے کا شیطان پہلے کے لئے خدا کا کام دیتا تھا۔ اسی طرح ہندوستان میں ''یم'' موت کی طاقت ہے اوستا کی روایتوں میں ''یم'' زندگی اور انسانیت کی سب سے بڑی نمود ہوئی اور پھر یہی ''یم'' جم ہو کر جمشید ہو گیا۔

فسا نہا کہ بہ بازیچۂ روز گار سرود
کنون بہ مسند جمشید و تاج کی بستند

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ چند صدیوں کے بعد ایران کے قدیم تصورات اور بیرونی اثرات پھر غالب آ گئے اور ساسانی عہد میں جب ''مزدیسنا'' کی تعلیم کی ازسرنو تدوین ہوئی تو قدیم مجوسی، یونانی اور زردشتی عقائد کا ایک مخلوط مرکب تھا اور اس کا بیرونی رنگ و روغن تو تمام تر مجوسی تصور ہی نے فراہم کیا تھا۔ اسلام کا جب ظہور ہوا تو یہی مخلوط تصور ایران کا قومی مذہبی تصور تھا۔ مغربی ہند کے پارسی مہاجر یہی تصور اپنے ساتھ ہندوستان لائے اور پھر یہاں کے

مقامی اثرات کی ایک تہہ اس پر اور چڑھ گئی۔

مجوسی تصور کی بنیاد ثنویت (Dualism) کے عقیدے پر تھی۔ یعنی خیر اور شر کی دو الگ الگ قوتیں ہیں۔ ''اھورامزدا'' جو کچھ کرتا ہے خیر اور روشنی ہے۔ ''انگرا مے نیوش'' یعنی اھرمن جو کچھ کرتا ہے شر اور تاریکی ہے۔ عبادت کی بنیاد سورج اور آگ کی پرستش پر رکھی گئی کہ روشنی یزدانی صفات کی سب سے بڑی مظہر ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ مجوسی تصور نے خیر اور شر کی گتھی یوں سلجھانی چاہی کہ کارخانۂ ہستی کی سربراہی دو متقابل اور متعارض قوتوں میں تقسیم کر دی۔

۴۔ یہودی تصور

یہودی تصور ابتداء میں ایک محدود نسلی تصور تھا۔ یعنی کتاب پیدائش کا ''یہوا'' خاندان اسرائیل کے نسلی خدا کی حیثیت سے نمایاں ہوا تھا، لیکن پھر یہ تصور بتدریج وسیع ہوتا گیا، یہاں تک کہ یشعیا دوم [۸۳] کے صحیفے میں ''تمام قوموں کا خدا'' اور ''تمام قوموں کا ھیکل'' نمایاں ہو گیا۔ تاہم ''اسرائیلی خدا'' کا نسلی اختصاص کسی نہ کسی شکل میں برابر کام کرتا ہی رہا اور ظہور اسلام کے وقت اس کے نمایاں خال وخط نسل اور جغرافیہ ہی کے خال وخط تھے۔

تجسم اور تنزیہ کے اعتبار سے وہ ایک درمیانی درجہ رکھتا تھا اور اس میں غالب عنصر قہر وغضب اور انتقام وتعذیب کا تھا۔ خدا کا بار بار متشکل ہو کر نمودار ہونا۔ مخاطبات کا تمام تر انسانی اوصاف وجذبات سے آلودہ ہونا، قہر وانتقام کی شدت اور ابتدائی درجے کا تمثیلی اسلوب تورات کے صحیفوں کا عام تصور ہے۔

خدا کا انسان سے رشتہ اس نوعیت کا رشتہ ہوا جیسے ایک شوہر کا اپنی بیوی سے ہوتا ہے۔ شوہر نہایت غیور ہوتا ہے۔ وہ اپنی بیوی کی ساری خطائیں معاف کر دے گا، لیکن یہ جرم معاف نہیں کرے گا کہ اس کی محبت میں کسی دوسرے مرد کو بھی شریک کرے۔ اسی طرح خاندان اسرائیل کا خدا بھی بہت غیور ہے۔ اس نے اسرائیل کے گھرانے کو اپنی چہیتی بیوی بنایا اور چونکہ چہیتی بیوی بنایا اس لئے خاندان اسرائیل کی بے وفائی اور غیر قوموں سے آشنائی اس پر بہت ہی شاق گزرتی ہے اور ضرور ہے کہ وہ اس جرم کے بدلے سخت سزائیں

دے۔ چنانچہ احکام عشرۃ (Ten Commandments) میں ایک حکم یہ بھی تھا ''تو کسی چیز کی صورت نہ بنائیو اور نہ اس کے آگے جھکیو، کیونکہ میں خداوند تیرا خدا رشک کرنے والا ایک بہت ہی غیور خدا ہوں''۔ (خروج ۲۰: ۴، ۵)

شوہر کے رشتے کی یہ تمثیل جو مصر سے خروج کے بعد متشکل ہونا شروع ہوگئی تھی، آخر عہد تک کم وبیش قائم رہی۔ یہودیوں کی ہر گمراہی پر خدا کے غضب کا اظہار ایک غضب ناک شوہر کا پر جوش اظہار ہوتا ہے جو اپنی چہیتی بیوی کو اس کی ایک ایک بے وفائی یاد دلا رہا ہو۔ یہ اسلوب تمثیل بظاہر کتنا ہی موثر اور شاعرانہ دکھائی دیتا ہو، لیکن اس میں شک نہیں کہ خدا کے تصور کے لئے ایک ابتدائی درجے کا غیر ترقی یافتہ تصور تھا۔

۵۔ مسیحی تصور

لیکن یشعیا دوم کے زمانہ سے اس صورت حال میں تبدیلی شروع ہوئی اور یہودی تصور میں بیک وقت وسعت اور لطافت دونوں طرح کے عناصر نمایاں ہونے لگے۔ گویا اب ایک نئ تصوری فضا کے لئے زمانے کا مزاج تیار ہونے لگا تھا۔ چنانچہ مسیحیت آئی تو رحم ومحبت اور عفوو بخشش کا ایک نیا تصور لے کر آئی۔ اب خدا کا تصور نہ تو جابر بادشاہ کی طرح قہر آلود تھا، نہ رشک وغیرت میں ڈوبے ہوئے شوہر کی طرح سخت گیر تھا، بلکہ باپ کی محبت وشفقت کی مثال نمایاں کرتا تھا۔ اور اس میں شک نہیں کہ یہودی تصور کی شدت وغلظت کے مقابلے میں رحم ومحبت کی رقت کا یہ ایک انقلابی تصور تھا۔ انسانی زندگی کے سارے رشتوں میں ماں باپ کا رشتہ سب سے بلند تر رشتہ ہے۔ اس میں شوہر کے رشتے کی طرح جذبوں اور خواہشوں کی غرضوں کو دخل نہیں ہوتا۔ یہ سراسر رحم وشفقت اور پرورش وچارہ سازی ہوتی ہے۔ اولاد بار بار قصور کرے گی، لیکن ماں کی محبت پھر بھی گردن نہیں موڑے گی اور باپ کی شفقت پھر بھی معافی سے انکار نہیں کرے گی۔ پس اگر خدا کے تصور کے لئے انسانی رشتوں کی مشابہتوں سے کام لئے بغیر چارہ نہ ہو تو بلاشبہ شوہر کی تمثیل کے مقابلے میں باپ کی تمثیل کہیں زیادہ شائستہ اور ترقی یافتہ تمثیل ہے۔[۸۴]

تجسم اور تنزہ کے لحاظ سے مسیحی تصور کی سطح اصلا وہی تھی جہاں تک یہودی تصور پہنچ چکا تھا۔ مگر جب مسیحی عقائد کا رومی اصنام پرستی کے تصوروں سے امتزاج ہوا تو اقالیم ثلاثہ، کفارہ اور مسیح پرستی کے تصورات چھا گئے اور اسکندریہ کے فلسفہ آمیز اصنامی تصور سیراپس (Serapis) نے مسیحی اصنامی تصور کی شکل اختیار کر لی۔ اب مسیحیت کو بت پرستوں کی بت پرستی سے تو انکار تھا، لیکن خود اپنی بت پرستی پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ میڈونا (Madonna) کے قدیم بت کی جگہ اب ایک نئی مسیحی میڈونا کا بت تیار ہو گیا۔ یہ خدا کے فرزند کو گود میں لئے ہوئے تھی اور ہر راسخ الاعتقاد مسیحی کی جبین نیاز کا سجدہ طلب کرتی تھی۔

غرضیکہ قرآن کا جب نزول ہوا تو مسیحی تصور رحم و محبت کی پدری تمثیل کے ساتھ اقانیم ثلاثہ، کفارہ اور تجسم کا ایک مخلوط ''اشراکی۔ توحیدی'' تصور تھا۔

فلاسفۂ یونان اور اسکندریہ کا تصور

ان تصوروں کے علاوہ ایک تصور فلاسفہ یونان کا بھی ہے جو اگرچہ مذاہب کے تصوروں کی طرح اقوام عالم کا تصور نہ ہو سکا، تاہم انسان کی فکری نشو و نما کی تاریخ میں اس نے بہت بڑا حصہ لیا اور اس لئے اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

تقریباً پانچ سو برس قبل از مسیح یونان میں توحید کا تصور نشو و نما پانے لگا تھا۔ اس کی سب سے بڑی معلم شخصیت سقراط (Socrates) کی حکمت میں نمایاں ہوئی جسے افلاطون (Plato) نے تدوین و انضباط کے جامے سے آراستہ کیا۔

جس طرح ہندوستان میں رگ وید کے دیویاتی تصورات نے بالآخر ایک ''رب الاربابی'' تصور کی نوعیت پیدا کر لی تھی اور پھر اسی رب الاربابی تصور نے بتدریج توحیدی تصور کی طرف قدم بڑھایا تھا۔ ٹھیک اسی طرح یونان میں بھی اولمپس (Olympus) کے دیوتاؤں کو بالآخر ایک رب الارباب ہستی کے آگے جھکنا پڑا اور پھر یہ رب الاربابی تصور بتدریج کثرت سے وحدت کی طرف قدم بڑھانے لگا۔ یونان کے قدیم ترین تصوروں کے معلوم کرنے کا تنہا ذریعہ اس کی پرانی شاعری ہے۔ جب ہم اس کا مطالعہ کرتے ہیں تو دو

عقیدے برابر پس پردہ کام کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ مرنے کے بعد کی زندگی اور ایک سب سے بڑی اور سب پر چھائی ہوئی الوہیت۔

آئیونی (Ionic) فلسفے نے جو یونانی مذاہب فلسفے میں سب سے زیادہ پرانا ہے، اجرام سماوی کی ان دیکھی روحوں کا اعتراف کیا تھا اور پھر ان روحوں کے اوپر کسی ایسی روح کا سراغ لگانا چاہا تھا جسے اصل کائنات قرار دیا جاسکے۔ پانچویں صدی قبل از مسیح فیثا غورث (Pythagoras) کا ظہور ہوا اور اس نے نئے نئے فکری عنصروں سے فلسفے کو آشنا کیا۔ فیثا غورث کے سفر ہند کی روایت صحیح ہو یا نہ ہو، لیکن اس میں شک نہیں کہ اس کے فلسفیانہ تصوروں میں ہندوستانی طریق فکر کی مشابہتیں پوری طرح نمایاں ہیں تناسخ کا غیر مشتبہ عقیدہ، پانچویں آسمانی عنصر (Quintaessentia) کا اعتراف، نفس انسانی کی انفرادیت کا تصور، مکاشفاتی طریق ادراک کی جھلک اور سب سے زیادہ یہ کہ ایک ''طریق زندگی'' کے ضابطے کا اہتمام، ایسے مبادیات ہیں جو ہمیں اپ نشد کے دائرہ فکر ونظر سے بہت قریب کر دیتے ہیں۔ فیثا غورث کے بعد انکسا غورث (Anaxagoras) نے ان مبادیات کو کلیاتی تصورات (Abstacts) کی نوعیت کا جامہ پہنایا اور اس طرح یونانی فلسفے کی وہ بنیاد استوار ہوگئی جس پر آگے چل کر سقراط اور افلاطون اپنی اپنی کلیاتی تصوریت کی عمارتیں کھڑی کرنے والے تھے۔

سقراط کی شخصیت میں یونان کے توحیدی اور تنزیہی اعتقاد کی سب سے بڑی نمود ہوئی۔ سقراط سے پہلے جو فلسفی گزرے تھے، انہوں نے قومی پرستش گاہوں کے دیوتاؤں سے کوئی تعرض نہیں کیا تھا، کیونکہ خود ان کے دل ودماغ بھی ان کے اثرات سے خالی نہیں ہوئے تھے۔ نفوس فلکی کے تصورات کی اگر اصل حقیقت معلوم کی جائے تو اس سے زیادہ نہیں نکلے گی کہ یونان کے کوابکی دیوتاؤں نے علم ونظر کے حلقوں سے روشناس ہونے کے لئے ایک نا فلسفیانہ نقاب اپنے چہروں پر ڈال لیا تھا۔ اور اب ان کی ہستی صرف عوام ہی کو نہیں بلکہ فلسفیوں کو بھی تسکین دینے کے قابل بنادی گئی تھی۔ یہ تقریباً ویسی ہی صورت حال تھی جو

ابھی تھوڑی دیر ہوئی ہم ہندوستان کی قدیم تاریخ کے صفحوں پر دیکھ رہے تھے۔ لیکن فکری غور وخوض کے نتائج ایک ایسی لچک دار صورت میں ابھرنے لگے کہ ایک طرف فسلفیانہ دماغوں کے تقاضوں کا بھی جواب دیا جا سکے، دوسری طرف عوام کے قومی عقائد سے بھی تصادم نہ ہو۔ ہندوستان کی طرح یونان میں بھی خواص وعوام کے فکر وعمل نے باہم دگر سمجھوتا کر لیا تھا، یعنی توحیدی اور اصنامی عقیدے ساتھ ساتھ چلنے لگے تھے۔

لیکن سقراط کا معنوی علو فکر اس عام سطح سے بہت بلند جا چکا تھا۔ وہ وقت کے اصنامی عقائد سے کوئی سمجھوتا نہیں کر سکا۔ اس کا توحیدی تصور تجسم اور تشبہ کی تمام آلودگیوں سے پاک ہو کر ابھرا۔ اس کی بے لوث خدا پرستی کا تصور اس درجہ بلند تھا کہ وقت کے عام مذہبی تصورات اسے سر اونچا کر کے بھی دیکھ نہیں سکتے تھے۔ اس کی حقیقت شناس نگاہ میں یونان کی اصنامی خدا پرستی اس سے زیادہ کوئی اخلاقی بنیاد نہیں رکھتی تھی کہ ایک طرح کا دکان دارانہ لین دین تھا جو اپنے خود ساختہ معبودوں کے ساتھ چکایا جاتا تھا۔ افلاطون یوئی فرا (Euthyphro) کے مکالمے میں ہمیں صاف صاف بتلاتا ہے کہ یونان کے دینی تصورات واعمال کی نسبت سقراط کے بے لاگ فیصلے کیا تھے۔ سقراط پر مذہبی بے احترامی کا الزام لگایا گیا تھا۔ وہ پوچھتا ہے کہ ''مذہبی احترام'' کی حقیقت کیا ہے۔ پھر جو جواب ملتا ہے وہ اسے اس نتیجے پر پہنچاتا ہے کہ ''مذہبی احترام'' گویا مانگنے اور دینے کا ایک فن ہوا۔ دیوتاؤں سے وہ چیز مانگنی جس کی ہمیں خواہش ہے اور انہیں وہ چیز دے دینی جس کی انہیں احتیاج ہے۔ مختصر یہ کہ تجارتی کاروبار کا ایک خاص ڈھنگ۔

ایسی بے پردہ تعلیم وقت کی دار وگیر سے بچ نہیں سکتی تھی اور نہ بچی، لیکن سقراط کی اولوالعزم روح وقت کی کوتاہ اندیشیوں سے مغلوب نہیں ہو سکتی تھی۔ اس نے ایک ایسے صبر واستقامت حق کے ساتھ جو صرف نبیوں اور شہیدوں ہی کے اندر گھر بنا سکتا ہے، زہر کا جام اٹھایا اور بغیر کسی تلخ کلامی کے پی لیا۔

تمنت سليمى ان نموت يحبها
فاهون شي عندنا ماتمنت

اس نے مرنے سے پہلے آخری بات جو کہی تھی وہ یہ تھی۔ وہ ایک کمتر دنیا سے بہتر دنیا کی طرف جا رہا ہے!

افلاطون نے سقراط کے باشانہ (Dialectic) افکار کو جو ایک معلم کے درس واملاء کی نوعیت رکھتے تھے، ایک مکمل ضابطے کی شکل دے دی اور منطقی تحلیل کے ذریعے انہیں کلیات وجوامع کی صورت میں مرتب کیا۔ اس نے اپنے تمام فلسفیانہ بحث ونظر کی بنیاد کلیات (Abstracts) پر رکھی اور حکومت سے لے کر خدا کی ہستی تک سب کو تصوریت (Idealism) کا جامہ پہنا دیا۔ اگر تصوریت محسوسات سے الگ ہستی رکھتی ہے تو ''ناؤس'' (Nous)[85] یعنی نفس ناطقہ بھی مادے سے الگ اپنی ہستی رکھتا ہے اور اگر نفس مادے سے الگ ہستی رکھتا ہے تو خدا کی ہستی بھی مادیات سے الگ اپنی نمود رکھتی ہے۔ اس نے انکساغورث کے مسلک کے خلاف دو نفسوں میں امتیاز کیا۔ ایک کو فانی قرار دیا، دوسرے کو لافانی۔ فانی نفس خواہشیں رکھتا ہے اور وہی مجسم ایغو (Ego) ہے۔ لیکن لافانی نفس کائنات کی اصل عاقلہ ہے اور جسمانی زندگی کی تمام آلائشوں سے یک قلم منزہ۔ یہی نفس کلی کی وہ الہی چنگاری ہے جس نے انسان کے اندر قوت مدرکہ کی روشنی کا چراغ روشن کر دیا ہے۔ یہاں پہنچ کر نفس کلی کا تصور بھی ایک طرح سے وحدۃ الوجودی تصور کی نوعیت پیدا کر لیتا ہے۔ دراصل ہندو فلسفے کا ''آتما'' اور یونانی فلسفے کا ''نفس'' ایک ہی مسمّٰی کے دو نام ہیں۔ یہاں ''آتما'' کے بعد ''پرم آتما'' نمودار ہوا تھا، وہاں نفس کے بعد نفس کلی نمودار ہوا۔

سقراط نے خدا کی ہستی کے لئے ''اگاتھو'' (Agatho) یعنی ''الخیر'' کا تصور قائم کیا تھا۔ وہ سرتاسر اچھائی اور حسن ہے۔ افلاطون وجود کی دنیاؤں سے بھی اوپر اڑا اور اس نے خیر بحث کا سراغ لگانا چاہا، لیکن سقراط کے صفاتی تصور پر کوئی اضافہ نہ کر سکا۔

ارسطو (Aristotle) جس نے فلسفے کو روحانی تصوروں سے خالص کر کے صرف

مشاہدے واحساسات کے دائرے میں دیکھنا چاہا تھا، اس سقراطی تصور کا ساتھ نہیں دے سکتا تھا۔ اس نے عقل اول اور عقل فعال کا تصور قائم کیا جو ایک ابدی، غیر متجزی اور بسیط بحث ہستی ہے۔ پس گویا سقراط اور افلاطون نے جس ذات کی صفت ''الخیر'' میں دیکھی تھی، ارسطو نے اسے ''العقل'' میں دیکھا اور اس منزل پر پہنچ کر رک گیا۔ اس سے زیادہ جو کچھ مشائی فلسفے (Peripatetic Philosophy) میں ہمیں ملتا ہے۔ وہ خود ارسطو کی تصریحات نہیں ہیں۔ اس کے یونانی اور عرب شارحوں کے اضافے ہیں۔

اس تمام تفصیل سے معلوم ہوا کہ ''الخیر'' اور ''العقل'' یونانی فلسفے کے تصور الوہیت کا ماحصل ہے۔

سقراط کے صفاتی تصور کو وضاحت کے ساتھ سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ افلاطون کی جمہوریت (Republic) کا حسب ذیل مکالمہ پیش نظر رکھا جائے۔ اس مکالمے میں اس نے تعلیم کے مسئلے پر بحث کی ہے اور واضح کیا ہے کہ اس کے بنیادی اصول کیا ہونے چاہئیں۔

اڈمنٹس (Adeimantus)[۸۲] نے سوال کیا کہ شاعروں کو خدا کا ذکر کرتے ہوئے کیا پیرایہ بیان اختیار کرنا چاہیے؟

سقراط: ہر حال میں خدا کی توصیف ایسی کرنی چاہیے جیسا کہ وہ اپنی ذات میں ہے، خواہ رزمی (Epic) شعر ہو خواہ غنائی (Lyric) علاوہ بریں اس میں کوئی شبہ نہیں کہ خدا کی ذات صالح ہے۔ پس ضروری ہے کہ اس کی صفات بھی اصلاح پر مبنی ہوں۔

اڈمنٹس: درست ہے۔

سقراط: اور یہ بھی ظاہر ہے کہ جو وجود صالح ہوگا، اس سے کوئی بات مضر صادر نہیں ہو سکتی اور جو ہستی غیر مضر ہوگی، وہ کبھی شر کی صانع نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح یہ بات بھی ظاہر ہے کہ جو ذات صالح ہوگی، ضروری ہے کہ نافع بھی ہو۔ پس معلوم ہوا کہ خدا صرف خیر کی علت ہے، شر کی علت نہیں ہو سکتا۔

اڈمنٹس: درست ہے۔

سقراط: اور یہیں سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ خدا کا تمام حوادث کی علت ہونا ممکن نہیں ، جیسا کہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے۔ بلکہ وہ انسانی حالات کے بہت ہی تھوڑے حصے کی علت ہے، کیونکہ ہم دیکھتے ہیں ہماری برائیاں بھلائیوں سے کہیں زیادہ ہیں اور برائیوں کی علت خدا کی صالح اور نافع ذات نہیں ہوسکتی۔ پس چاہیئے کہ صرف اچھائی ہی کو اس کی طرف نسبت دیں اور برائی کی علت کسی دوسری جگہ ڈھونڈھیں۔

اڈمنٹس: میں محسوس کرتا ہوں کہ یہ بات بالکل واضح ہے۔

سقراط: تو اب ضروری ہوا کہ ہم شاعروں کے ایسے خیالات سے متفق نہ ہوں جیسے ھومر (Homer) کے حسب ذیل شعروں میں ظاہر کیئے گئے ہیں۔ مشتری (Zeus)[87] کی ڈیوڑھی میں دو پیالے رکھے ہیں۔ ایک خیر کا ہے، ایک شر کا، اور وہی انسان کی بھلائی اور برائی کی تمام تر علت ہیں۔ جس انسان کے حصے میں خیر کے پیالے کی شراب آ گئی، اس کے لئے تمام تر خیر ہے۔ جس کے حصے میں شر کی آئی، اس کے لئے تمام تر شر ہے۔ اور پھر جس کسی کو دونوں پیالوں کا ملا جلا گھونٹ مل گیا، اس کے حصے میں اچھائی بھی آ گئی اور برائی بھی[88]

پھر اس کے بعد تجسم کے عقیدے پر بحث کی ہے اور اس سے انکار کیا ہے کہ "خدا ایک بازی گر اور بہروپیے کی طرح کبھی ایک بھیس میں نمودار ہوتا ہے، کبھی دوسرے بھیس میں"[89]

سکندریہ کا مذہب افلاطون جدید

تیسری صدی مسیحی میں اسکندریہ کے فلسفہ تصوف نے "مذہب افلاطون جدید" (Neo-Platonism) کے نام سے ظہور کیا جس کا بانی امونیس سکاس (Ammonius saccas) تھا۔ امونیس کا جانشین فلاطینس (Plotinus) ہوا اور فلاطینس کا شاگرد فورفوریوس (Porphyry) تھا جو اسکندر افرودیسی (Alexander of Aphrodisias) کے بعد ارسطو کا سب سے بڑا شارح تسلیم کیا گیا ہے اور جس نے افلاطونیہ جدیدہ کی مبادیات مشائی فلسفے میں مخلوط کر دیں۔ فلاطینس اور فورفوریوس کی تعلیم سرتا سر اسی اصل پر مبنی تھی جو ھندوستان میں اپنشد کے مذہب نے اختیار کی ہے، یعنی علم حق کا اصلی ذریعہ کشف ہے نہ کہ استدلال، اور معرفت کمال

مرتبہ یہ ہے کہ جذب وفنا کا مقام حاصل ہو جائے۔

خدا کی ہستی کے بارے میں فلاطینس بھی اسی نتیجہ پر پہنچا جس پر اپنشد کے مصنف اس سے بہت پہلے پہنچ چکے تھے۔ یعنی نفی صفات کا مسلک اس نے بھی اختیار کیا۔ ذات مطلق ہمارے تصور ادراک کی تمام تعبیرات سے ماوراء ہے، اس لئے ہم اس بارے میں کوئی حکم نہیں لگا سکتے۔ ''ذات مطلق ان چیزوں میں سے کوئی چیز بھی نہیں جو اس سے ظہور میں آئیں۔ ہم اس کی نسبت کوئی حکم نہیں لگا سکتے۔ ہم نہ تو اسے موجودیت سے تعبیر کر سکتے ہیں نہ جوہر سے، نہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ زندگی ہے۔ حقیقت ان تعبیروں سے وراء الوراء ہے۔''[90]

سقراط اور افلاطون نے حقیقت کو ''الخیر'' سے تعبیر کیا تھا۔ اس لئے فلاطینس وہاں تک بڑھنے سے انکار نہ کر سکا، لیکن اس سے آگے کی تمام راہیں بند کر دیں ''جب تم نے کہا ''الخیر'' تو بس یہ کہہ کر رک جاؤ اور اس پر اور کچھ نہ بڑھاؤ۔ اگر تم کسی دوسرے خیال کا اضافہ کرو گے تو ہر اضافے کے ساتھ ایک نئے نقص کی اس سے تقریب کرتے جاؤ گے''[91]

۔ ارسطو نے حقیقت کا سراغ عقول مجردہ کی راہ سے لگایا تھا اور علتہ العلل کو عقل اول سے تعبیر کیا تھا، مگر فلاطینس کا ''مطلق'' (Absolute) اس تعبیر کی گرانی بھی برداشت نہیں کر سکتا ''یہ بھی مت کہو کہ وہ عقل ہے، تم اس طرح اسے منقسم کرنے لگو گے''[92]

لیکن اگر ہم ''عقل'' کا اطلاق اس پر نہیں کر سکتے تو پھر ''الوجود'' اور ''الخیر'' کیونکر کہہ سکتے ہیں؟ اگر ہم اپنی متصورہ صفتوں میں سے کوئی صفت بھی اس کے لئے نہیں بول سکتے تو پھر وجودیت اور خیریت کی صفات بھی کیوں ممنوع نہ ہوں؟ اس اعتراض کا وہ خود جواب دیتا ہے۔

''ہم نے اگر اسے ''الخیر'' کہا تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم کوئی باقاعدہ تصدیق کسی خاص وصف کی کرنی چاہتے ہیں جو اس کے اندر موجود ہے۔ ہم اس تعبیر کے ذریعے صرف یہ بات واضح کرنی چاہتے ہیں کہ وہ ایک مقصد اور منتہیٰ ہے جس پر تمام سلسلے جا کر ختم ہو جاتے ہیں۔ یہ گویا ایک اصطلاح ہوئی جو ایک خاص غرض کے لئے کام میں لائی گئی ہے۔ اسی طرح اگر ہم اس کی نسبت وجود کا حکم لگاتے ہیں تو صرف اس لئے کہ عدم کے دائرے سے اسے باہر

رکھیں۔ وہ تو ہر چیز سے ماوراء ہے حتیٰ کہ وجود کے اوصاف وخواص سے بھی۔"[۹۳]

اسکندریہ کے کلیمنٹ (Clement) نے اس مسلک کا خلاصہ چند لفظوں میں کہہ دیا: "اس کی شناخت اس سے نہیں کی جاسکتی کہ وہ کیا ہے؟ صرف اس سے کی جاسکتی ہے کہ وہ کیا کچھ نہیں ہے"۔ یعنی یہاں صرف سلب ونفی کی راہ ملتی ہے، ایجاب واثبات کی رائیں بند ہیں۔

سر للسان النطق عنه اخرس!

باب صفات میں یہ وہی بات ہوئی جو اپنشد کی "نیتی نیتی" میں ہم سن چکے ہیں اور جس پر شنکر نے اپنے مذہب کی مبادیات کی عمارتیں استوار کی ہیں۔

ازمنہ وسطیٰ کے یہودی فلاسفہ نے بھی یہی مسلک اختیار کیا تھا۔ موسیٰ بن میمون (المتوفی سنہ ۶۰۵ ھ) خدا کو "الموجود" کہنے سے بھی انکار کرتا ہے اور کہتا ہے: ہم جوں ہی "موجود" کا وصف بولتے ہیں، ہمارے تصور پر مخلوق کے اوصاف وخواص کی پرچھائیاں پڑنے لگتی ہیں اور خدا ان اوصاف سے منزہ ہے۔ اس نے اس سے بھی انکار کیا کہ: خدا کو "وحدہ لاشریک" کہا جائے کیونکہ "وحدت اور "عدم شریک" کے تصورات بھی اضافی نسبتوں سے خالی نہیں۔ ابن میمون کا یہ مسلک دراصل فلسفہ اسکندریہ ہی کی بازگشت تھی۔

قرآنی تصور

بہر حال چھٹی صدی مسیحی میں دنیا کی خدا پرستانہ زندگی کے تصورات اس حد تک پہنچے تھے کہ قرآن کا نزول ہوا۔

اب غور کرو کہ قرآن کے تصور الٰہی کا کیا حال ہے؟ جب ہم ان تمام تصورات کے مطالعے کے بعد قرآن کے تصور پر نظر ڈالتے ہیں تو صاف نظر آجاتا ہے کہ تصور الٰہی کی تمام تصویروں میں اس کی تصویر جامع اور بلند تر ہے۔ اس سلسلے میں حسب ذیل امور قابل غور ہیں۔

ا۔ تنزیہ کی تکمیل

اولاً تجسم اور تنزیہ کے لحاظ سے قرآن کا تصور تنزیہ کی ایسی تکمیل ہے جس کی کوئی نمود اس وقت دنیا میں موجود نہیں تھی۔ قرآن سے پہلے تنزیہ کا بڑے سے بڑا مرتبہ جس کا ذہن انسانی

متحمل ہو سکتا تھا، یہ تھا کہ اصنام پرستی کی جگہ ایک ان دیکھے خدا کی پرستش کی جائے، لیکن جہاں تک صفات الٰہی کا تعلق ہے، انسانی اوصاف وجذبات کی مشابہت اور جسم وہیئت کے تمثل سے کوئی تصور بھی خالی نہ تھا۔ ہندوستان اور یونان کا حال ہم دیکھ چکے ہیں۔ یہودی تصور جس نے اصنام پرستی کی کوئی شکل بھی جائز نہیں رکھی تھی، وہ بھی اس طرح کے تشبہ وتمثل سے یکسر آلودہ ہے۔ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کا خدا کو ممرے کے بلوطون میں دیکھنا ،خدا کا حضرت یعقوب (علیہ السلام) سے کشتی لڑنا، کوہ طور پر شعلوں کے اندر نمودار ہونا، حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کا خدا کو پیچھے سے دیکھنا، خدا کا جوش غضب میں آ کر کوئی کام کر بیٹھنا اور پھر پچھتانا، بنی اسرائیل کو اپنی چہیتی بیوی بنالینا اور پھر اس کی بدچلنی پر ماتم کرنا، ہیکل کی تباہی پر اس کا نوحہ، اس کی انتڑیوں میں درد کا اٹھنا اور کلیجے میں سوراخ پڑ جانا تورات کا عام اسلوب بیان ہے۔

اصل یہ ہے کہ قرآن سے پہلے فکر انسانی اس درجہ بلند نہیں ہوا تھا کہ تمثیل کا پردہ ہٹا کر صفات الٰہی کا جلوہ دیکھ لیتا۔ اس لئے ہر تصور کی بنیاد تمام تر تمثیل وتشبیہ ہی پر رکھنی پڑی۔ مثلاً تورات میں ہم دیکھتے ہیں کہ ایک طرف زبور کے ترانوں اور یشعیا کی کتاب میں خدا کے لئے شایستہ صفات کا تخیل موجود ہے، لیکن دوسری طرف خدا کا کوئی مخاطبہ ایسا نہیں جو سرتاسر انسانی اوصاف وجذبات کی تشبیہہ سے مملو نہ ہو۔ حضرت مسیح نے جب چاہا کہ رحمت الٰہی کا عالم گیر تصور پیدا کریں تو وہ بھی مجبور ہوئے کہ خدا کے لئے باپ کی تشبیہ سے کام لیں۔ اسی تشبیہہ سے ظاہر پرستوں نے ٹھوکر کھائی اور ابنیت مسیح کا عقیدہ پیدا کر لیا۔

لیکن ان تمام تصورات کے بعد جب ہم قرآن کی طرف رخ کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا اچانک فکر وتصور کی ایک نئی دنیا سامنے آ گئی۔ یہاں تمثیل وتشبیہہ کے تمام پردے بیک دفعہ اٹھ جاتے ہیں۔ انسانی اوصاف وجذبات کی مشابہت مفقود ہو جاتی ہے، ہر گوشے میں مجاز کی جگہ حقیقت کا جلوہ نمایاں ہو جاتا ہے اور تجسم کا شائبہ تک باقی نہیں رہتا۔ تنزیہ اس مرتبہ کمال تک پہنچ جاتی ہے کہ:

لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ (۱۱:۴۲)

اس کے مثل کوئی شے نہیں، کسی چیز سے بھی تم اسے مشابہ نہیں ٹھہرا سکتے۔

لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ (۱۰۳:۶)

انسان کی نگاہیں اسے نہیں پا سکتیں، لیکن وہ انسان کی نگاہوں کو دیکھ رہا ہے۔ (اور وہ بڑا ہی باریک بین (اور) باخبر ہے)۔[۹۴]

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝ لَمْ يَلِدْ ۝ وَلَمْ يُوْلَدْ ۝ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝ (۱۱۲:۱-۴)

اللہ کی ذات یگانہ ہے، بے نیاز ہے، اسے کسی کی احتیاج نہیں، نہ تو اس سے کوئی پیدا ہوا، نہ وہ کسی سے پیدا ہوا، اور نہ کوئی ہستی اس کے درجے اور برابری کی ہوئی۔

تورات اور قرآن کے جو مقامات مشترک ہیں دقت نظر کے ساتھ ان کا مطالعہ کرو۔ تورات میں جہاں کہیں خدا کی براہ راست نمود کا ذکر کیا گیا ہے، قرآن وہاں خدا کی تجلی کا ذکر کرتا ہے تورات میں جہاں یہ پاؤ گے کہ خدا متشکل ہو کر اترا، قرآن اس موقع کی یوں تعبیر کرے گا کہ خدا کا فرشتہ متشکل ہو کر نمودار ہوا۔ بطور مثال کے صرف ایک مقام پر نظر ڈال لی جائے۔ تورات میں ہے۔

”خداوند نے کہا: اے موسیٰ دیکھ! یہ جگہ میرے پاس ہے تو اس چٹان پر کھڑا رہ اور یوں ہوگا کہ جب میرے جلال کا گزر ہوگا تو میں تجھے اس چٹان کی دراڑ میں رکھوں گا۔ اور جب تک نہ گزر لوں گا، تجھے اپنی ہتھیلی سے ڈھانپے رہوں گا۔ پھر ایسا ہوگا کہ میں ہتھیلی اٹھا لوں گا اور تو میرا پیچھا دیکھ لے گا، لیکن تو میرا چہرہ نہیں دیکھ سکتا“۔ (خروج ۳۳:۲۱-۲۳)

”تب خداوند بدلی کے ستون میں ہو کر اترا اور خیمے کے دروازے پر کھڑا رہا اس نے کہا کہ میرا بندہ موسیٰ اپنے خداوند کی شبیہ دیکھے گا“ (گنتی ۱۲:۵-۸)

اسی معاملے کی تعبیر قرآن نے یوں کی ہے:

قَالَ رَبِّ اَرِنِیۡۤ اَنۡظُرۡ اِلَیۡکَ ؕ قَالَ لَنۡ تَرٰىنِیۡ وَ لٰکِنِ انۡظُرۡ اِلَی الۡجَبَلِ
(۷:۱۴۳)

موسیٰ نے کہا: اے پروردگار! مجھے اپنا جلوہ دکھا تا کہ میں تیری طرف نگاہ کرسکوں۔
فرمایا نہیں، تو کبھی مجھے نہیں دیکھے گا، لیکن ہاں، اس پہاڑ کی طرف دیکھ!

تنزیہ اور تعطیل کا فرق

البتہ یادرہے کہ تنزیہ اور تعطیل میں فرق ہے۔ تنزیہ سے مقصود یہ ہے کہ جہاں تک عقل بشری کی پہنچ ہے، صفات الٰہی کو مخلوقات کی مشابہت سے پاک اور بلند رکھا جائے تعطیل کے معنی یہ ہیں کہ تنزیہ کے منع ونفی کو اس حد تک پہنچا دیا جائے کہ فکر انسانی کے تصور کے لئے کوئی بات باقی ہی نہ رہے۔ قرآن کا تصور تنزیہ کی تکمیل ہے، تعطیل کی ابتدا نہیں ہے۔

بلاشبہ اپنشد تنزیہ کی ''نیتی نیتی''[95] کو بہت دور تک لے گئے، لیکن عملاً نتیجہ کیا نکلا؟ یہی نا کہ ذات مطلق (برھمان) کو ذات متشخص (ایشور) میں اتارے بغیر کام نہ چل سکا۔

بنتی نہیں ہے بادہ وساغر کہے بغیر

جس طرح اثبات صفات میں غلو تشبہ کی طرف لے جاتا ہے، اسی طرح نفی صفات میں غلو تعطیل تک پہنچا دیتا ہے اور دونوں میں تصور انسانی کے لئے ٹھوکر ہوئی۔ اگر تشبہ اسے حقیقت سے ناآشنا کردیتا ہے تو تعطل اسے عقیدے کی روح سے محروم کردیتا ہے۔ پس یہاں ضروری ہوا کہ افراط اور تفریط دونوں سے قدم روکے جائیں اور تشبہ اور تعطیل دونوں کے درمیان راہ نکالی جائے۔ چنانچہ قرآن نے جو راہ اختیار کی ہے وہ دونوں راہوں کے درمیان جاتی ہے اور دونوں انتہائی سمتوں کے میلان سے بچتی ہوئی نکل گئی ہے۔

اگر خدا کے تصور کے لئے صفات وافعال کی کوئی صورت ایسی باقی نہ رہے جو فکر انسانی کی پکڑ میں آسکتی ہے تو کیا نتیجہ نکلے گا؟ یہی نکلے گا کہ تنزیہ کے معنی نفی وجود کے ہوجائیں گے، یعنی اگر کہا جائے ''ہم خدا کے لئے کوئی ایجابی صفت قرار نہیں دے سکتے، کیونکہ جو صفت بھی قرار دیں گے، اس میں مخلوق کے اوصاف سے مشابہت کی جھلک آجائے گی'' تو ظاہر ہے کہ

ایسی صورت میں فکر انسانی کے لئے کوئی سررشتہ تصور باقی نہیں رہے گا اور وہ کسی ایسی ذات کا تصور ہی نہیں کر سکے گا۔ اور جب تصور نہیں کر سکے گا تو ایسا عقیدہ اس کے اندر کوئی پکڑ اور لگاؤ بھی پیدا نہیں کر سکے گا۔ ایسا تصور اگرچہ اثبات وجود کی کوشش کرے، لیکن فی الحقیقت وہ نفی وجود کا تصور ہوگا، کیونکہ صرف سلبی تصور کے ذریعے ہم ہستی کو نیستی سے جدا کر سکتے۔

خدا کی ہستی کا اعتقاد انسانی فطرت کے اندرونی تقاضوں کا جواب ہے۔ اسے حیوانی سطح سے بلند ہونے اور انسانیت اعلیٰ کے درجے تک پہنچنے کے لئے بلندی کے ایک نصب العین کی ضرورت ہے اور اس نصب العین کی طلب بغیر کسی ایسے تصور کے پوری نہیں ہو سکتی جو کسی نہ کسی شکل میں اس کے سامنے آئے، لیکن مشکل یہ ہے کہ مطلق کا تصور سامنے آ نہیں سکتا۔ وہ جبھی آئے گا کہ ایجابی صفتوں کے تشخص کا کوئی نہ کوئی نقاب چہرے پر ڈال لے۔ چنانچہ ہمیشہ اس نقاب ہی کے ذریعے جمال حقیقت کو دیکھنا پڑا۔ یہ کبھی بھاری ہوا، کبھی ہلکا، کبھی پر خوف رہا، کبھی دل آویز، مگر اترا کبھی نہیں۔

آہ ازان حوصلہ تنگ و زان حسن بلند
کہ دلم را گلہ از حسرت دید از تو نیست

جمال حقیقت بے نقاب ہے، مگر ہماری نگاہوں میں یارائے دید نہیں۔ ہم اپنی نگاہوں پر نقاب ڈال کر اسے دیکھنا چاہتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس کے چہرے پر نقاب پڑ گیا۔

ہر چہ ہست از قامت ناساز و بی ندام ماست
ورنہ تشریف تو بر لالای کس دشوار نیست

غیر صفاتی تصور کو انسان پکڑ نہیں سکتا اور طلب اسے ایسے مطلوب کی ہوئی جو اس کی پکڑ میں آ سکے۔ وہ ایک ایسا جلوہ محبوبی چاہتا ہے جس کے عشق میں اس کا دل اٹک سکے۔ جس کے حسن گریزاں کے پیچھے وہ والہانہ دوڑ سکے۔ جس کا دامن کبریائی پکڑنے کے لئے ہمیشہ اپنا دست عجز و نیاز بڑھاتا رہے۔ جو اگرچہ زیادہ سے زیادہ بلندی پر ہو، لیکن پھر بھی اسے ہر دم جھانک لگائے تاک رہا ہو کہ اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ ۝ [92] (۸۹:۱۴) اور وَاِذَا سَاَلَكَ

عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ط اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۹۷ (۲:۱۸۶)

در پردہ و برھمہ کس پردہ می دری

با ہر کسی و با تو کسی را وصال نیست

غیر صفاتی تصور محض نفی وسلب ہوتا ہے اور اس سے انسانی طلب کی پیاس نہیں بجھ سکتی۔ ایسا تصور ایک فلسفیانہ تخیل ضرور پیدا کر دے گا، لیکن دلوں کا زندہ اور سرگرم عقیدہ نہیں بن سکے گا۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن نے جو راہ اختیار کی وہ ایک طرف تو تنزیہ کو اس کے کمال درجے پر پہنچا دیتی ہے، دوسری طرف تعطیل سے بھی تصور کو بچا لے جاتی ہے۔ وہ فرداً فرداً تمام صفات وافعال کا اثبات کرتا ہے۔ مگر ساتھ ہی مشابہت کی قطعی نفی بھی کرتا جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے: خدا حسن وخوبی کی ان تمام صفتوں سے جو انسانی فکر میں آسکتی ہیں متصف ہے۔ وہ زندہ ہے، قدرت والا ہے، پالنے والا ہے، رحمت والا ہے، دیکھنے والا، سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے، اور پھر اتنا ہی نہیں، بلکہ انسان کی بول چال میں قدرت واختیار اور ارادہ وفعل کی جتنی شائستہ تعبیرات ہیں، انہیں بھی بلا تامل استعمال کرتا ہے۔ مثلاً خدا کے ہاتھ تنگ نہیں

بَلْ يَدَاهُ مَبْسُوطَتَانِ (۵:۶۴)

اس کے تخت حکومت وکبریائی کے احاطے سے کوئی گوشہ باہر نہیں۔

وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضَ (۲:۲۵۵)

لیکن یہ بھی صاف صاف اور بے لچک لفظوں میں کہہ دیتا ہے کہ اس سے مشتبہ کوئی چیز نہیں جو تمہارے تصور میں آسکتی۔ وہ عدیم المثال ہے۔

لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ (۴۲:۱۱)

تمہاری نگاہ اسے پا ہی نہیں سکتی

لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ (۶:۱۰۳)

تم اس کے لئے اپنے تخیل سے مثالیں نہ گھڑو۔

فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ (۱۶:۷۴)

پس ظاہر ہے کہ اس کا زندہ ہونا ہمارے زندہ ہونے کی طرح نہیں ہوسکتا۔ اس کی پروردگاری ہماری پروردگاری کی طرح نہیں ہوسکتی، اس کا دیکھنا، سننا، جاننا ویسا نہیں ہوسکتا جس طرح کے دیکھنے، سننے اور جاننے کا ہم تصور کرسکتے ہیں۔ اس کی قدرت و بخشش کا ہاتھ اور جلال و احاطے کا عرش ضرور ہے، لیکن یقیناً اس کا مطلب وہ نہیں ہوسکتا جو ان الفاظ کے مدلولات سے ہمارے ذہن میں متشکل ہونے لگتا ہے۔

قرآن کے تصور الٰہی کا یہ پہلو فی الحقیقت اس راہ کی تمام درماندگیوں کا ایک ہی حل ہے اور ساری عمر کی سرگردانیوں کے بعد آخر کار اسی منزل پر پہنچ کر دم لینا پڑتا ہے۔ انسانی فکر جتنی بھی کاوشیں کرے گا، اس کے سوا اور کوئی حل پیدا نہیں کرسکے گا۔ یہاں ایک طرف بامِ حقیقت کی بلندی اور فکر کوتاہ کی نارسائیاں ہوئیں، دوسری طرف ہماری فطرت کا اضطرابِ طلب اور ہمارے دل کا تقاضائے دید ہوا۔ بام اتنا بلند کہ نگاہ تصور تھک تھک کے رہ جاتی ہے۔ تقاضائے دید اتنا سخت کہ بغیر کسی کا جلوہ سامنے لائے چین نہیں پاسکتا۔

نہ بہ اندازہ بازو ست کندم ھیہات
ورنہ با گوشہ بامیم سروکاری ھست

ایک طرف راہ کی اتنی دشواریاں، دوسری طرف طلب کی اتنی سہل اندیشیاں!

وَلَنِعْمَ مَا قِيْلَ:

ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے
دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

اگر تنزیہ کی طرف زیادہ جھکتے ہیں تو تعطیل میں جا گرتے ہیں۔ اگر اثبات صفات کی صورت آرائیوں میں دور نکل جاتے ہیں تو تشبہ اور تجسم میں کھوئے جاتے ہیں۔ پس نجات کی راہ صرف یہی ہوئی کہ دونوں کے درمیان قدم سنبھالے رکھیں۔ اثبات کا دامن بھی ہاتھ سے نہ چھوٹے، تنزیہ کی باگ بھی ڈھیلی نہ پڑنے پائے۔ اثبات اس کی دل آویز صفتوں کا مرقع کھینچے گا۔ تنزیہ تشبہ کی پرچھائیں بچاتی رہے گی۔ ایک کا ہاتھ حسن مطلق کو صورت

صفات میں جلوہ آرا کردے گا، دوسرے کا ہاتھ اسے اتنی بلندی پر تھامے رہے گا کہ تشبیہ کا گردوغبار اسے چھونے کی جرات نہیں کرسکے گا۔

بر چہرہ حقیقت اگر ماند پردہ
جرم نگاہ دیدہ صورت پرست ماست

اپنشد کے مصنفوں کا نفی صفات میں غلو معلوم ہے، لیکن مسلمانوں میں جب علم کلام کے مختلف مذاہب و آراء پیدا ہوئے تو ان کی نظری کاوشیں اس میدان میں ان سے بھی آگے نکل گئیں اور صفات باری کا مسئلہ بحث ونظر کا ایک معرکۃ الاراء مسئلہ بن گیا۔ جہمیہ اور باطنیہ قطعی انکار کی طرف گئے۔ معتزلہ نے انکار نہیں کیا لیکن ان کا رخ رہا اسی طرف۔ امام ابوالحسن اشعری نے گوخود معتدل راہ اختیار کی تھی (جیسا کہ کتاب الابانہ سے ظاہر ہے) لیکن ان کے پیرووں کی کاوشیں تاویل صفات میں دور تک چلی گئیں اور بحث ونزاع سے غلو کا رنگ پیدا ہو گیا۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی معاملے کی گتھی نہ سلجھا سکا۔ اگر گتھی سلجھی تو اسی طریقے سے سلجھی جو قرآن نے اختیار کیا ہے۔ امام جوینی یہ اقرار کرتے ہوئے دنیا سے گئے کہ:

"وھا انا ذاموت علی عقیدہ امی"

(میری ماں نے جو عقیدہ سکھلایا تھا اُس پر دنیا سے جا رہا ہوں)

اشاعرہ میں امام فخر الدین رازی سب سے زیادہ ان کاوشوں میں سرگرم رہے، لیکن بالآخر اپنی زندگی کی آخری تصنیف میں انہیں بھی اقرار کرنا پڑا تھا کہ:

لقد تاملت الطرق الکلامیۃ والمناھج الفلسفیۃ، فما رایتھا تشفی علیلا ولا تروی غلیلا. ورایت اقرب الطرق طریق القرآن. اقرا فی الاثبات "الرحمن علی العرش استوی" وفی النفی "لیس کمثلہ شیء" ومن جرب مثل تجربتی، عرف مثل معرفتی. (نقلہ ملا علی القاری فی شرح الفقہ الاکبر)

میں نے علم کلام اور فلسفے کے تمام طریقوں کو خوب دیکھا بھالا، لیکن بالآخر معلوم

ہوا کہ نہ تو ان میں کسی بیمار کے لئے شفا ہے، نہ کسی پیاسے کے لئے سیرابی۔ سب سے بہتر اور حقیقت سے نزدیک تر راہ وہی ہے جو قرآن کی راہ ہے۔ اثبات صفات میں پڑھو ''الرحمٰن علی العرش استوی'' اور نفی شبہ میں پڑھو لیس کمثلہ شی ء'' یعنی اثبات اور نفی دونوں کا دامن تھامے رہو۔ اور جس کسی کو میری طرح اس معاملے کے تجربے کا موقع ملا ہوگا اسے میری طرح یہ حقیقت معلوم ہوگئی ہوگی۔

یہی وجہ ہے اصحاب حدیث اور سلفیہ نے اس باب میں تفویض کا مسلک [98] اختیار کیا تھا اور تاویل صفات میں کاوشیں کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ اور اسی بناء پر انہوں نے جہمیہ کے انکار صفات کو تعطیل سے تعبیر کیا اور معتزلہ واشاعرہ کی تاویلوں میں بھی تعطیل کی بو سونگھنے لگے۔ متکلمین نے ان پر تجسم اور تشبہ کا الزام لگایا، لیکن وہ کہتے تھے کہ تمہارے تعطیل سے تو ہمارا نام نہاد تشبہ ہی بہتر ہے، کیونکہ یہاں عقیدے کے لئے ایک تصور تو باقی رہ جاتا ہے، تمہارے سلب و نفی کی کاوشوں کے بعد تو کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔ متاخرین اصحاب حدیث میں امام تیمیہ اور ان کے شاگرد امام ابن قیم نے اس مسئلے کی گہرائیوں کو خوب سمجھا اور اسی لئے سلف کے مسلک سے ادھر ادھر ہونا گوارا نہیں کیا۔

آریائی اور سامی نقطہ خیال کا اختلاف

آریائی اور سامی تعلیموں کے نقطہ خیال کا اختلاف ہم اس معاملے میں پوری طرح دیکھ لے سکتے ہیں۔ آریائی حکمت نے فطرت انسانی کی جس صورت پرستی کے تقاضے کا جواب مورتی پوجا کا دروازہ کھول کر دیا، قرآن نے اسے صرف صفات کی صورت آرائی سے پورا کر دیا اور پھر اس سے نیچے اترنے کی تمام راہیں بند کر دیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ان تمام مفاسد کے کھلنے کے دروازے بند ہو گئے جو بت پرستی کی غیر عقلی زندگی سے پیدا ہو سکتے تھے اور ہندوستان میں پیدا ہوئے۔

محکمات اور متشابہات

قرآن نے اپنے مطالب کی دو بنیادی قسمیں قرار دی ہیں۔ ایک کو ''محکمات'' سے تعبیر کیا ہے۔ دوسری کو ''متشابہات'' سے۔ ''محکمات'' سے وہ باتیں مقصود ہیں جو صاف صاف

انسان کی سمجھ میں آجاتی ہے اور اس کی عملی زندگی سے تعلق رکھتی ہیں اور اس لئے ایک سے زیادہ معانی کا ان میں احتمال نہیں۔ ''متشابہات'' وہ ہیں جن کی حقیقت وہ پا نہیں سکتا اور اس کے سوا چارہ نہیں کہ ایک خاص حد تک جا کر رک جائے اور بے نتیجہ باریک بینیاں نہ کرے۔

هُوَ الَّذِيٓ اَنۡزَلَ عَلَيۡكَ الۡكِتٰبَ مِنۡهُ اٰيٰتٌ مُّحۡكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الۡكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ؕ فَاَمَّا الَّذِيۡنَ فِىۡ قُلُوۡبِهِمۡ زَيۡغٌ فَيَتَّبِعُوۡنَ مَا تَشَابَهَ مِنۡهُ ابۡتِغَآءَ الۡفِتۡنَةِ وَابۡتِغَآءَ تَاۡوِيۡلِهٖ وَمَا يَعۡلَمُ تَاۡوِيۡلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ ؕ وَالرّٰسِخُوۡنَ فِى الۡعِلۡمِ يَقُوۡلُوۡنَ اٰمَنَّا بِهٖ كُلٌّ مِّنۡ عِنۡدِ رَبِّنَا وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّاۤ اُولُوا الۡاَلۡبَابِ ۝ (۳:۷)

صفات الٰہی کی حقیقت متشابہات میں داخل ہے۔ اس لئے قرآن کہتا ہے کہ اس باب میں فکری کاوشیں سودمند نہیں ہو سکتیں، بلکہ طرح طرح کی کج اندیشیوں کا دروازہ کھول دیتی ہیں۔ یہاں بجز تفویض کے چارہ کار نہیں۔ پس وہ تمام فلسفیانہ کاوشیں جو ہمارے متکلموں نے کی ہیں فی الحقیقت قرآن کے معیار تعلیم کا ساتھ نہیں دے سکتیں۔

اپنشد کا مرتبہ اطلاق اور مرتبہ تشخص

اس موقعے پر یہ بات بھی صاف صاف ہو جانی چاہیے کہ ویدانت سوتر اور اس کے سب سے بڑے شارح شنکر اچاریا نے نفی صفات پر جتنا زور دیا ہے، وہ حقیقت کے اس مرتبہ اطلاق سے تعلق رکھتا ہے جسے وہ ''برھمن'' سے تعبیر کرتے ہیں، یعنی ذات مطلق سے، لیکن اس سے انہیں بھی انکار نہیں کہ مرتبہ اطلاق کے نیچے ایک اور مرتبہ بھی ہے جہاں تمام صفات ایجابی کی نقش آرائی ظہور میں آجاتی ہے اور انسان کے تمام عابدانہ تصورات کا معبود وہی ذات متصف ہوتی ہے۔

اپنشد کے نزدیک ذات مطلق ''نیز و پادھیک ست'' اور ''نرگن'' ہے، یعنی تمام مظاہرات سے منزہ اور عدیم التوصیف ہے۔ اگر کوئی ایجابی صفت اس کی نسبت سے کہی بھی جا سکتی ہے تو وہ اسی سلب کا ایجاب ہے، یعنی وہ ''نرگونی'' ہے، عدیم الوصفی صفت سے

متصف۔ "ہم اس کی نسبت کچھ نہیں کہہ سکتے، کیونکہ ہم جو کچھ کہیں گے اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ لامحدود کو محدود بنا دیں گے۔ اگر محدود لامحدود کا تصور کر سکتا ہے تو پھر یا تو محدود کو لامحدود ماننا پڑے گا یا لامحدود کو محدود بن جانا پڑے گا۔" (شنکر ابھاشیا، برھم سوتر۔باب ۳) "ہم کسی چیز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جو الفاظ بولتے ہیں، وہ یا تو اس چیز کا تعلق کسی خاص نوع سے ظاہر کرتے ہیں، یا اس کے فعلی خواص بتلاتے ہیں۔ یا اس کی قسم کی خبر دیتے ہیں، یا کسی اور اضافی نوعیت کی وضاحت کرتے ہیں، لیکن برہمن کے لئے کوئی نوع نہیں ٹھہرائی جا سکتی۔ اس کی کوئی قسم نہیں، اس کے فعلی خواص بتلائے نہیں جا سکتے۔ اس کے لئے کوئی اضافت نہیں۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہ ایسا ہے، یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ وہ اس طرح کا نہیں ہے، کیونکہ اس کے لئے کوئی مشابہت نہیں۔ اور چونکہ مشابہت نہیں اس لئے اس کی عدم مشابہت اور غیرت بھی انسانی تصور میں نہیں لائی جا سکتی۔ مشابہت کی طرح ہماری نفی مشابہت بھی اضافی رشتے رکھتی ہے"۔ (ایضا باب اول وثانی)

غرض کہ حقیقت اپنے مرتبہ اطلاق میں ناممکن التعریف ہے۔ اور منطقی ماورائیت سے بھی ماوراء ہے اسی لئے ویدانت سوتر نے بنیادی طور پر ہستی کے دو دائرے ٹھہرا دیئے ایک کو ممکن التصور کہا ہے، دوسرے کو ناممکن التصور۔ ممکن التصور دائرہ پر کرتی، عناصر، ذہن، تعقل اور خودی کا ہے ناممکن التصور دائرہ برھمن (ذات مطلق) کا۔ یہی مذہب اسکندریہ کے افلاطونیہ جدیدہ کا بھی تھا اور حکماء اسلام اور صوفیاء نے بھی یہی مسلک اختیار کیا صوفیاء مرتبہ اطلاق کو مرتبہ "احدیت" سے تعبیر کرتے ہیں اور کہتے ہیں: "احدیت" ناممکن التصور، ناممکن التعبیر اور تمام منطقی ماورائیوں سے بھی وراء الوراء ہے۔

بنام آں کہ آں نامی نہ دارد
بہ ہر نامی کہ خوانی سر بر آرد

لیکن پھر مرتبہ اطلاق ایک ایسے مرتبے میں نزول کرتا ہے جس میں تمام ایجابی صفات کی صورت آرائی کا تشخص نمودار ہو جاتا ہے۔ اپنشد نے اسے "ایشور" سے اور صوفیاء نے

''واحدیت'' سے تعبیر کیا ہے۔ ویدانت سوتر کے شارحوں میں شنکر نے سب سے زیادہ اپنشد کے نفی صفات کے مسلک کو قائم رکھنا چاہا ہے اور اس باب میں بڑی کاوش کی۔ تاہم اسے بھی ''دسگن، برھمن''، یعنی ذات متشخص و متصف کے مرتبے کا اعتراف کرنا پڑا۔ اور گو اس مرتبے کے عرفان کو وہ ''اپرم'' یعنی فروتر مرتبے کا عرفان قرار دیتا ہے، مگر ساتھ ہی تسلیم کرتا ہے کہ ایک معبود ہستی کا تصور بغیر اس کے ممکن نہیں اور انسانی ذہن و ادراک کے لئے زیادہ سے زیادہ بلند پروازی جو یہاں ہو سکتی ہے وہ یہی ہے[99]

۲۔ صفات رحمت و جمال

ثانیاً تنزیہ کی طرح صفات رحمت و جمال کے لحاظ سے بھی قرآن کے تصور پر نظر ڈالی جائے تو اس کی شان تکمیل نمایاں ہے۔ نزول قرآن کے وقت یہودی تصور میں قہر و غضب کا عنصر غالب تھا۔ مجوسی تصور نے نور و ظلمت کی دو مساویانہ قوتیں الگ الگ بنالی تھیں۔ مسیحی تصور نے رحم و محبت پر زور دیا تھا، لیکن جزا کی حقیقت مستور ہو گئی تھی۔ اسی طرح پیروان بدھ نے بھی صرف رحم و محبت پر زور دیا، عدالت نمایاں نہیں ہوئی۔ گویا جہاں تک رحمت و جمال کا تعلق ہے یا تو قہر و غضب کا عنصر غالب تھا، یا مساوی تھا، یا پھر رحمت و محبت آئی تھی تو اسطرح آئی تھی کہ عدالت کے لئے کوئی جگہ باقی نہیں رہی تھی۔

لیکن قرآن نے ایک طرف تو رحمت و جمال کا ایک ایسا کامل تصور پیدا کر دیا کہ قہر و غضب کے لئے کوئی جگہ ہی نہ رہی، دوسری طرف جزاءِ عمل کا سررشتہ بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ کیونکہ جزاء کا اعتقاد قہر و غضب کی بنا پر نہیں، بلکہ عدالت کی بنا پر قائم کر دیا۔ چنانچہ صفات الٰہی کے بارے میں اس کا عام اعلان یہ ہے:

قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِادْعُوا الرَّحْمٰنَ ؕ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ؕ (۱۷:۱۱۰)

اے پیغمبر! ان سے کہہ دو تم خدا کو اللہ کے نام سے پکارو یا رحمٰن کہہ کر پکارو، جس صفت سے بھی پکارو اس کی ساری صفتیں حسن و خوبی کی صفتیں ہیں۔

یعنی وہ خدا کی تمام صفتوں کو "اسماء حُسنٰی" قرار دیتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ خدا کی کوئی صفت نہیں جو حسن وخوبی کی صفت نہ ہو۔ یہ صفتیں کیا کیا ہیں؟ قرآن نے پوری وسعت کے ساتھ انہیں جابجا بیان کیا ہے۔ ان میں ایسی صفتیں بھی ہیں جو بظاہر قہر وجلال کی صفتیں ہیں، مثلاً جبار، قہار، لیکن قرآن کہتا ہے وہ بھی "اسماء حُسنٰی" ہیں، کیونکہ ان میں قدرت وعدالت کا ظہور ہوا ہے۔ اور قدرت وعدالت حسن وخوبی ہے۔ خوں خواری وخوفناکی نہیں ہے۔ چنانچہ سورہ حشر میں صفات رحمت وجمال کے ساتھ قہر وجلال کا بھی ذکر کیا ہے اور پھر متصلاً ان سب کو "اسماء حُسنٰی" قرار دیا ہے۔

هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ ۚ سُبْحَانَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ○ هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ۚ يُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ○ (۵۹:۲۳-۲۴)

وہ اللہ ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ الملک ہے، القدوس ہے، السلام ہے، المومن ہے، المہیمن ہے، العزیز الجبار ہے، المتکبر ہے اور اس ہر اس جھے سے پاک ہے جو لوگوں نے اس کی معبودیت میں بنا رکھے ہیں۔ وہ الخالق ہے، الباری ہے، المصور ہے (غرض کہ) اس کے لئے حسن وخوبی کی صفتیں ہیں، آسمان وزمین میں جتنی بھی مخلوقات ہیں سب اس کی پاکی اور عظمت کی شہادت دے رہی ہیں اور بلاشبہ وہی ہے جو حکمت کے ساتھ غلبہ وتوانائی بھی رکھنے والا ہے۔

وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا ۠ وَذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اَسْمَآئِهٖ۔ (۷:۱۸۰)

اور اللہ کے لئے حسن وخوبی کی صفتیں ہیں، سو چاہئے کہ ان صفتوں سے اسے پکارو۔ اور جن لوگوں کا شیوہ یہ ہے کہ اس کی صفتوں میں کج اندیشیاں کرتے ہیں انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو۔

چنانچہ اسی لئے سورہ فاتحہ میں صرف تین صفتیں نمایاں ہوئیں۔ ربوبیت، رحمت اور عدالت۔ اور قہر وغضب کی کسی صفت کو یہاں جگہ نہ دی گئی۔

۳۔ اشراکی تصورات کا کلی انسداد

ثالثاً جہاں تک توحید و اشراک کا تعلق ہے قرآن کا تصور اس درجہ کامل اور بے لچک ہے کہ اس کی کوئی نظیر پچھلے تصورات میں نہیں مل سکتی۔

اگر خدا اپنی ذات میں یگانہ ہے تو ضروری ہے کہ وہ اپنی صفات میں بھی یگانہ ہو، کیونکہ اس کی یگانگت کی عظمت قائم نہیں رہ سکتی اگر کوئی دوسری ہستی اس کی صفات میں شریک وسہیم مان لی جائے۔ قرآن سے پہلے توحید کے ایجابی پہلو پر تو تمام مذاہب نے زور دیا تھا، لیکن سلبی پہلو نمایاں نہیں ہو سکا تھا۔ ایجابی پہلو یہ ہے کہ خدا ایک ہے۔ سلبی یہ ہے کہ اس کی طرح کا کوئی نہیں۔ اور جب اس کی طرح کا کوئی نہیں تو ضروری ہے کہ جو صفتیں اس کے لئے ٹھہرا دی گئی ہیں ان میں کوئی دوسری ہستی شریک نہ ہو۔ پہلی بات توحید فی الذات سے اور دوسری توحید فی الصفات سے تعبیر کی گئی ہے۔ قرآن سے پہلے اقوام عالم کی استعداد اس درجہ بلند نہیں ہوئی تھی کہ توحید فی الصفات کی نزاکتوں اور بندشوں کی متحمل ہو سکتی، اس لئے مذاہب نے تمام تر زور توحید فی الذات ہی پر دیا، توحید فی الصفات اپنی ابتدائی اور سادہ حالت میں چھوڑ دی گئی۔

چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں باوجودیکہ تمام مذاہب قبل از قرآن میں عقیدہ توحید کی تعلیم موجود تھی، لیکن کسی نہ کسی صورت میں شخصیت پرستی، عظمت پرستی اور اصنام پرستی نمودار ہوتی رہی اور رہنمایان مذاہب اس کا دروازہ بند نہ کر سکے۔

ہندوستان میں تو غالباً اول روز ہی سے یہ بات تسلیم کر لی گئی تھی کہ عوام کی تشفی کے لئے دیوتاؤں اور انسانی عظمت کی پرستاری ناگزیر ہے اور اس لئے توحید کا مقام صرف خواص کے لئے مخصوص ہونا چاہئے۔ فلاسفہ یونان کا بھی یہی خیال تھا۔ یقیناً وہ اس بات سے بے خبر نہ تھے کہ کوہ اولیمپس کے دیوتاؤں کی کوئی اصلیت نہیں، تاہم سقراط کے علاوہ کسی نے بھی

اس کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ عوام کے اصنامی عقائد میں خلل انداز ہو۔ وہ کہتے تھے۔ ''اگر دیوتاؤں کی پرستش کا نظام قائم نہ رہا تو عوام کی مذہبی زندگی درہم برہم ہو جائے گی'' فیثا غورث کی نسبت بیان کیا گیا ہے کہ جب اس نے اپنا مشہور حسابی قاعدہ معلوم کیا تھا تو اس کے شکرانے میں سو بچھڑوں کی قربانی دیوتاؤں کی نذر کی تھی۔

اس بارے میں سب سے زیادہ نازک معاملہ معلم و رہنما کی شخصیت کا تھا۔ یہ ظاہر ہے کہ کوئی تعلیم عظمت و رفعت حاصل نہیں کر سکتی جب تک معلم کی شخصیت میں بھی عظمت کی شان پیدا نہ ہو، لیکن شخصیت کی عظمت کے حدود کیا ہیں؟ یہیں آ کر سب کے قدموں نے ٹھوکر کھائی۔ وہ اس کی ٹھیک حد بندی نہ کر سکے، نتیجہ یہ نکلا کہ کبھی شخصیت کو خدا کا اوتار بنا دیا، کبھی ابن اللہ سمجھ لیا، کبھی شریک و سہیم ٹھہرا دیا۔ اور اگر یہ نہیں کیا تو کم از کم اس کی تعظیم میں بندگی و نیاز کی سی شان پیدا کر دی۔ یہودیوں نے اپنے ابتدائی عہد کی گمراہیوں کے بعد کبھی ایسا نہیں کیا کہ پتھر کے بت تراش کر ان کی پوجا کی ہو، لیکن اس بات سے وہ بھی نہ بچ سکے کہ اپنے نبیوں کی قبروں پر ہیکل تعمیر کر کے انہیں عبادت گاہوں کی سی شان و تقدیس دے دیتے تھے۔ گوتم بدھ کی نسبت معلوم ہے کہ اس کی تعلیم میں اصنام پرستی کیلئے کوئی جگہ نہیں تھی۔ اس کی آخری وصیت جو ہم تک پہنچی ہے یہ ہے ''ایسا نہ کرنا کہ میری نعش کی راکھ کی پوجا شروع کر دو۔ اگر تم نے ایسا کیا تو یقین کرو! نجات کی راہ تم پر بند ہو جائے گی''۔[1] لیکن اس وصیت پر جیسا کچھ عمل کیا گیا وہ دنیا کے سامنے ہے نہ صرف بدھ کی خاک اور یادگاروں پر معبد تعمیر کیے گئے، بلکہ مذہب کی اشاعت کا ذریعہ ہی یہ سمجھا گیا کہ اس کے مجسموں سے زمین کا کوئی گوشہ خالی نہ رہے۔ یہ واقعہ ہے کہ دنیا میں کسی معبود کے بھی اتنے مجسمے نہیں بنائے گئے جتنے گوتم بدھ کے بنائے گئے ہیں۔ اسی طرح ہمیں معلوم ہے کہ مسیحیت کی حقیقی تعلیم سرتاسر توحید کی تعلیم تھی لیکن ابھی اس کے ظہور پر پورے سو برس بھی نہیں گزرے تھے کہ الوہیت مسیح کا عقیدہ نشوونما پا چکا تھا۔

توحید فی الصفات

لیکن قرآن نے توحید فی الصفات کا ایسا کامل نقشہ کھینچ دیا کہ اس طرح کی لغزشوں کے

تمام دروازے بند ہو گئے۔ اس نے صرف توحید ہی پر زور نہیں دیا، بلکہ شرک کی راہیں بھی بند کر دیں اور یہی اس باب میں اس کی خصوصیت ہے۔

وہ کہتا ہے "ہر طرح کی عبادت اور نیاز کی مستحق صرف خدا ہی کی ذات ہے۔ پس اگر تم نے عابدانہ عجز و نیاز کے ساتھ کسی دوسری ہستی کے سامنے سر جھکایا تو توحید الٰہی کا اعتقاد باقی نہ رہا"۔ وہ کہتا ہے "وہ اسی کی ذات ہے جو انسانوں کی پکار سنتی اور ان کی دعائیں قبول کرتی ہے۔ پس اگر تم نے اپنی دعاؤں اور طلب گاریوں میں کسی دوسری ہستی کو بھی شریک کر لیا تو گویا تم نے اسے خدا کی خدائی میں شریک کر لیا"۔ وہ کہتا ہے: دعا، استعانت، رکوع، سجود، عجز و نیاز، اعتماد و توکل اور اس طرح کے تمام عبادت گزارانہ اور نیاز مندانہ اعمال وہ اعمال ہیں جو خدا اور اس کے بندوں کا باہمی رشتہ قائم کرتے ہیں۔ پس اگر ان اعمال میں تم نے کسی دوسری ہستی کو بھی شریک کر لیا تو خدا کے رشتہ معبودیت کی یگانگی باقی نہ رہی۔ اسی طرح عظمتوں، کبریائیوں، کارسازیوں اور بے نیازیوں کا جو اعتقاد تمہارے اندر خدا کی ہستی کا تصور پیدا کرتا ہے، وہ صرف خدا ہی کے لئے مخصوص ہونا چاہئے۔ اگر تم نے ویسا ہی اعتقاد کسی دوسری ہستی کے لئے بھی پیدا کر لیا تو تم نے اسے خدا کا ندیعنی شریک ٹھہرا لیا اور توحید کا اعتقاد درہم برہم ہو گیا۔

یہی وجہ ہے کہ سورہ فاتحہ میں اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ کی تلقین کی گئی۔ اس میں اول تو عبادت کے ساتھ استعانت کا بھی ذکر کیا گیا، پھر دونوں جگہ مفعول کو مقدم کیا جو مفید حصر ہے، یعنی "صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور صرف تجھی سے مدد طلب کرتے ہیں"۔ اس کے علاوہ تمام قرآن میں اس کثرت کے ساتھ توحید فی الصفات اور رد اشراک پر زور دیا گیا ہے کہ شاید ہی کوئی سورت بلکہ کوئی صفحہ اس سے خالی ہو۔

مقام نبوت کی حد بندی

سب سے زیادہ اہم مسئلہ مقام نبوت کی حد بندی کا تھا، یعنی معلم کی شخصیت کو اس کی اصلی جگہ میں محدود کر دینا، تاکہ شخصیت پرستی کا ہمیشہ کے لئے سد باب ہو جائے۔ اس بارے

میں قرآن نے جس طرح صاف اور قطعی لفظوں میں جا بجا پیغمبر اسلام کی بشریت اور بندگی پر زور دیا ہے محتاج بیان نہیں۔ ہم یہاں صرف ایک بات کی طرف توجہ دلائیں گے۔ اسلام نے اپنی تعلیم کا بنیادی کلمہ جو قرار دیا ہے، وہ سب کو معلوم ہے۔

اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ

یعنی ''میں اقرار کرتا ہوں کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں اور اقرار کرتا ہوں کہ محمد (ﷺ) خدا کے بندے اور اس کے رسول ہیں''۔

اس اقرار میں جس طرح خدا کی توحید کا اعتراف کیا گیا ہے، ٹھیک اسی طرح پیغمبر اسلام کی بندگی اور درجہ رسالت کا بھی اعتراف ہے۔ غور کرنا چاہئے کہ ایسا کیوں کیا گیا؟ صرف اس لئے کہ پیغمبر اسلام کی بندگی اور درجہ رسالت کا اعتقاد اسلام کی اصل واساس بن جائے اور اس کا کوئی موقع ہی باقی نہ رہے کہ عبدیت کی جگہ معبودیت کا اور رسالت کی جگہ اوتار کا تخیل پیدا ہو۔ ظاہر ہے کہ اس سے زیادہ اس معاملہ کا تحفظ کیا کیا جا سکتا تھا؟ کوئی شخص دائرہ اسلام میں داخل ہی نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ خدا کی توحید کی طرح پیغمبر اسلام کی بندگی کا بھی اقرار نہ کرلے۔

یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں پیغمبر اسلام ﷺ کی وفات کے بعد مسلمانوں میں بہت سے اختلاف پیدا ہوئے لیکن ان کی شخصیت کے بارے میں کبھی کوئی سوال پیدا نہیں ہوا۔ ابھی ان کی وفات پر چند گھنٹے بھی نہیں گزرے تھے کہ حضرت ابوبکرؓ نے برسر منبر اعلان کر دیا تھا:

مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يَعْبُدُ مُحَمَّدًا فَاِنَّ مُحَمَّدًا قَدْ مَاتَ وَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ يَعْبُدُ اللّٰهَ فَاِنَّ اللّٰهَ حَیٌّ لَّا يَمُوْتُ[۱۰۲] (بخاری)

جو کوئی تم میں محمد ﷺ کی پرستش کرتا تھا، سو اسے معلوم ہونا چاہئے کہ محمد (ﷺ) نے وفات پائی، اور جو کوئی تم میں سے اللہ کی پرستش کرتا تھا تو اسے معلوم ہونا چاہئے کہ اللہ کی ذات ہمیشہ زندہ ہے، اس کے لئے موت نہیں۔

۴۔ عوام اور خواص دونوں کے لئے ایک تصور

رابعاً، قرآن سے پہلے علوم وفنون کی طرح مذہبی عقائد میں بھی خاص وعام کا امتیاز ملحوظ رکھا

جاتا تھا اور خیال کیا جاتا تھا کہ خدا کا ایک تصور تو حقیقی ہے اور خواص کیلئے ہے، ایک تصور مجازی ہے اور عوام کیلئے ہے۔ چنانچہ ہندوستان میں خداشناسی کے تین درجے قرار دیئے گئے۔

عوام کے لئے دیوتاؤں کی پرستش، خواص کیلئے براہ راست خدا کی پرستش، اخص الخواص کیلئے وحدۃ الوجود کا مشاہدہ۔ یہی حال فلاسفہ یونان کا تھا وہ خیال کرتے تھے کہ ایک غیر مرئی اور غیر مجسم خدا کا تصور صرف اہل علم وحکمت ہی کر سکتے ہیں۔ عوام کے لئے اسی میں امن ہے کہ دیوتاؤں کی پرستاری میں مشغول رہیں۔

لیکن قرآن نے حقیقت ومجاز یا خاص وعام کا کوئی امتیاز باقی نہ رکھا۔ اس نے سب کو خدا پرستی کی ایک ہی راہ دکھائی اور سب کیلئے صفات الٰہی کا ایک ہی تصور پیش کر دیا۔ وہ حکماء وعرفاء سے لے کر جہال وعوام تک سب کو حقیقت کا ایک ہی جلوہ دکھاتا ہے اور سب پر اعتقاد وایمان کا ایک ہی دروازہ کھولتا ہے۔ اس کا تصور جس طرح ایک حکیم وعارف کیلئے سرمایہ تفکر ہے، اسی طرح ایک چرواہے اور دہقان کے لئے سرمایہ تسکین۔

اس سلسلے میں معاملے کا ایک اور پہلو بھی قابل غور ہے۔ ہندوستان میں خواص اور عوام کے خدا پرستانہ تصوروں میں جو فرق مراتب ملحوظ رکھا گیا، وہ معاملے کو اس رنگ میں بھی نمایاں کرتا ہے کہ یہاں کا مذہبی نقطہ خیال ابتداء سے فکر وعمل کی رواداری پر مبنی رہا ہے، یعنی کسی دائرہ فکر کو بھی اتنا تنگ اور بے لچک نہیں رکھا گیا کہ کسی دوسرے دائرے کی اس میں گنجائش ہی نہ نکل سکے۔ یہاں خواص توحید کی راہ پر گامزن ہوئے، لیکن عوام کیلئے دیوتاؤں کی پرستش اور مورتیوں کی معبودیت کی راہیں بھی کھلی چھوڑ دی گئیں۔ گویا ہر عقیدے کو جگہ دی گئی، ہر عمل کیلئے گنجائش نکالی گئی اور ہر طور طریقے کو آزادانہ نشو ونما کا موقع مل گیا۔ مذہبی اختلاف جو دوسری قوموں میں باہمی جنگ وجدال کا ذریعہ رہا ہے، یہاں آپس کے سمجھوتوں کا ذریعہ بنا اور ہمیشہ متعارض اصول باہم دگر ٹکرانے کی جگہ ایک دوسرے کیلئے جگہیں نکالتے رہے۔ تخالف کی حالت میں تفاہم اور تعارض کی حالت میں تطابق، گویا یہاں کے ذہنی مزاج کی عام خصوصیت تھی۔ ایک ویدانتی جانتا ہے کہ اصل حقیقت اشراک اور بت پرستی

کے عقائد سے بالاتر ہے، تاہم یہ جاننے پر بھی وہ بت پرستی کا منکر و مخالف نہیں ہو جاتا، کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ پسماندگان راہ کیلئے یہ بھی ایک ابتدائی منزل ہوئی اور رہ رو کوئی راہ اختیار کرے، مگر مقصود اصلی ہر حال میں سب کا ایک ہی ہے۔

خواہ از طریق میکدہ خواہ از رہ حرم
از ہر جہت کہ شاد شوی فتح باب گیر

چنانچہ چند سال ہوئے پروفیسر سی-ای-ام-جوڈ (Joad) نے ہندوستان کے تاریخی خصائص پر نظر ڈالتے ہوئے اس خصوصیت کو سب سے زیادہ نمایاں جگہ دی تھی اور اس سے پہلے دوسرے اہل قلم بھی اس پہلو پر زور دے چکے ہیں۔

ہمیں چاہئے معاملے کے اس پہلو پر بھی ایک نظر ڈال لیں۔ ہندو رواداری بلاشبہ فکر وعمل کی اس روادارانہ سوچ کا جو ہندوستان کی تاریخ میں برابر ابھرتی رہی ہے، ہمیں اعتراف کرنا چاہئے، لیکن معاملہ صرف اتنے ہی پر ختم نہیں ہو جاتا۔ زندگی کے حقائق کے تقاضوں کا یہاں کچھ عجیب حال ہے۔ یہاں ہم کسی ایک گوشے ہی کے ہو کر نہیں رہ جا سکتے۔ دوسرے گوشوں کی بھی خبر رکھنی پڑتی ہے اور فکر وعمل کی ہر راہ اتنی دور تک چلی گئی ہے کہ کہیں نہ کہیں جا کر حد بندی کی لکیریں کھینچنی پڑتی ہیں۔ اگر ایسا نہ کریں تو علم و اخلاق کے تمام احکام متزلزل ہو جائیں۔ اور اخلاقی اقدار کی کوئی مستقل حیثیت باقی نہ رہے۔ رواداری یقیناً ایک خوبی کی بات ہے، لیکن ساتھ ہی عقیدے کی مضبوطی، رائے کی پختگی اور فکر کی استقامت کی خوبیوں سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ پس یہاں کوئی نہ کوئی حد بندی کا خط ضرور ہونا چاہئے۔ جو ان تمام خوبیوں کو اپنی اپنی جگہ قائم رکھے۔ اخلاق کے تمام احکام انہیں حد بندیوں کے خطوط سے بنتے اور ابھرتے ہیں۔ جونہی یہ ملنے لگتے ہیں، اخلاق کی پوری دیوار ہل جاتی ہے۔ عفو و درگزر بڑی ہی حسن و خوبی کی بات ہے، لیکن یہی عفو و درگزر جب اپنی حد بندی کے خط سے آگے بڑھ جاتا ہے تو عفو و درگزر نہیں رہتا، اسے بزدلی اور بے ہمتی کے نام سے پکارنے لگتے ہیں۔ شجاعت انسانی سیرت کا سب سے بڑا وصف ہے، لیکن یہی

وصف جب اپنی حد سے گزر جائے گا تو نہ صرف اس کا حکم ہی بدل جائے گا، بلکہ صورت بھی بدل جائے گی۔ اب اسے دیکھئے تو وہ شجاعت نہیں ہے، قہر وغضب اور ظلم وتشدد ہو گیا ہے۔

دو حالتیں ہیں اور دونوں کا حکم ایک نہیں ہو سکتا۔ ایک حالت یہ ہے کہ کسی خاص اعتقاد اور عمل کی روشنی ہمارے سامنے آگئی ہے اور ہم ایک خاص نتیجے تک پہنچ گئے ہیں۔ اب اس کی نسبت ہمارا طرز عمل کیا ہونا چاہیے؟ ہم اس پر مضبوطی کے ساتھ جمے رہیں یا متزلزل رہیں؟ دوسری حالت یہ ہے کہ جس طرح ہم کسی خاص نتیجے تک پہنچے ہیں، اسی طرح ایک دوسرا شخص بھی دوسرے نتیجے تک پہنچ گیا ہے، اور یہاں فکر وعمل کی ایک ہی راہ سب کے آگے نہیں کھلتی۔ اب ہمارا طرز عمل اس شخص کی نسبت کیا ہونا چاہیے؟ ہماری طرح اسے بھی اپنی راہ چلنے کا حق ہے یا نہیں؟ رواداری کا صحیح محل دوسری حالت ہے، پہلی نہیں ہے۔ اگر پہلی حالت میں وہ آئے گی تو یہ رواداری نہ ہوگی، اعتقاد کی کمزوری اور یقین کا فقدان ہوگا۔

رواداری یہ ہے کہ اپنے حق اعتقاد وعمل کے ساتھ دوسرے کے حق اعتقاد وعمل کا بھی اعتراف کیجئے۔ اور اگر دوسرے کی راہ آپ کو صریح غلط دکھائی دے رہی ہے، جب بھی اس کے اس حق سے انکار نہ کیجئے کہ وہ اپنی غلط راہ پر بھی چل سکتا ہے، لیکن اگر رواداری کے حدود یہاں تک بڑھا دیئے گئے کہ وہ آپ کے عقیدوں میں بھی مداخلت کر سکتی ہے اور آپ کے فیصلوں کو بھی نرم کر دے سکتی ہے تو پھر یہ رواداری نہ ہوئی۔ استقامت فکر کی نفی ہوگئی۔

مفاہمت زندگی کی ایک بنیادی ضرورت ہے اور ہماری زندگی ہی سر تا سر مفاہمت ہے، لیکن ہر راہ کی طرح یہاں بھی حد بندی کی کوئی لکیر کھینچنی پڑے گی، اور جس حد پر بھی جا کر لکیر کھینچی گئی، معاً عقیدہ پیدا ہو گیا۔ اب جب تک عقیدے کی تبدیلی کی کوئی روشنی سامنے نہیں آتی، آپ مجبور ہیں کہ اس پر جمے رہیں اور اس میں کانٹ چھانٹ نہ کریں۔ آپ دوسروں کے عقائد کا احترام ضرور کریں گے، لیکن اپنے عقیدے کو بھی کمزوری کے حوالے نہیں ہونے دیں گے۔

کتنی ہی مصیبتیں ہیں جو اعتقاد اور عمل کے تمام گوشوں میں اسی دروازے سے آئیں کہ ان دو مختلف حالتوں کا امتیازی خط اپنی جگہ سے ہل گیا۔ اگر اعتقاد کی مضبوطی آئی تو اتنی دور

تک چلی گئی کہ رواداری کے تمام تقاضے بھلا دیئے گئے اور دوسروں کے اعتقاد و عمل میں جبراً مداخلت کی جانے لگی۔ اگر رواداری آئی تو اس بے اعتدالی کے ساتھ آئی کہ استقامت فکر ورائے کیلئے کوئی جگہ نہ رہی، ہر عقیدہ لچک گیا، ہر یقین ہلنے لگا۔ پہلی بے اعتدالی کی مثالیں ہمیں ان مذہبی تنگ نظریوں اور سخت گیریوں میں ملتی ہیں جن کی خوں چکاں داستانوں سے تاریخ کے اوراق رنگین ہو چکے ہیں۔ دوسری بے اعتدالی کے نتائج کی مثال ہمیں ہندوستان کی تاریخ مہیا کر دیتی ہے۔ یہاں فکر و عقیدے کی کوئی بلندی بھی وہم و جہالت کی گراوٹ سے اپنے آپ کو محفوظ نہ رکھ سکی اور علم و عقل اور وہم و جہل میں ہمیشہ سمجھوتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ ان سمجھوتوں نے ہندوستانی دماغ کی شکل وصورت بگاڑ دی۔ اس کی فکری ترقیوں کا تمام حسن اصنامی عقیدوں اور وہم پرستیوں کے گرد وغبار میں چھپ گیا۔

زمانہ حال کے مورخون نے اس صورت حال کا اعتراف کیا ہے۔ ہمارے زمانے کا ایک قابل ہندو مصنف اس عہد کی فکری حالت پر نظر ڈالتے ہوئے جب آریائی تصورات ہندوستان کے مقامی مذاہب سے مخلوط ہونے لگے تھے، تسلیم کرتا ہے کہ "ہندو مذہب کی مخلوط نوعیت کی توضیح ہمیں اس صورت حال میں مل جاتی ہے۔ صحرا نورد قبائل کے وحشیانہ توہمات سے لے کر اونچے سے اونچے درجے کے تہہ رس غور وخوض تک ہر درجے اور ہر دائرہ فکر کے خیالات یہاں باہم دگر ملتے اور مخلوط ہوتے رہے۔ آریائی مذہب اول روز سے کشادہ دل، خود رو اور روادار تھا۔ وہ جب کبھی کسی نئے موثر سے دوچار ہوا تو خود سمٹتا گیا اور جگہیں نکالتا رہا۔ اس کی اس مزاجی حالت میں ہم ایک سچے انکسار طبع اور رہمدردانہ مفاہمت کا شائستہ رجحان محسوس کرتے ہیں۔ ہندو دماغ اس کیلئے تیار نہیں ہوا کہ نچلے درجے کے مذہبوں کو نظر انداز کر دے یا لڑ کر ان کی ہستی مٹا دے۔ اس کے اندر ایک مذہبی مجنون کا غرور نہیں تھا کہ صرف اسی کا مذہب سچا مذہب ہے۔ اگر انسانوں کے ایک گروہ کو کسی ایک معبود کی پرستش اس کے طور طریقے پر تسکین قلب مہیا کر دیتی ہے تو تسلیم کر لینا چاہئے کہ یہ بھی سچائی کی ایک راہ ہے۔ مکمل سچائی پر کوئی بیک دفعہ قابض نہیں ہوسکتا۔ وہ صرف بتدریج اور بہ تفریق ہی

حاصل کی جاسکتی ہے اور یہاں ابتدائی اور عارضی درجوں کو ابھی ان کی ایک جگہ دینی پڑتی ہے۔ ہندو دماغ نے رواداری اور باہمی مفاہمتوں کی یہ راہ اختیار کر لی، لیکن وہ یہ بات بھول گیا کہ بعض حالات ایسے بھی ہوتے ہیں جب رواداری کی جگہ نارواداری ایک فضیلت کا حکم پیدا کر لیتی ہے۔ اور مذہبی معاملات میں بھی گریشم (Gresham)[۱۰۳] کے قانون کی طرح کا ایک قانون کام کرتا رہتا ہے۔ جب آریائی اور غیر آریائی مذاہب باہم دگر ملے، ایک شائستہ اور دوسرا ناشائستہ، ایک اچھی قسم کا، دوسرا نکما، تو غیر شائستہ اور نکمے اجزاء میں قدرتی طور پر یہ میلان پیدا ہو گیا کہ شائستہ اور اچھے اجزاء کو دبا کر معطل کر دے"۔[۱۰۴]

بہرحال قرآن کے تصور الٰہی کی ایک بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے کسی طرح کی اعتقادی مفاہمت اس بارے میں جاری نہیں رکھی۔ وہ اپنے توحیدی اور تنزیہی تصور میں سرتاسر بے میل اور بے لچک رہا۔ اس کی یہ مضبوط جگہ کسی طرح بھی ہمیں روادارانہ طرز عمل سے روکنا نہیں چاہتی، البتہ اعتقادی مفاہمتوں کے تمام دروازے بند کر دیتی ہے۔

خامساً، قرآن نے تصور الٰہی کی بنیاد انسان کے عالم گیر وجدانی احساس پر رکھی ہے، یہ نہیں کیا ہے کہ اسے نظر و فکر کی کاوشوں کا ایک ایسا معمہ بنا دیا ہو جسے کسی خاص طبقے کا ذہن ہی حل کر سکے۔ انسان کا عالمگیر وجدانی احساس کیا ہے؟ یہ ہے کہ کائنات ہستی خود بخود پیدا نہیں ہو گئی، پیدا کی گئی ہے، اور اس لئے ضروری ہے کہ ایک صانع ہستی موجود ہو۔ پس قرآن بھی اس بارے میں عام طور پر جو کچھ بتلاتا ہے، وہ اتنا ہی ہے، اس سے زیادہ جو کچھ ہے، وہ مذہبی عقیدے کا معاملہ نہیں ہے، انفرادی اور ذاتی تجربے و احوال کا معاملہ ہے۔ اس لیے وہ اس کا بوجھ جماعت کے افکار پر نہیں ڈالتا، اسے اصحاب جہد و طلب کیلئے چھوڑ دیتا ہے۔

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ط وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ

○ (۶۹:۲۹)

اور جو لوگ ہم تک پہنچنے کیلئے کوشش کریں گے تو ہم بھی ضرور ان پر راہ کھول دیں گے۔ اور اللہ نیک کرداروں سے الگ کب ہے؟ وہ تو ان کے ساتھ ہے۔

وَفِیۡۤ الۡاَرۡضِ اٰیٰتٌ لِّلۡمُوۡقِنِیۡنَ ۝ وَفِیۡۤ اَنۡفُسِکُمۡ ؕ اَفَلَا تُبۡصِرُوۡنَ ۝

(۵۱: ۲۰-۲۱)

اور ان لوگوں کیلئے جو یقین رکھتے ہیں، زمین میں کتنی ہی حقیقت کی نشانیاں ہیں، اور خود تمہارے اندر بھی، پھر کیا تم دیکھتے نہیں؟

سادساً، اسی مقام سے وہ فرق مراتب بھی نمایاں ہو جاتا ہے جو اسلام نے بالکل ایک دوسری شکل ونوعیت میں عوام وخواص کا ملحوظ رکھا ہے۔ ہندو مفکروں نے عوام اور خواص میں الگ الگ تصور اور عقیدے تقسیم کیے۔ اسلام نے تصور اور عقیدے کے اعتبار سے کوئی امتیاز جائز نہیں رکھا۔ وہ حقیقت کا ایک ہی عقیدہ ہر انسانی دل ودماغ کے آگے پیش کرتا ہے۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ طلب وجہد کے لحاظ سے سب کے مراتب یکساں نہیں ہو سکتے اور یہاں ایک ہی درجے کی پیاس لے کر ہر طالب حقیقت نہیں آتا۔ عامتہ الناس بہ حیثیت جماعت کے اپنا ایک خاص مزاج اور اپنی خاص احتیاج رکھتے ہیں۔ خاص افراد بہ حیثیت فرد کے اپنی طلب واستعداد کا الگ الگ درجہ ومقام رکھتے ہیں پس اس نے جس امتیاز سے پہلی صورت میں انکار کر دیا تھا، اس سے دوسری صورت میں انکار نہیں کیا اور مختلف مدارج طلب کیلئے عرفان ویقین کی مختلف راہیں کھلی چھوڑ دیں۔

صحیح بخاری اور مسلم کی ایک متفق علیہ روایت میں جو حدیث جبریل کے نام سے مشہور ہے، نہایت جامع ومانع لفظوں میں یہ فرق مراتب واضح کر دیا گیا ہے۔ یہ حدیث تین مرتبوں کا ذکر کرتی ہے۔ اسلام، ایمان اور احسان۔ اسلام یہ ہے کہ اسلامی عقیدے کا اقرار کرنا اور عمل کے چاروں رکن، یعنی نماز، روزہ، حج اور زکوۃ انجام دینا۔ ایمان یہ ہے کہ اقرار کے مرتبے سے آگے بڑھنا اور اسلام کے بنیادی عقائد کے حق الیقین کا مرتبہ حاصل کرنا۔ احسان یہ ہے۔

ان تعبد اللہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراك (صحیحین)

تو اللہ کی اس طرح عبادت کرے گویا اسے اپنے سامنے دیکھ رہا ہے، اور اگر تو اسے نہیں دیکھ رہا تو وہ تجھے دیکھ رہا ہے۔

پس گویا عرفان حقیقت کے لحاظ سے یہاں تین مرتبے ہوئے۔ پہلا مرتبہ اسلامی دائرے کے اعتقاد و عمل کا ہے، یہ اسلام ہے، یعنی جس نے اسلامی عقیدے کا اقرار کر لیا اور اس کے اعمال کی زندگی اختیار کر لی، وہ اس دائرے میں آ گیا، لیکن دائرے میں داخل ہو جانے سے یہ لازم نہیں آ جاتا کہ علم و یقین کے جو مقامات ہیں، وہ بھی ہر وارد و داخل کو حاصل ہو گئے۔ پس اب دوسرا مرتبہ نمایاں ہوا جسے ایمان سے تعبیر کیا ہے۔ اسلام ظاہر کا اقرار و عمل تھا، ایمان دل و دماغ کا یقین و اذعان ہے۔ یہ مرتبہ جس نے حاصل کر لیا وہ عوام سے نکل کر خواص کے زمرے میں داخل ہو گیا۔ لیکن معاملہ اتنے ہی پر ختم نہیں ہو جاتا عرفان حقیقت اور عین الیقینی ایقان کا ایک اور مرتبہ بھی باقی رہ جاتا ہے، اسے احسان سے تعبیر کیا گیا۔ لیکن یہ مقام محض اعتقاد اور یقین پیدا کر لینے کا نہیں ہے جو ایک گروہ کو بحیثیت گروہ کے حاصل ہو جا سکتا ہے۔ یہ ذاتی تجربے کا مقام ہے، جو یہاں تک پہنچتا ہے وہ اپنے ذاتی تجربے و کشف سے یہ درجہ حاصل کر لیتا ہے۔ تعلیمی اور احکامی عقائد کو اس میں دخل نہیں، بحث و نظر کی اس میں گنجائش نہیں۔ یہ خود کرنے اور پانے کا معاملہ ہے، بتلانے اور سمجھانے کا معاملہ نہیں۔ جو یہاں تک پہنچ گیا، وہ اگر کچھ بتلائے گا بھی تو یہی بتلائے گا کہ میری طرح بن جاؤ، پھر جو کچھ دکھائی دیتا ہے دیکھ لو۔

پرسید یکی کہ عاشقی چیست
گفتم کہ چو من شوی بدانی

اسلام نے اس طرح طلب و جہد کی ہر پیاس کیلئے درجہ بہ درجہ سیرابی کا سامان کر دیا۔ عوام کیلئے پہلا مرتبہ کافی ہے، خواص کیلئے دوسرا مرتبہ ضروری ہے اور اخص الخواص کی پیاس بغیر تیسرے جام کے تسکین پانے والی نہیں۔ اس کے تصور الٰہی اور عقیدے کا میخانہ ایک ہے، لیکن جام الگ الگ ہوئے۔ ہر طالب کے حصے میں اس کے ظرف کے مطابق ایک جام آ جاتا ہے اور اس کی سرشاری کی کیفیتیں مہیا کر دیتا ہے۔ وللہ در من قال:

ساقی بہ ھمہ بادہ زیک خم دھد اما
در مجلس او مستی ہر کس ز شرابی ست

یہاں یہ امر بھی واضح کر دینا بے محل نہ ہوگا کہ قرآن کی متعدد تصریحات ہیں جنہیں اگر وحدۃ الوجودی تصور کی طرف لے جایا جائے تو بلاتکلف دور تک جاسکتی ہیں۔ مثلاً "هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ" (۵۷:۳) اور "اَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ" (۲:۱۱۵) اور "وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ" (۵۰:۱۶)

اور "كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ" (۵۵:۲۹) یا تمام اس طرح تصریحات جن میں تمام موجودات کا بالآخر اللہ کی طرف لوٹنا بیان کیا گیا ہے۔ توحید وجودی کے قائل ان تمام آیات سے مسئلہ وحدۃ الوجود پر استدلال کرتے ہیں۔ اور شاہ ولی اللہ نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ "اگر میں مسئلہ وحدۃ الوجود کو ثابت کرنا چاہوں تو قرآن و حدیث کے تمام نصوص وظواہر سے اس کا اثبات کر سکتا ہوں" لیکن صاف بات جو اس بارے میں معلوم ہوتی ہے، وہ یہی ہے کہ ان تمام تصریحات کو ان کے قریبی محاصل سے دور نہیں لے جانا چاہئے اور ان معانی سے آگے نہیں بڑھنا چاہئے جو صدر اول کے مخاطبوں نے سمجھے تھے۔ باقی رہا حقیقت کے کشف و عرفان کا وہ مقام جو عرفاء طریق کو پیش آتا ہے تو وہ کسی طرح بھی قرآن کے تصور الٰہی کے عقیدے کے خلاف نہیں۔ اس کا تصور ایک جامع تصور ہے اور ہر توحیدی تصور کی اس میں گنجائش موجود ہے۔ جو افراد خاصہ مقام احسان تک رسائی حاصل کرتے ہیں، وہ حقیقت کو اس کی پس پردہ جلوہ طرازیوں میں بھی دیکھ لیتے ہیں اور عرفان کا وہ منتہی مرتبہ جو فکر انسانی کے دسترس میں ہے، انہیں حاصل ہو جاتا ہے۔۔ ومن لم یذق لم یدر:

تو نظر باز نہ ورنہ تغافل نگہ است
تو زبان فہم نہ ورنہ خموشی سخن است

سابعاً جس ترتیب کے ساتھ سورہ فاتحہ میں یہ تینوں صفتیں بیان کی گئی ہیں، دراصل فکر انسانی کی طلب و معرفت کی قدرتی منزلیں ہیں اور اگر غور کیا جائے تو اسی ترتیب سے پیش آتی ہیں۔ سب سے پہلے ربوبیت کا ذکر کیا گیا۔ کیونکہ کائنات ہستی میں سب سے زیادہ ظاہر نمود اسی صفت کی ہے اور ہر وجود کو سب سے زیادہ اسی کی احتیاج ہے۔ ربوبیت کے

بعد رحمت کا ذکر کیا گیا، کیونکہ اس کی حقیقت بہ مقابلے ربوبیت کے مطالعے و تفکر کی محتاج تھی اور ربوبیت کے مشاہدات سے جب نظر آگے بڑھتی ہے، تب رحمت کا جلوہ نمودار ہوتا ہے۔ پھر رحمت کے بعد عدالت کی صفت جلوہ افروز ہوئی، کیونکہ یہ سفر کی آخری منزل ہے۔ رحمت کے مشاہدات کی منزل سے جب قدم آگے بڑھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے یہاں عدالت کی نمود بھی ہر جگہ موجود ہے اور اس لئے موجود ہے کہ ربوبیت اور رحمت کا مقتضیٰ یہی ہے۔

اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ

ہدایت

''ہدایت'' کے معنی رہنمائی کرنے، راہ دکھانے، راہ پر لگا دینے کے ہیں۔ اجمالاً اس کا ذکر اوپر گزر چکا ہے۔ یہاں ہم چاہتے ہیں ہدایت کے مختلف مراتب واقسام پر نظر ڈالیں جن کا قرآن حکیم نے ذکر کیا ہے اور جن میں سے ایک خاص مرتبہ وحی ونبوت کی ہدایت کا ہے۔

تکوین وجود کے مراتب اربعہ

تم ابھی پڑھ چکے ہو کہ خدا کی ربوبیت نے جس طرح مخلوقات کو ان کے مناسب حال جسم وقویٰ دیے ہیں، اسی طرح ان کی ہدایت کا فطری سامان بھی مہیا کر دیا ہے۔ فطرت کی یہی ہدایت ہے جو ہر وجود کو زندگی ومعیشت کی راہ پر لگاتی اور ضروریات زندگی کی جستجو میں رہنما ہوتی ہے۔ اگر فطرت کی ہدایت موجود نہ ہوتی تو ممکن نہ تھا کہ کوئی مخلوق بھی زندگی وبقا کا سامان بہم پہنچا سکتی۔ چنانچہ قرآن نے جابجا اس حقیقت پر توجہ دلائی ہے۔ وہ کہتا ہے: ہر وجود کے بننے اور درجہ تکمیل تک پہنچنے کے مختلف مراتب ہیں اور ان میں آخری مرتبہ ہدایت کا مرتبہ ہے۔ سورہ اعلیٰ میں بالترتیب چار مرتبوں کا ذکر کیا ہے۔

الَّذِىۡ خَلَقَ فَسَوّٰى ۝ وَالَّذِىۡ قَدَّرَ فَهَدٰى ۝ (۸۷:۲،۳)

وہ پروردگار جس نے ہر چیز پیدا کی، پھر اسے درست کیا، پھر ایک اندازہ ٹھہرا دیا، پھر اس پر راہ (عمل) کھول دی۔

یعنی تکوین وجود کے چار مرتبے ہوئے۔ تخلیق، تسویہ، تقدیر، ہدایت۔

''تخلیق'' کے معنی پیدا کرنے کے ہیں۔ یہ بات کہ کائنات خلقت اور اس کے ہر وجود کا مواد عدم سے وجود میں آ گیا، تخلیق ہے۔

وہی مجھ پر راہ عمل بھی کھول دے۔

ہدایت کے ابتدائی تین مرتبے

پھر ہدایت کے بھی مختلف مراتب ہیں جو ہم حیوانات میں محسوس کرتے ہیں:

سب سے پہلا مرتبہ وجدان کی ہدایت کا ہے۔ وجدان طبیعت حیوانی کا فطری اور اندرونی الہام ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک بچہ پیدا ہوتے ہی غذا کے لئے رونے لگتا ہے اور پھر بغیر اس کے کہ خارج کی کوئی رہنمائی اسے ملی ہو، ماں کی چھاتی منہ میں لیتے ہی اسے چوستا اور اپنی غذا حاصل کر لیتا ہے۔

وجدان کے بعد حواس کی ہدایت کا مرتبہ ہے اور وہ اس سے بلند تر ہے یہ ہمیں دیکھنے، سننے، چکھنے، چھونے اور سونگھنے کی قوتیں بخشتی ہے اور انہیں کے ذریعے ہم خارج کا علم حاصل کرتے ہیں۔

ہدایت فطرت کے یہ دونوں مرتبے انسان اور حیوان سب کیلئے ہیں، لیکن جہاں تک انسان کا تعلق ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ ایک تیسرا مرتبہ ہدایت بھی موجود ہے اور وہ عقل کی ہدایت ہے۔ فطرت کی یہی ہدایت ہے جس نے انسان کے آگے غیر محدود ترقیات کا دروازہ کھول دیا ہے اور اسے کائنات ارضی کی تمام مخلوقات کا حاصل وخلاصہ بنا دیا ہے۔

وجدان کی ہدایت اس میں سعی وطلب کا ولولہ پیدا کرتی ہے، حواس اس کے لئے معلومات بہم پہنچاتے ہیں اور عقل نتائج واحکام مرتب کرتی ہے۔ حیوانات کو اس آخری مرتبے کی ضرورت نہ تھی، اس لئے ان کا قدم وجدان اور حواس سے آگے نہیں بڑھا، لیکن انسان میں یہ تین مرتبے جمع ہو گئے۔

جوہر عقل کیا ہے؟ دراصل اسی قوت کی ایک ترقی یافتہ حالت ہے جس نے حیوانات میں وجدان اور حواس کی روشنی پیدا کر دی ہے۔ جس طرح انسان کا جسم اجسام ارضی کی سب سے اعلیٰ کڑی ہے، اسی طرح اس کی معنوی قوت بھی تمام معنوی قوتوں کا برترین جوہر ہے۔ روح حیوانی کا وہ جوہر ادراک جو نباتات میں مخفی اور حیوانات کے وجدان ومشاعر میں نمایاں تھا،

وَاِذْقَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖٓ اِنَّنِيْ بَرَآءٌ مِّمَّا تَعْبُدُوْنَ ۝ اِلَّا الَّذِيْ فَطَرَنِيْ فَاِنَّهٗ سَيَهْدِيْنِ ۝ (۴۳:۲۶، ۲۷)

اور جب ابراہیم نے اپنے باپ اور قوم سے کہا تھا: تم جن (دیوتاؤں) کی پرستش کرتے ہو، مجھے ان سے کوئی سروکار نہیں۔ میرا اگر رشتہ ہے تو اس ذات سے جس نے مجھے پیدا کیا ہے اور وہی میری رہنمائی کرے گی۔

الَّذِيْ فَطَرَنِيْ فَاِنَّهٗ سَيَهْدِيْنِ

یعنی جس خالق نے مجھے جسم و وجود عطا فرمایا ہے، ضروری ہے کہ اس نے میری ہدایت کا بھی سامان کر دیا ہو۔

سورہ شعراء میں یہی بات زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کی گئی ہے:

الَّذِيْ خَلَقَنِيْ فَهُوَ يَهْدِيْنِ ۝ وَالَّذِيْ هُوَ يُطْعِمُنِيْ وَ يَسْقِيْنِ ۝ وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ ۝ (۲۶:۷۸۔۸۰)

جس پروردگار نے مجھے پیدا کیا ہے، وہی میری ہدایت کرے گا، اور پھر وہی ہے جو مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے اور جب بیمار ہو جاتا ہوں تو شفا بخشتا ہے۔

یعنی جس پروردگار کی پروردگاری نے میری تمام ضروریات زندگی کا سامان کر دیا ہے، جو مجھے بھوک کیلئے غذا، پیاس کیلئے پانی اور بیماری میں شفا عطا فرماتا ہے، کیونکر ممکن ہے کہ اس نے مجھے پیدا تو کر دیا ہو، لیکن میری ہدایت کا سامان نہ کیا ہو؟ اگر اس نے مجھے پیدا کیا ہے تو یقیناً وہی ہے جو طلب و سعی میں میری رہنمائی بھی کرے۔

سورہ صٰفّٰت میں یہی مطلب ان لفظوں میں ادا کیا گیا ہے:

وَقَالَ اِنِّيْ ذَاهِبٌ اِلٰى رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ ۝ (۳۷:۹۹)

اور (ابراہیم نے) کہا: میں (ہر طرف سے کٹ کر) اپنے پروردگار کا رخ کرتا ہوں، وہ میری ہدایت کرے گا۔

''ربی'' کے لفظ پر غور کرو! وہ میرا ''رب'' ہے اور جب وہ ''رب'' ہے تو ضروری ہے کہ

''تسویہ'' کے معنی یہ ہیں کہ ایک چیز کو جس طرح ہونا چاہیئے ٹھیک ٹھیک اسی طرح درست اور آراستہ کر دینا۔

''تقدیر'' کے معنی اندازہ ٹھہرا دینے کے ہیں اور اس کی تشریح اوپر گزر چکی ہے۔

''ہدایت'' سے مقصود یہ ہے کہ ہر وجود پر اس کی زندگی و معیشت کی راہ کھول دی جائے اور اس کی تشریح بھی ربوبیت کے مبحث میں گزر چکی ہے۔

مثلاً مخلوقات میں ایک خاص قسم پرندکی ہے:

۱۔ یہ بات کہ ان کا مادہ خلقت ظہور میں آ گیا تخلیق ہے۔

۲۔ یہ بات کہ ان کے تمام ظاہری و باطنی قویٰ اس طرح بنا دیئے گئے کہ ٹھیک ٹھیک قوام واعتدال کی حالت پیدا ہو گئی، تسویہ ہے۔

۳۔ یہ بات کہ ان کے ظاہری و باطنی قویٰ کے اعمال کیلئے ایک خاص طرح کا اندازہ ٹھہرا دیا گیا ہے جس سے وہ باہر نہیں جا سکتے، تقدیر ہے، مثلاً یہ کہ ہوا میں اڑیں گے، مچھلیوں کی طرح پانی میں تیریں گے نہیں۔

۴۔ یہ بات کہ ان کے اندر وجدان و حواس کی روشنی پیدا ہو گئی جو انہیں زندگی و بقا کی راہیں دکھاتی اور سامان حیات کے طلب و حصول میں رہنمائی کرتی ہے، ہدایت ہے۔

قرآن کہتا ہے: خدا کی ربوبیت کا مقتضی یہی تھا کہ جس طرح اس نے ہر وجود کو اس کا نامہ ہستی عطا فرمایا اور اس کے ظاہری و باطنی قویٰ درست کر دیئے اور اس کے اعمال کیلئے ایک مناسب حال اندازہ ٹھہرا دیا، اسی طرح اس کی ہدایت کا بھی سروسامان کر دیا۔

قَالَ رَبُّنَا الَّذِیْٓ اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی ؀ (۲۰:۵۰)

(موسیٰ نے) کہا: ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی بناوٹ دی پھر اس پر راہ عمل کھول دی۔

قرآن نے حضرت ابراہیمؑ اور ان کی قوم کا جو مکالمہ جا بجا نقل کیا ہے، اس میں حضرت ابراہیمؑ اپنے عقیدے کا اعلان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

انسان کے مرتبے میں پہنچ کر درجہ کمال تک پہنچ گیا اور جوہر عقل کے نام سے پکارا گیا۔

ہر مرتبہ ہدایت ایک خاص حد سے آگے رہنمائی نہیں کر سکتا

پھر ہم دیکھتے ہیں کہ ہدایت فطرت کے ان تینوں مرتبوں میں سے ہر مرتبہ اپنی قوت وعمل کا ایک خاص دائرہ رکھتا ہے، اس سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ اور اگر اس مرتبے سے ایک دوسرا بلند تر مرتبہ موجود نہ ہوتا تو ہماری معنوی قوتیں اس حد تک ترقی نہ کر سکتیں جس حد تک فطرت کی رہنمائی سے ترقی کر رہی ہیں۔

وجدان کی ہدایت ہم میں طلب وسعی کا جوش پیدا کرتی ہے اور مطلوبات زندگی کی راہ پر لگاتی ہے، لیکن ہمارے وجود سے باہر جو کچھ موجود ہے اس کا ادراک حاصل نہیں کر سکتی۔ یہ کام مرتبہ حواس کی ہدایت کا ہے۔ وجدان کی رہنمائی جب درماندہ ہو جاتی ہے تو حواس کی دست گیری نمایاں ہوتی ہے، آنکھ دیکھتی ہے، کان سنتا ہے، زبان چکھتی ہے، ہاتھ چھوتا ہے، ناک سونگھتی ہے، اور اس طرح ہم اپنے وجود سے باہر کی تمام محسوس اشیا کا ادراک حاصل کر لیتے ہیں۔

لیکن حواس کی ہدایت بھی ایک خاص حد تک ہی کام دے سکتی ہے، اس سے آگے نہیں بڑھ سکتی۔ آنکھ دیکھتی ہے، مگر صرف اسی حالت میں جب کہ دیکھنے کی تمام شرطیں موجود ہوں اگر کوئی ایک شرط بھی نہ پائی جائے مثلاً روشنی نہ ہو یا فاصلہ زیادہ ہو تو ہم آنکھ رکھتے ہوئے بھی ایک موجود چیز کو براست نہیں دیکھ سکتے۔ علاوہ بریں حواس کی ہدایت صرف اتنا ہی کر سکتی ہے کہ اشیا کا احساس پیدا کر دے، لیکن مجرد احساس کافی نہیں ہے۔ ہمیں استنباط و استنتاج کی ضرورت ہے، احکام کی ضرورت ہے، کلیات کی ضرورت ہے اور یہ کام عقل کی ہدایت کا ہے۔ وہ ان تمام مدرکات کو جو حواس کے ذریعے حاصل ہوتی ہیں، ترتیب دیتی ہے اور ان سے احکام وکلیات کا استنباط کرتی ہے۔

ہر مرتبہ ہدایت اپنی تصحیح ونگرانی میں بالاتر مرتبہ ہدایت کا محتاج ہے

علاوہ بریں جس طرح وجدان کی نگرانی کے لئے حواس ومشاعر کی ضرورت تھی، اسی طرح حواس کی تصحیح ونگرانی کیلئے عقل کی ضرورت ہوئی۔ حواس کا ذریعہ ادراک نہ صرف محدود

ہی ہے، بلکہ بسا اوقات غلطی و گمراہی سے بھی محفوظ نہیں۔ ہم دور سے ایک چیز دیکھتے ہیں اور محسوس کرتے ہیں کہ ایک سیاہ نقطے سے زیادہ حجم نہیں رکھتی، حالانکہ وہ ایک عظیم الشان گنبد ہوتا ہے۔ ہم بیماری کی حالت میں شہد جیسی میٹھی چیز چکھتے ہیں، لیکن ہمارا حاسۂ ذوق یقین دلاتا ہے کہ مزہ کڑوا ہے۔ ہم تالاب میں ایک لکڑی کا عکس دیکھتے ہیں، لکڑی مستقیم ہوتی ہے، لیکن عکس میں ٹیڑھی دکھائی دیتی ہے۔ بارہا ایسا ہوتا ہے کہ کسی عارضے کی وجہ سے کان بجنے لگتے ہیں اور ہمیں ایسی صدائیں سنائی دیتی ہیں جن کا خارج میں کوئی وجود نہیں۔ اگر مرتبۂ حواس سے ایک بلند تر مرتبہ ہدایت کا وجود نہ ہوتا تو ممکن نہ تھا کہ ہم حواس کی ان درماندگیوں میں حقیقت کا سراغ پا سکتے، لیکن ان تمام حالتوں میں عقل کی ہدایت نمودار ہوتی ہے، وہ حواس کی درماندگیوں میں ہماری رہنمائی کرتی ہے۔ وہ ہمیں بتاتی ہے کہ سورج ایک عظیم الشان کرہ ہے، اگرچہ ہماری آنکھ اسے ایک سنہری تھال سے زیادہ محسوس نہیں کرتی۔ وہ ہمیں بتلاتی ہے کہ شہد کا مزہ ہر حال میں میٹھا ہے اور اگر ہمیں کڑوا محسوس ہوا ہے تو یہ اس لئے کہ ہمارے منہ کا مزہ بگڑ گیا ہے۔ اسی طرح وہ ہمیں بتلاتی ہے کہ بعض اوقات خشکی بڑھ جانے سے کان بجنے لگتے ہیں اور اس حالت میں جو صدائیں سنائی دیتی ہیں وہ خارج کی صدائیں نہیں ہوتیں، خود ہمارے ہی دماغ کی گونج ہوتی ہے۔

ہدایت فطرت کا چوتھا مرتبہ

لیکن جس طرح وجدان کے بعد حواس کی ہدایت نمودار ہوئی، کیونکہ وجدان کی ہدایت ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھ سکتی تھی، اور جس طرح حواس کے بعد عقل کی ہدایت نمودار ہوئی، کیونکہ حواس کی ہدایت بھی ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھ سکتی تھی، ٹھیک اسی طرح ہم محسوس کرتے ہیں کہ عقل کی ہدایت کے بعد بھی ہدایت کا کوئی مزید مرتبہ ہونا چاہئے، کیونکہ عقل کی ہدایت بھی ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھ سکتی اور اس کے دائرۂ عمل کے بعد بھی ایک دائرہ باقی رہ جاتا ہے۔ عقل کی کارفرمائی جیسی کچھ اور جتنی کچھ بھی ہے محسوسات کے دائرے میں محدود ہے، یعنی وہ صرف اسی حد تک کام دے سکتی ہے جس حد

تک ہمارے حواس خمسہ معلومات بہم پہنچاتے رہتے ہیں، لیکن محسوسات کی سرحد سے آگے کیا ہے؟ اس پردے کے پیچھے کیا ہے جس سے آگے ہماری چشم حواس نہیں بڑھ سکتی؟ یہاں پہنچ کر عقل یک قلم درماندہ ہو جاتی ہے، اس کی ہدایت ہمیں کوئی روشنی نہیں دے سکتی۔

علاوہ بریں جہاں تک انسان کی عملی زندگی کا تعلق ہے، عقل کی ہدایت نہ تو ہر حال میں کافی ہے، نہ ہر حال میں مؤثر۔ نفس انسانی طرح طرح کی خواہشوں اور جذبوں سے کچھ اس طرح مقہور واقع ہوا ہے کہ جب کبھی عقل اور جذبات میں کش مکش ہوتی ہے تو اکثر حالتوں میں فتح جذبات ہی کیلئے ہوتی ہے۔ بسا اوقات عقل ہمیں یقین دلاتی ہے کہ فلاں فعل مضر اور مہلک ہے۔ لیکن جذبات ہمیں ترغیب دیتے ہیں اور ہم اس کے ارتکاب سے اپنے آپ کو نہیں روک سکتے۔ عقل کی بڑی سے بڑی دلیل بھی ہمیں ایسا نہیں بنا دے سکتی کہ غصے کی حالت میں بے قابو نہ ہو جائیں اور بھوک کی حالت میں مضر غذا کی طرف ہاتھ نہ بڑھائیں۔

اچھا! اگر خدا کی ربوبیت کے لئے ضروری تھا کہ وہ ہمیں وجدان کے ساتھ حواس بھی دے، کیونکہ وجدان کی ہدایت ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھ سکتی، اور اگر ضروری تھا کہ حواس کے ساتھ عقل بھی دے، کیونکہ حواس کی ہدایت بھی ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھ سکتی تو کیا یہ ضروری نہ تھا کہ عقل کے ساتھ کچھ اور بھی دے؟ کیونکہ عقل کی ہدایت بھی ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھ سکتی اور اعمال کی درستگی وانضباط کے لئے کافی نہیں [105] اگر اس نے وجدان کے ساتھ حواس بھی دیئے تا کہ وجدان کی لغزشوں میں نگرانی کریں، اور اگر حواس کے ساتھ عقل بھی دی تا کہ حواس کی غلطیوں میں قاضی وحاکم ہو۔ تو کیا ضروری نہ تھا کہ عقل کے ساتھ کچھ اور بھی دیتا؟ تا کہ عقل کی درماندگیوں میں رہنما اور فیصلہ کن ہوتا۔

قرآن کہتا ہے کہ ضروری تھا، اسی لئے اللہ کی ربوبیت نے انسان کیلئے ایک چوتھے مرتبہٗ ہدایت کا بھی سامان کر دیا۔ یہی مرتبہٗ ہدایت ہے جسے وہ وحی ونبوت کی ہدایت سے تعبیر کرتا ہے۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں اس نے جا بجا ان مراتب ہدایت کا ذکر کیا ہے اور انہیں ربوبیت

الٰہی کی سب سے بڑی بخشش و مرحمت قرار دیا ہے۔

إِنَّا خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ نُطْفَةٍ أَمْشَاجٍ نَبْتَلِيهِ فَجَعَلْنَاهُ سَمِيعًا بَصِيرًا ۝ إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًا ۝

(۷۶:۲۔۳)

ہم نے انسانوں کو ملے جلے نطفے سے پیدا کیا جسے (ایک کے بعد ایک) مختلف حالتوں میں پلٹتے ہیں، پھر اسے ایسا بنا دیا کہ سننے والا اور دیکھنے والا وجود ہو گیا۔ ہم نے اس پر راہ عمل کھول دی۔ اب یہ اس کا کام ہے کہ یا تو شکر کرنے والا ہو یا ناشکرا (یعنی یا تو خدا کی دی ہوئی قوتیں ٹھیک ٹھیک کام میں لائے اور فلاح و سعادت کی راہ اختیار کرے یا ان سے کام نہ لے اور گمراہ ہو جائے)

أَلَمْ نَجْعَلْ لَهُ عَيْنَيْنِ ۝ وَلِسَانًا وَشَفَتَيْنِ ۝ وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ ۝

(۹۰:۸۔۱۰)

کیا ہم نے اسے ایک چھوڑ دو دو آنکھیں نہیں دے دی ہیں (جن سے وہ دیکھتا ہے) اور زبان اور ہونٹ نہیں دیئے ہیں (جو گویائی کا ذریعہ ہیں) اور کیا اس کو ہم نے (سعادت و شقاوت کی) دونوں راہیں نہیں دکھا دیں؟

وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ (۱۶:۷۸)

اور اللہ نے تمہارے لئے سننے اور دیکھنے کے حواس پیدا کر دیئے اور سوچنے کیلئے دل (یعنی عقل)[۱۰۶] تاکہ تم شکر گزار ہو (یعنی خدا کی دی ہوئی قوتیں ٹھیک طریقے پر کام میں لاؤ)

ان آیات اور ان کی ہم معنی آیات میں حواس اور مشاعر اور عقل و فکر کی ہدایت کی طرف اشارات کیے گئے ہیں، لیکن وہ تمام مقامات جہاں انسان کی روحانی سعادت و شقاوت کا ذکر کیا گیا ہے، وحی و نبوت کی ہدایت سے متعلق ہیں، مثلاً:

إِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدَىٰ ۝ وَإِنَّ لَنَا لَلْآخِرَةَ وَالْأُولَىٰ ۝ (۹۲:۱۲۔۱۳)

بلاشبہ یہ ہمارا کام ہے کہ ہم رہنمائی کریں اور یقیناً آخرت اور دنیا دونوں

ہمارے ہی لئے ہیں[107]

وَاَمَّا ثَمُوْدُ فَهَدَيْنٰهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰى عَلَى الْهُدٰى (۱۷:۴۱)

اور باقی رہی قوم ثمود تو اسے بھی ہم نے راہ (حق) دکھلا دی تھی، لیکن اس نے ہدایت کی راہ چھوڑ کر اندھے پن کا شیوہ پسند کیا۔

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا. وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ ○ (۶۹:۲۹)

اور جن لوگوں نے ہماری راہ میں جاں فشانی کی تو ضروری ہے کہ ہم بھی ان پر اپنی راہیں کھول دیں۔ اور بلاشبہ اللہ ان لوگوں کا ساتھی ہے جو نیک عمل ہیں۔

الھدیٰ

چنانچہ اس سلسلے میں وہ اللہ کی ایک خاص ہدایت کا ذکر کرتا ہے اور اسے ''الھدیٰ'' کے نام سے پکارتا ہے، یعنی الف لام تعریف کے ساتھ۔

قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى. وَاُمِرْنَا لِنُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○ (۷۱:۶)

(اے پیغمبران سے) کہہ دو! یقیناً اللہ کی ہدایت تو ''الھدیٰ'' ہے۔ اور ہم سب کو (اسی بات کا) حکم دیا گیا ہے کہ تمام جہانوں کے پروردگار کے آگے سر عبودیت جھکا دیں۔

وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ. قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى (۱۲۰:۲)

اور (یادرکھو) یہودی تم سے خوش ہونے والے نہیں جب تک کہ تم ان کی ملت کی پیروی نہ کرو، اور یہی حال نصاریٰ کا ہے۔ (اے پیغمبر تم ان سے) کہہ دو! اللہ کی ہدایت کی راہ تو وہی ہے جو ''الھدیٰ'' ہے (یعنی ہدایت کی حقیقی اور عالمگیر راہ)[108]

یہ ''الھدیٰ''، یعنی ہدایت کی ایک ہی اور حقیقی راہ کون سی ہے؟ قرآن کہتا ہے: وحی الٰہی کی عالمگیر ہدایت ہے جو اول دن سے دنیا میں موجود ہے اور بلا تفریق و امتیاز تمام نوع انسانی کیلئے ہے۔ وہ کہتا ہے: جس طرح خدا نے وجدان، حواس اور عقل کی ہدایت میں نہ تو نسل

وقوم کا امتیاز رکھا نہ زمان و مکان کا، اسی طرح اس کی ہدایت وحی بھی ہر طرح کے تفرقے وامتیاز سے پاک ہے۔ وہ سب کیلئے ہے اور سب کو دی گئی ہے۔ اور اس ایک ہدایت کے سوا اور جتنی ہدایتیں بھی انسانوں نے سمجھ رکھی ہیں، سب انسانی بناوٹ کی راہیں ہیں۔ خدا کی ٹھہرائی ہوئی راہ صرف یہی ایک راہ ہے۔

اس لئے وہ ہدایت کی ان تمام صورتوں سے یک قلم انکار کرتا ہے جو اس اصل سے منحرف ہو کر طرح طرح کی مذہبی گروہ بندیوں اور متخالف ٹولیوں میں بٹ گئی ہیں اور سعادت ونجات کی عالمگیر حقیقت خاص خاص گروہوں اور حلقوں کی میراث بنالی گئی ہے۔ وہ کہتا ہے: انسانی بناوٹ کی یہ الگ الگ راہیں ہدایت کی راہ نہیں ہوسکتیں۔ ہدایت کی راہ تو وہی عالم گیر ہدایت کی راہ ہے۔ اسی عالمگیری ہدایت وحی کو وہ ''الدین'' کے نام سے پکارتا ہے، یعنی نوع انسانی کیلئے حقیقی دین، اور اسی کا نام اس کی زبان میں ''الاسلام'' ہے۔

وحدت دین کی اصل عظیم اور قرآن حکیم

یہ اصل عظیم قرآن کی دعوت کی سب سے پہلی بنیاد ہے۔ وہ جو کچھ بھی بتانا چاہتا ہے تمام تر اسی اصل پر مبنی ہے۔ اگر اس اصل سے قطع نظر کر لی جائے تو اس کا تمام کارخانۂ دعوت درہم برہم ہو جائے۔ لیکن تاریخ عالم کے عجائب تصرفات میں سے یہ واقعہ بھی سمجھنا چاہیے کہ جس درجہ قرآن نے اس اصل پر زور دیا تھا، اتنا ہی زیادہ دنیا کی نگاہوں نے اس سے اعراض کیا، حتی کہ کہا جاسکتا ہے: آج قرآن کی کوئی بات بھی دنیا کی نظروں سے اس درجہ پوشیدہ نہیں ہے جس قدر کہ یہ اصل عظیم۔ اگر ایک شخص ہر طرح کے خارجی اثرات سے خالی الذہن ہو کر قرآن کا مطالعہ کرے اور اس کے صفحات میں جابجا اس اصل عظیم کے قطعی اور واضح اعلانات پڑھے اور پھر دنیا کی طرف نظر اٹھائے جو قرآن کی حقیقت اس سے زیادہ نہیں سمجھتی کہ بہت سی مذہبی گروہ بندیوں کی طرح وہ بھی ایک مذہبی گروہ بندی ہے تو یقیناً وہ حیران ہو کر پکار اٹھے گا: یا تو اس کی نگاہیں اسے دھوکا دے رہی ہیں یا دنیا ہمیشہ آنکھیں کھولے بغیر ہی اپنے فیصلے صادر کر دیا کرتی ہے۔

دین کی حقیقت اور قرآن کی تصریحات

اس حقیقت کی توضیح کیلئے ضروری ہے کہ ایک مرتبہ تفصیل کے ساتھ یہ بات واضح کر دی جائے کہ جہاں تک وحی ونبوت کا یعنی دین کا تعلق ہے، قرآن کی دعوت کیا ہے اور کس راہ کی طرف نوع انسانی کو لے جانا چاہتی ہے؟

جمعیت بشری کی ابتدائی وحدت، پھر اختلاف اور ہدایت وحی کا ظہور

اس باب میں قرآن نے جو کچھ بیان کیا ہے اس کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

وہ کہتا ہے: ابتدا میں انسانی جمعیت کا یہ حال تھا کہ لوگ قدرتی زندگی بسر کرتے تھے اور ان میں نہ تو کسی طرح کا باہمی اختلاف تھا نہ کسی طرح کی مخاصمت۔ سب کی زندگی ایک ہی طرح کی تھی اور سب اپنی قدرتی یگانگت پر قانع تھے۔ پھر ایسا ہوا کہ نسل انسانی کی کثرت اور ضروریات معیشت کی وسعت سے طرح طرح کے اختلافات پیدا ہو گئے اور اختلافات نے تفرقہ وانقطاع اور ظلم وفساد کی صورت اختیار کر لی۔ ہر گروہ دوسرے گروہ سے نفرت کرنے لگا اور ہر زبردست زیردست کے حقوق پامال کرنے لگا۔ جب یہ صورت حال پیدا ہوئی تو ضروری ہوا کہ نوع انسانی کی ہدایت اور عدل وصداقت کے قیام کیلئے وحی الٰہی کی روشنی نمودار ہو۔ چنانچہ یہ روشنی نمودار ہوئی اور خدا کے رسولوں کی دعوت وتبلیغ کا سلسلہ قائم ہو گیا۔ وہ ان تمام رہنماؤں کو جن کے ذریعے اس ہدایت کا سلسلہ قائم ہوا ”رسول“ کے نام سے تعبیر کرتا ہے، کیونکہ وہ خدا کی سچائی کا پیغام پہنچانے والے تھے اور ”رسول“ کے معنی پیغام پہنچانے والے کے ہیں۔

وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا ۭ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ فِيْمَا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ۝ (۱۰:۱۹)

اور ابتدا میں تمام انسانوں کا ایک ہی گروہ تھا (الگ الگ گروہوں میں متفرق نہ تھے) پھر ایسا ہوا کہ وہ باہم دگر مختلف ہو گئے۔ اور اگر اس بارے میں تمہارے

پروردگار نے پہلے سے ایک فیصلہ نہ کر دیا ہوتا (یعنی یہ کہ انسانوں میں اختلاف ہوگا اور مختلف راہیں لوگ اختیار کریں گے) تو جن باتوں میں لوگ اختلاف کرتے ہیں، ان کا (یہیں دنیا میں) فیصلہ کر دیا جاتا۔

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۟ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۪ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ؕ (۲:۲۱۳)

ابتداء میں تمام انسان ایک ہی گروہ تھے (پھر ان میں اختلاف پیدا ہوا) بس اللہ نے (یکے بعد دیگرے) نبیوں کو مبعوث کیا۔ وہ (نیک عمل کے نتائج کی) بشارت دیتے اور بدعملی کے نتائج سے) متنبہ کرتے۔ نیز ان کے ساتھ ''الکتاب'' (یعنی وحی الٰہی سے لکھی جانے والی تعلیم) نازل کی، تا کہ جن باتوں میں لوگ اختلاف کرنے لگے تھے، ان میں وہ فیصلہ کر دینے والی ہو۔

عموم ہدایت

یہ ہدایت کسی خاص ملک وقوم یا عہد کیلئے مخصوص نہ تھی، بلکہ تمام نوع انسانی کیلئے تھی چنانچہ ہر زمانے اور ہر ملک میں یکساں طور پر اس کا ظہور ہوا۔ قرآن کہتا ہے: دنیا کا کوئی گوشہ نہیں جہاں نسل انسانی آباد ہوئی ہو اور خدا کا کوئی رسول مبعوث نہ ہوا ہو۔

وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ ۝ (۳۵:۲۴)

اور کوئی قوم دنیا کی ایسی نہیں جس میں (بدعملیوں کے نتائج سے) متنبہ کرنے والا (خدا کا کوئی رسول) نہ گزرا ہو۔

اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرٌ وَّلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ۝ (۱۳:۷)

(اے پیغمبر!) بلاشبہ تم اس کے سوا اور کیا ہو کہ (بدعملیوں کے نتائج سے) متنبہ کرنے والے ہو اور دنیا میں ہر قوم کیلئے ایک ہدایت کرنے والا ہوا ہے۔

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ ۚ فَاِذَا جَآءَ رَسُوْلُهُمْ قُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ

وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ۝ (۱۰:۴۷)

اور ہر قوم کیلئے ایک رسول ہے۔ پس جب رسول ظاہر ہوتا ہے تو تمام باتوں کا انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دیا جاتا ہے۔

نسل انسانی کے ابتدائی عہد اور خدا کے رسول

وہ کہتا ہے: نسل انسانی کے ابتدائی عہدوں میں کتنے ہی پیغمبر گزرے ہیں جو یکے بعد دیگرے مبعوث ہوئے اور قوموں کو پیغام حق پہنچایا۔

وَكَمْ أَرْسَلْنَا مِنْ نَبِيٍّ فِي الْأَوَّلِينَ ۝ (۴۳:۶)

اور کتنے ہی نبی ہیں جو ہم نے پہلوں میں (یعنی ابتدائی عہد کی قوموں میں) مبعوث کیے۔

عدل الٰہی اور بعثت رسل

وہ کہتا ہے: یہ بات عدل الٰہی کے خلاف ہے کہ ایک گروہ اپنے اعمال بد کیلئے جواب دہ ٹھہرایا جائے، حالانکہ اس کی ہدایت کیلئے کوئی رسول نہ بھیجا گیا ہو۔

وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتَّى نَبْعَثَ رَسُولًا. (۱۷:۱۵)

اور (ہمارا قانون یہ ہے کہ) جب تک ہم ایک پیغمبر مبعوث کر کے راہ ہدایت دکھا نہ دیں، اس وقت تک (پاداش عمل میں) عذاب دینے والے نہیں۔

وَمَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرَى حَتَّى يَبْعَثَ فِي أُمِّهَا رَسُولًا يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِنَا وَمَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرَى إِلَّا وَأَهْلُهَا ظَالِمُونَ ۝ (۲۸:۵۹)

اور (یاد رکھو!) تمہارے پروردگار کا قانون یہ ہے کہ وہ کبھی انسان کی بستیوں کو (پاداش عمل میں) ہلاک نہیں کرتا، جب تک کہ ان میں ایک پیغمبر مبعوث نہ کر دے اور وہ خدا کی آیتیں پڑھ کر نہ سنا دے۔ اور ہم کبھی بستیوں کو ہلاک کرنے والے نہیں، مگر صرف اسی حالت میں کہ ان کے باشندوں نے ظلم کا شیوہ اختیار کر لیا ہو[۱۰۹]

بعض رسولوں کا ذکر کیا گیا، بعض کا نہیں کیا گیا

خدا کے ان رسولوں اور دین الٰہی کے داعیوں میں سے بعض کا ذکر قرآن میں کیا گیا ہے، بعض کا نہیں کیا گیا۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ. (۴۰:۷۸)

اور (اے پیغمبر!) ہم نے تم سے پہلے کتنے ہی پیغمبر مبعوث کیے۔ ان میں سے کچھ ایسے ہیں جن کے حالات تمہیں سنائے ہیں اور کچھ ایسے ہیں جن کے حالات نہیں سنائے (یعنی قرآن میں ان کا ذکر نہیں کیا گیا)

بے شمار قومیں اور بے شمار رسول

قوم نوح اور عاد و ثمود کے بعد کتنی ہی قومیں گزر چکی ہیں اور ان میں کتنے ہی رسول مبعوث ہو چکے ہیں جن کا ٹھیک ٹھیک حال اللہ ہی کو معلوم ہے۔

اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَبَؤُا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ قَوْمِ نُوْحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ ۬ وَالَّذِيْنَ مِنْ بَعْدِهِمْ ۬ لَا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا اللّٰهُ ۬ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَرَدُّوْٓا اَيْدِيَهُمْ فِيْٓ اَفْوَاهِهِمْ. (۱۴:۹)

تم سے پہلے جو قومیں گزر چکی ہیں، کیا تم تک ان کی خبر نہیں پہنچی؟ قوم نوح، قوم عاد، قوم ثمود اور وہ قومیں جو ان کے بعد ہوئیں۔ جن کی ٹھیک ٹھیک تعداد اللہ ہی کو معلوم ہے۔ ان سب میں ان کے پیغمبر سچائی کی روشنیوں کے ساتھ مبعوث ہوئے، مگر انہوں نے جہل اور سرکشی سے ان کی تعلیم انہیں پر لوٹا دی اور کان دھرنے سے انکار کر دیا۔

ہدایت ہمیشہ ایک ہی رہی اور وہ ایمان اور عمل صالح کی دعوت کے سوا کچھ نہ تھی:

فطرت الٰہی کی راہ کائنات ہستی کے ہر گوشے میں ایک ہی ہے۔ وہ نہ تو ایک سے زیادہ ہو سکتی ہے نہ باہم دگر مختلف۔ پس ضروری تھا کہ یہ ہدایت بھی اول دن سے ایک ہی ہوتی

اور ایک ہی طرح پر تمام انسانوں کو مخاطب کرتی۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے: خدا کے جتنے پیغمبر پیدا ہوئے، خواہ وہ کسی زمانے اور کسی گوشے میں ہوئے ہوں، سب کی راہ ایک ہی تھی اور سب نے خدا کے ایک ہی عالم گیر قانون سعادت کی تعلیم دینے والے تھے۔ یہ عالم گیر قانون سعادت کیا ہے؟ ایمان اور عمل صالح کا قانون ہے۔ یعنی ایک پروردگار عالم کی پرستش کرنی اور نیک عملی کی زندگی بسر کرنی۔ اس کے علاوہ اور اس کے خلاف جو کچھ بھی دین کے نام سے کہا جاتا ہے، دین حقیقی کی تعلیم نہیں ہے:

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ. (۱۶:۳۶)

اور بلاشبہ ہم نے دنیا کی ہر قوم میں ایک پیغمبر مبعوث کیا (جس کی تعلیم یہ تھی) کہ اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت سے (یعنی سرکش اور شریر قوتوں کے اغوا سے) اجتناب کرو۔

وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ۝ (۲۱:۲۵)

اور (اے پیغمبر!) ہم نے تم سے پہلے کوئی رسول دنیا میں نہیں بھیجا مگر اس وحی کے ساتھ کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں، پس میری ہی عبادت کرو۔

سب نے ایک ہی دین پر اکٹھے رہنے اور تفرقہ واختلاف سے بچنے کی تعلیم دی

وہ کہتا ہے: دنیا میں کوئی بانی مذہب بھی ایسا نہیں ہوا ہے جس نے ایک ہی دین پر اکٹھے رہنے اور تفرقہ واختلاف سے بچنے کی تعلیم نہ دی ہو۔ سب کی تعلیم یہی تھی کہ خدا کا دین بچھڑے ہوئے انسانوں کو جمع کر دینے کے لئے ہے، الگ الگ کر دینے کیلئے نہیں ہے۔ پس ایک پروردگار عالم کی بندگی ونیاز میں سب متحد ہو جاؤ اور تفرقہ مخاصمت کی جگہ باہمی محبت و یک جہتی کی راہ اختیار کرو۔

وَاِنَّ هٰذِهٖ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ ۝ (۲۳:۵۲)

اور (دیکھو!) یہ تمہاری امت فی الحقیقت ایک ہی امت ہے اور میں تم سب کا

پروردگار ہوں، پس (میری عبودیت ونیاز کی راہ میں تم سب ایک ہو جاؤ اور) نافرمانی سے بچو۔

وہ کہتا ہے خدا نے تمہیں ایک ہی جامۂ انسانیت دیا تھا، لیکن تم نے طرح طرح کے بھیس اور نام اختیار کر لئے اور رشتہ انسانیت کی وحدت سینکڑوں ٹکڑوں میں بکھر گئی۔ تمہاری نسلیں بہت سی ہیں، اس لئے تم نسل کے نام پر ایک دوسرے سے الگ ہو گئے ہو۔ تمہارے وطن بہت سے بن گئے ہیں، اس لئے اختلاف وطن کے نام پر ایک دوسرے سے لڑ رہے ہو۔ تمہاری قومیتیں بے شمار ہیں، اس لئے ہر قوم دوسری قوم سے دست وگریباں ہو رہی ہے۔ تمہارے رنگ یکساں نہیں اور یہ بھی باہمی نفرت وعناد کا ایک بڑا ذریعہ بن گیا ہے۔ تمہاری بولیاں مختلف ہیں اور یہ بھی ایک دوسرے سے جدا رہنے کی بہت بڑی حجت بن گئی ہے۔ پھر ان کے علاوہ امیر وفقیر، نوکر وآقا، وضیع وشریف، ضعیف وقوی، ادنیٰ واعلیٰ بے شمار اختلاف پیدا کر لئے گئے ہیں اور سب کا منشا یہی ہے کہ ایک دوسرے سے جدا ہو جاؤ اور ایک دوسرے سے نفرت کرتے رہو۔ ایسی حالت میں بتلاؤ وہ رشتہ کون سا رشتہ ہے جو اتنے اختلافات رکھنے پر بھی انسانوں کو ایک دوسرے سے جوڑ دے اور انسانیت کا بچھڑا ہوا گھرانا پھر از سر نو آباد ہو جائے؟ وہ کہتا ہے: صرف ایک ہی رشتہ باقی رہ گیا ہے اور وہ خدا پرستی کا مقدس رشتہ ہے۔ تم کتنے ہی الگ الگ ہو گئے ہو، لیکن تمہارے خدا الگ الگ نہیں ہو جا سکتے۔ تم سب ایک ہی پروردگار کے بندے ہو۔ تم سب کی بندگی ونیاز کے لئے ایک ہی معبود کی چوکھٹ ہے۔ تم بے شمار اختلاف رکھنے پر بھی ایک ہی رشتۂ عبودیت میں جکڑے ہوئے ہو۔ تمہاری کوئی نسل ہو، تمہارا کوئی وطن ہو، تمہاری کوئی قومیت ہو، تم کسی درجے میں اور کسی حلقے کے انسان ہو، لیکن جب ایک ہی پروردگار کے آگے سر نیاز جھکا دو گے تو یہ آسمانی رشتہ تمہارے تمام ارضی اختلافات مٹا دے گا۔ تم سب کے بچھڑے ہوئے دل ایک دوسرے سے جڑ جائیں گے۔ تم محسوس کرو گے کہ تمام دنیا تمہارا وطن ہے، تمام نسل انسانی تمہارا گھرانا ہے اور تم سب ایک ہی "رب العالمین" کی عیال ہو۔

چنانچہ وہ کہتا ہے: خدا کے جتنے رسول بھی پیدا ہوئے، سب کی تعلیم یہی تھی کہ "الدین" پر یعنی بنی نوع انسانی کے ایک ہی عالم گیر دین پر قائم رہو اور اس راہ میں ایک دوسرے سے الگ الگ نہ ہو جاؤ۔

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ. (۴۲:۱۳)

اور (دیکھو!) اس نے تمہارے لئے دین کی وہی راہ قرار دی ہے جس کی وصیت نوح کو کی گئی تھی اور جس پر چلنے کا حکم ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا تھا۔ (ان سب کی تعلیم یہی تھی) کہ الدین (یعنی خدا کا ایک ہی دین) قائم رکھو اور اس راہ میں الگ الگ نہ ہو جاؤ۔

قرآن کی تحدی کہ اس حقیقت کے خلاف کوئی مذہبی تعلیم اور روایت نہیں پیش کی جا سکتی:

اسی بنا پر وہ بطور ایک دلیل کے اس بات پر زور دیتا ہے کہ اگر تمہیں میری تعلیم کی سچائی سے انکار ہے تو کسی مذہب کی الہامی کتاب سے بھی ثابت کر دکھاؤ کہ دین حقیقی کی راہ اس کے سوا کچھ اور بھی ہو سکتی ہے۔ تم جس مذہب کی بھی حقیقی تعلیم دیکھو گے، اصل و بنیاد یہی ملے گی:

قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ هٰذَا ذِكْرُ مَنْ مَّعِيَ وَذِكْرُ مَنْ قَبْلِيْ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ الْحَقَّ فَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ۝ (۲۱:۲۴، ۲۵)

(اے پیغمبر! ان سے) کہہ دو (اگر تمہیں میری تعلیم سے انکار ہے تو) اپنی دلیل پیش کرو۔ یہ تعلیم موجود ہے جس پر میرے ساتھی یقین رکھتے ہیں اور اسی طرح وہ تمام تعلیمیں بھی موجود ہیں جو مجھ سے پہلے قوموں کو دی گئیں (تم ثابت کر دکھاؤ کسی نے بھی میری تعلیم کے خلاف تعلیم دی ہو) اصل یہ ہے کہ ان (منکرین حق) میں اکثر آدمی ایسے ہیں جنہیں سرے سے امر حق کی خبر ہی نہیں اور اس لئے حقیقت کی

طرف سے گردن موڑے ہوئے ہیں (اے پیغمبر! یقین کر) ہم نے تجھ سے پہلے کوئی پیغمبر بھی ایسا نہیں بھیجا جسے اس بات کے سوا کوئی دوسری بات بتلائی گئی ہو کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں، پس میری ہی عبادت کرو۔

اتنا ہی نہیں، بلکہ وہ کہتا ہے: علم و بصیرت کے کسی قول اور روایت سے تم ثابت کر دکھاؤ کہ جو کچھ میں بتلا رہا ہوں، یہی تمام پچھلی دعوتوں کی تعلیم نہیں رہی ہے۔

اِیْتُوْنِیْ بِکِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ ھٰذَآ اَوْ اَثٰرَةٍ مِّنْ عِلْمٍ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ○ (۴:۴۶)

اگر تم (اپنے انکار میں) سچے ہو تو (ثبوت میں) کوئی کتاب پیش کرو جو اب سے پہلے نازل ہوئی ہو یا (کم از کم) علم و بصیرت کی کوئی پچھلی روایت ہی لا دکھاؤ جو تمہارے پاس موجود ہو۔

تمام مقدس کتابوں کی باہم دگر تصدیق اور اس سے قرآن کا استدلال

اسی بنا پر وہ تمام مذاہب عالم کی باہم دگر تصدیق کو بھی بطور ایک دلیل کے پیش کرتا ہے۔ یعنی وہ کہتا ہے: ان میں سے ہر تعلیم دوسری تعلیم کی تصدیق کرتی ہے، جھٹلاتی نہیں۔ اور جب ہر تعلیم دوسری تعلیم کی تصدیق کرتی ہے تو اس سے معلوم ہوا ان تمام تعلیمات کے اندر کوئی ایک ہی ثابت و قائم حقیقت ضرور کام کر رہی ہے، کیونکہ اگر مختلف وقتوں، مختلف گوشوں، مختلف قوموں، مختلف ناموں، مختلف پیرایوں اور مختلف زبانوں سے کوئی بات کہی گئی ہو اور باوجود ان تمام اختلافات کے بات ہمیشہ ایک ہی ہو اور ایک ہی مقصد پر زور دیتی ہو تو قدرتی طور تمہیں ماننا پڑے گا کہ ایسی بات اصلیت سے خالی نہیں ہو سکتی۔

نَزَّلَ عَلَیْکَ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ وَاَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِیْلَ مِنْ قَبْلُ ھُدًی لِّلنَّاسِ. (۴،۳:۳)

(اے پیغمبر!) اللہ نے تم پر یہ کتاب سچائی کے ساتھ نازل کی ہے جو ان کتابوں کی تصدیق کرتی ہے جو اس سے پہلے نازل ہو چکی ہیں اور اسی طرح لوگوں کی ہدایت

کے لئے اس نے تورات اور انجیل نازل کی تھی۔

وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ فِيْهِ هُدًى وَّنُوْرٌ وَّمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ (۵:۴۶)

اور ہم نے عیسیٰ کو انجیل عطا کی ،اس میں انسان کے لئے ہدایت اور روشنی ہے،اور اس سے پہلے جو تورات نازل ہو چکی تھی وہ اس کی تصدیق کرتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں اس کے بیان وموعظت کا ایک بڑا موضوع پچھلے عہدوں کی ہدایتوں اور رسالتوں کا تذکرہ ہے۔ وہ ان کی یکسانی ،ہم آہنگی اور وحدت تعلیم سے مذہبی صداقت کے تمام مقاصد پر استشہاد کرتا ہے۔

”الدین“ اور ”الشرع“

ادیان کا اختلاف

اچھا! اگر تمام نوع انسانی کے لئے دین ایک ہی ہے اور تمام بانیان مذاہب نے ایک ہی اصل وقانون کی تعلیم دی ہے تو پھر مذاہب میں اختلاف کیوں ہوا؟ کیوں تمام مذہبوں میں ایک ہی طرح کے احکام ،ایک ہی طرح کے اعمال ، ایک ہی طرح کے رسوم وظواہر نہ ہوئے؟ کسی مذہب میں عبادت کی ایک خاص شکل اختیار کی گئی ہے،کسی میں دوسری۔ کسی مذہب کے ماننے والے ایک طرف منہ کر کے عبادت کرتے ہیں ،کسی مذہب کے ماننے والے دوسری طرف۔ کسی کے ہاں احکام وقوانین ایک خاص طرح کی نوعیت کے ہیں، کسی کے ہاں دوسری طرح کے۔

اختلاف دین نہیں ہوا، شرع ومنہاج میں ہوا اور یہ ناگزیر تھا

قرآن کہتا ہے: مذاہب کا اختلاف دو طرح کا ہے۔ ایک اختلاف تو وہ ہے جو پیروان مذاہب نے مذہب کی حقیقی تعلیم سے منحرف ہو کر پیدا کر لیا ہے۔ یہ اختلاف مذاہب کا

اختلاف نہیں ہے، پیروان مذہب کی گمراہی کا نتیجہ ہے۔ دوسرا اختلاف وہ ہے جو فی الحقیقت مذاہب کے احکام واعمال میں پایا جاتا ہے۔ مثلاً ایک مذہب میں عبادت کی کوئی خاص شکل اختیار کی گئی ہے، دوسرے میں کوئی دوسری شکل تو یہ اختلاف اصل وحقیقت کا اختلاف نہیں ہے، محض فروع وظواہر کا اختلاف ہے اور ضروری تھا کہ ظہور میں آتا۔

وہ کہتا ہے: مذاہب کی تعلیم دو قسم کی باتوں سے مرکب ہے۔ ایک قسم تو وہ ہے جو ان کی روح وحقیقت ہے، دوسری وہ ہے جن سے ان کی ظاہری شکل وصورت آراستہ کی گئی ہے۔ پہلی چیز اصل ہے، دوسری فرع ہے۔ پہلی چیز کو وہ ''دین'' سے تعبیر کرتا ہے، دوسری کو ''شرع'' اور ''نسک'' سے اور اس کے لئے ''منہاج'' کا لفظ بھی استعمال کیا گیا ہے۔ ''شرع'' اور ''منہاج'' کے معنی راہ کے ہیں اور ''نسک'' سے مقصود عبادت کا طور طریقہ ہے۔ پھر اصطلاح میں ''شرع'' قانون مذہب کو کہنے لگے اور ''نسک'' عبادت کو۔ وہ کہتا ہے: مذاہب میں جس قدر بھی اختلاف ان کا اصلی اختلاف ہے، وہ ''دین'' کا اختلاف نہیں۔ محض شرع ومنہاج کا اختلاف ہے۔ یعنی اصل کا نہیں ہے فرع کا ہے۔ حقیقت کا نہیں ہے ظواہر کا ہے، روح کا نہیں ہے صورت کا ہے۔ اور ضروری تھا کہ یہ اختلاف ظہور میں آتا۔ مذہب کا مقصود انسانی جمعیت کی سعادت واصلاح ہے لیکن انسانی جمعیت کے احوال وظروف ہر عہد اور ہر ملک میں یکساں نہیں رہے ہیں اور نہ یکساں رہ سکتے تھے۔ کسی زمانے کی معاشرتی اور مذہبی استعداد ایک خاص طرح کی نوعیت رکھتی تھی، کسی زمانے میں ایک خاص طرح کی۔ کسی ملک کے حالات ایک خاص طرح کی معیشت چاہتے تھے، کسی دوسرے ملک کے حالات دوسری طرح کے۔ پس جس مذہب کا ظہور جیسے زمانے میں اور جیسی استعداد وطبعیت کے لوگوں میں ہوا، اسی کے مطابق شرع ومنہاج کی صورت بھی اختیار کی گئی۔ جس عہد اور جس ملک میں جو صورت اختیار کی گئی وہی اس کے لئے موزوں تھی۔ اس لئے ہر صورت اپنی جگہ بہتر اور حق ہے۔ اور یہ اختلاف اس سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا جتنی اہمیت نوع بشری کے تمام معاشرتی اور طبعی اختلافات کو دی جاسکتی ہے۔

لِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا هُمْ نَاسِكُوْهُ فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِى الْاَمْرِ وَادْعُ اِلٰى رَبِّكَ ؕ اِنَّكَ لَعَلٰى هُدًى مُّسْتَقِيْمٍ (۲۲:۶۷)

(اے پیغمبر!) ہم نے ہر گروہ کیلئے عبادت کا ایک خاص طور طریقہ ٹھہرا دیا ہے جس پر وہ چلتا ہے۔ پس لوگوں کو چاہیئے اس معاملے میں تم سے جھگڑا نہ کریں۔ تم لوگوں کو اپنے پروردگار کی طرف دعوت دو، یقیناً تم ہدایت کے سیدھے راستے پر گامزن ہو۔

تحویل قبلہ کا معاملہ اور قرآن کا اعلان حقیقت

جب تحویل قبلہ کا معاملہ پیش آیا، یعنی پیغمبر اسلام ﷺ بیت المقدس کی جگہ خانہ کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے لگے تو یہ بات یہودیوں اور عیسائیوں پر بہت شاق گزری۔ ان کے نزدیک مذہب کا تمام دارمدار اسی طرح کی ظاہری اور فروعی باتوں پر تھا اور انہیں کو وہ حق و باطل کا معیار سمجھتے تھے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں قرآن نے اس معاملے کو بالکل دوسری ہی نظر سے دیکھا ہے۔ وہ کہتا ہے۔ تم اس طرح کی باتوں کو اس قدر اہمیت کیوں دیتے ہو؟ یہ نہ تو حق و باطل کا معیار ہیں نہ مذہب کی اصل وحقیقت میں انہیں کوئی دخل ہے۔ ہر مذہب نے اپنے اپنے حالات ومقتضیات کے مطابق کوئی ایک طریقہ عبادت کا اختیار کر لیا تھا۔ اور اس پر لوگ کاربند ہو گئے۔ مقصود اصلی سب کا ایک ہی ہے اور وہ خدا پرستی اور نیک عملی ہے۔ پس جو شخص سچائی کا طلب گار ہے، اسے چاہیئے کہ اصل مقصود پر نظر رکھے اور اسی کے لحاظ سے ہر بات کو جانچے پرکھے۔ ان باتوں کو حق و باطل کا معیار نہ بنا لے۔

وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ؕ اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يَاْتِ بِكُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ○ (۲:۱۴۸)

اور (دیکھو!) ہر گروہ کیلئے کوئی نہ کوئی سمت ہے جس کی طرف عبادت کرتے ہوئے وہ اپنا منہ کر لیتا ہے، پس (اس معاملے کو اس قدر طول نہ دو) نیکی کی راہ میں ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانے کی کوشش کرو (کہ اصلی کام یہی ہے)

تم کسی جگہ بھی ہو اللہ تم سب کو پالے گا، اللہ کی قدرت سے کوئی چیز باہر نہیں۔

قرآن کے نزدیک دین کے اعتقاد وعمل کی اصلی باتیں کیا کیا ہیں؟

پھر اسی صورت میں آگے چل کر صاف صاف لفظوں میں واضح کر دیا ہے کہ اصل دین کیا ہے اور کن باتوں سے ایک انسان دین کی سعادت وفلاح حاصل کر سکتا ہے۔ وہ کہتا ہے: دین محض اس طرح کی باتوں میں نہیں دھرا ہے کہ ایک شخص نے عبادت کے وقت پچھّم کی طرف منہ کر لیا یا پورب کی طرف۔ اصل دین تو یہ ہے کہ دیکھا جائے خدا پرستی اور نیک عملی کے لحاظ سے ایک انسان کا کیا حال ہے۔ پھر تفصیل کے ساتھ بتلایا ہے کہ خدا پرستی اور نیک عملی کی باتیں کیا کیا ہیں۔

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ۗ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ۗ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ○ (۲: ۱۷۷)

اور (دیکھو!) نیکی یہ نہیں ہے کہ تم نے (عبادت کے وقت) اپنا منہ پورب کی طرف اور پچھّم کی طرف کر لیا (یا اسی طرح کی کوئی دوسری بات ظاہری رسم اور ڈھنگ کی کر لی) نیکی کی راہ تو اس کی راہ ہے جو اللہ پر، آخرت کے دن پر، ملائکہ پر، تمام کتابوں پر اور تمام نبیوں پر ایمان لاتا ہے، اور اپنا مال خدا کی محبت کی راہ میں رشتے داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں اور سائلوں کو دیتا ہے اور غلاموں کے آزاد کرانے میں خرچ کرتا ہے، نماز قائم کرتا ہے، زکوٰۃ ادا کرتا ہے، قول وقرار کا پکا ہوتا ہے، تنگی اور مصیبت کی گھڑی ہو یا خوف وہراس کا وقت، ہر حال میں ثابت قدم رہتا ہے۔ (سو یاد رکھو!) ایسے ہی لوگ ہیں (جو اپنی دین داری میں) سچے ہیں اور

یہی ہیں جو برائیوں سے بچنے والے ہیں۔

جس کتاب میں تیرہ سو برس سے یہ آیت موجود ہے، اگر دنیا اس کی دعوت کا مقصد اصلی نہیں سمجھ سکتی تو پھر کون سی بات ہے جسے دنیا سمجھ سکتی ہے؟

خدا کی حکمت اسی کی مقتضی ہوئی کہ اختلاف شرائع ظہور میں آئے

سورہ مائدہ میں ہم دیکھتے ہیں ایک خاص ترتیب کے ساتھ مختلف دعوتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ذکر حضرت موسیٰ اور تورات سے شروع ہوتا ہے۔

اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰةَ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ (۵:۴۴)

پھر حضرت مسیح کے ظہور کا ذکر کیا جاتا ہے۔

وَقَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ (۵:۴۶)

حضرت مسیح کے بعد پیغمبر اسلام کا ظہور ہوا۔

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ (۵:۴۸)

پھر ان مختلف دعوتوں کے ذکر کے بعد وہ لوگوں کو مخاطب کرتا ہے اور کہتا ہے

لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا ۭ وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ. (۵:۴۸)

ہم نے تم میں سے ہر ایک کیلئے (یعنی ہر دعوت کے پیروؤں کیلئے) ایک خاص شریعت اور راہ ٹھہرا دی۔ اگر اللہ چاہتا تو (شریعتوں کا کوئی اختلاف نہ ہوتا) تم سب کو ایک امت بنا دیتا، لیکن یہ اختلاف اس لئے ہوا کہ (ہر وقت وحالت کے مطابق) تمہیں جو احکام دیئے گئے ہیں، ان میں تمہاری آزمائش کرے۔ پس (اس اختلاف کے پیچھے نہ پڑو) نیکی کی راہوں میں ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی کوشش کرو۔

پیروان مذہب نے دین کی وحدت بھلا دی اور شرع کے اختلاف کو بناءِ نزاع بنا لیا

اس آیات پر سرسری نظر ڈال کر آگے نہ بڑھ جاؤ، بلکہ اس کے ایک ایک لفظ پر غور کرو۔

قرآن کا جب ظہور ہوا تو دنیا کا یہ حال تھا کہ تمام پیروان مذاہب مذہب کو صرف اس کے ظواہر ورسوم ہی میں دیکھتے تھے اور مذہبی اعتقاد کا تمام جوش و خروش اسی طرح کی باتوں میں سمٹ آیا تھا۔ ہر گروہ یقین کرتا تھا کہ دوسرا گروہ نجات سے محروم ہے۔ کیونکہ وہ دیکھتا تھا دوسرے کے اعمال ورسوم ویسے نہیں ہیں جیسے خود اس نے اختیار کر رکھے ہیں۔ لیکن قرآن کہتا ہے کہ نہیں، یہ اعمال ورسوم نہ تو دین کی اصل وحقیقت ہیں نہ ان کا اختلاف حق و باطل کا اختلاف ہے۔ یہ محض مذہب کی عملی زندگی کا ظاہری ڈھانچہ ہے۔ مگر روح وحقیقت ان سے بالاتر ہے اور وہی اصل دین ہے۔ اصل دین کیا ہے؟ ایک خدا کی پرستش اور نیک عملی کی زندگی۔ یہ کسی ایک گروہ ہی کی میراث نہیں ہے کہ اس کے سوا کسی انسان کو نہ ملی ہو۔ یہ تمام مذاہب میں یکساں طور پر موجود ہے۔ اور چونکہ یہ اصل دین ہے، اس لئے نہ تو اس میں تغیر ہوا نہ کسی کا اختلاف رونما ہوا۔ اعمال ورسوم فرع ہیں، اس لئے ہر زمانے اور ہر ملک کی حالت کے مطابق بدلتے رہے اور جس قدر بھی اختلاف ہوا انہیں میں ہوا۔

پھر وہ کہتا ہے: اعمال ورسوم کے اس اختلاف کو تم اس قدر اہمیت کیوں دے رہے ہو؟ خدا نے ہر زمانے اور ہر ملک کیلئے ایک خاص طرح کا طور طریقہ ٹھہرا دیا تھا جو اس کی حالت اور ضرورت کے مطابق مناسب تھا اور وہ اس پر کاربند ہو گیا۔ اگر خدا چاہتا تو تمام نوع انسانی کو ایک ہی قوم و جماعت بنا دیتا اور فکر و عمل کا کوئی اختلاف وجود میں ہی نہ آتا، لیکن معلوم ہے کہ خدا نے ایسا نہیں چاہا۔ اس کی حکمت کا مقتضیٰ یہی ہوا کہ فکر و عمل کی مختلف حالتیں پیدا ہوں۔ پس اس اختلاف کو حق و باطل کا اختلاف کیوں بنا لیا جائے؟ کیوں اس اختلاف کی بنا پر ایک جماعت دوسری جماعت سے برسر پیکار رہے؟ اصلی چیز جس پر تمام تر توجہ مبذول کرنی چاہئے ''خیرات'' ہے، یعنی نیکی کے کام ہیں اور تمام اعمال ورسوم بھی انہیں کیلئے ہیں۔

غور کرو اس آیت میں "لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا" کہا، یعنی تم میں سے ہر جماعت کے لئے ہم نے ایک ''شرع'' اور ''منہاج'' ٹھہرا دی۔ یہ نہیں کہا کہ ایک ''دین'' ٹھہرا دیا۔ کیونکہ دین تو سب کیلئے ایک ہی ہے۔ اس میں تعداد اور تنوع نہیں ہو سکتا

۔ البتہ شرع و منہاج سب کیلئے یکساں نہیں ہو سکتے، ضروری تھا کہ ہر عہد اور ہر ملک کے احوال وظروف کے مطابق مختلف ہوں۔ پس مذاہب کا اختلاف اصل کا اختلاف نہیں ہوا، محض فرع کا اختلاف ہوا۔

اس موقع پر یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ جہاں کہیں قرآن نے اس بات پر زور دیا ہے کہ ''اگر خدا چاہتا تو تمام انسان ایک ہی راہ پر جمع ہو جاتے'' یا ''ایک ہی قوم بن جاتے'' جیسا کہ آیت مندرجہ صدر میں ہے تو ان سب سے مقصود اسی حقیقت کا اظہار ہے۔ وہ چاہتا ہے یہ بات لوگوں کے دلوں میں اتار دے کہ فکر و عمل کا اختلاف طبیعت بشری کا قدرتی خاصہ ہے اور جس طرح ہر گوشے میں موجود ہے، اسی طرح مذہب کے معاملے میں بھی موجود ہے۔ پس اس اختلاف کو حق و باطل کا معیار نہیں سمجھنا چاہیے۔ وہ کہتا ہے: جب خدا نے انسان کی طبیعت ہی ایسی بنائی ہے کہ ہر انسان، ہر قوم، ہر عہد اپنی اپنی سمجھ، اپنی اپنی پسند اور اپنا اپنا طور طریقہ رکھتا ہے اور ممکن نہیں کسی ایک چھوٹی سے چھوٹی بات میں بھی تمام انسانوں کی طبعیت ایک طرح کی ہو جائے تو پھر کیونکر ممکن تھا کہ مذہبی اعمال و رسوم کی راہیں مختلف نہ ہوتیں اور سب ایک ہی طرح کی وضع و حالت اختیار کر لیتے؟ یہاں بھی اختلاف ہونا تھا اور اختلاف ہوا۔ کسی نے ایک طریقے سے اصل مقصود حاصل کرنا چاہا، کسی نے دوسرے طریقے سے، لیکن اصل مقصود یعنی خدا پرستی اور نیک عملی کی تعلیم تو اس میں سب متفق رہے۔ پس جب اصل مقصود سب کا ایک ہے تو محض ظواہر و اعمال کے اختلاف سے کیوں ایک دوسرے کے مخالف و معاند ہو جائیں؟ کیوں ہر گروہ دوسرے گروہ کو جھٹلائے؟ کیوں مذہبی سچائی کسی ایک ہی نسل و گروہ کی میراث سمجھ لی جائے؟

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ شریعتوں کے اس اختلاف ہی کیلئے نہیں، بلکہ فکر و عمل کے ہر اختلاف کیلئے رواداری اور وسعت نظر کی تعلیم دیتا ہے، یہاں تک کہ جو لوگ اس کی دعوت کے خلاف جبر و تشدد کام میں لا رہے تھے، ان کی طرف سے بھی اسے معذرت کرنے میں تامل نہیں۔ ایک موقع پر خود پیغمبر اسلام کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے: تم جوش دعوت میں چاہتے

ہو کہ ہر انسان کو راہ حقیقت دکھا دو، لیکن تمہیں یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ اختلاف فکر و عمل طبیعت انسانی کا قدرتی خاصہ ہے۔ تم بہ جبر کسی کے اندر ایک بات نہیں اتار دے سکتے۔

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا ؕ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۝ (۱۰:۹۹)

اور اگر تمہارا پروردگار چاہتا تو زمین میں جتنے انسان ہیں سب ایمان لے آتے (لیکن تم دیکھ رہے ہو کہ اس کی حکمت کا فیصلہ یہی ہوا کہ ہر انسان اپنی اپنی سمجھ اور اپنی اپنی راہ رکھے) پھر کیا تم چاہتے ہو لوگوں کو مجبور کر دو کہ مومن ہو جائیں؟

وہ کہتا ہے، انسان کی طبیعت ایسی واقع ہوئی ہے کہ ہر جماعت کو اپنا ہی طور طریقہ اچھا دکھائی دیتا ہے، وہ اپنی باتوں کو دوسروں کی مخالفانہ نگاہ سے نہیں دیکھ سکتا۔ جس طرح تمہاری نظر میں سب سے بہتر راہ تمہاری ہے، ٹھیک اسی طرح دوسروں کی نظر میں سب سے بہتر راہ ان کی ہے۔ پس اس کے سوا چارہ نہیں کہ اس بارے میں تحمل اور رواداری اپنے اندر پیدا کرو۔

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ كَذٰلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ اُمَّةٍ عَمَلَهُمْ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ مَّرْجِعُهُمْ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ (۶:۱۰۸)

اور (دیکھو!) جو لوگ خدا کو چھوڑ کر دوسرے معبودوں کو پکارتے ہیں، تم ان پر سب وشتم نہ کرو۔ کیونکہ نتیجہ یہ نکلے گا کہ یہ لوگ بھی از راہ جہل و نادانی خدا کو برا بھلا کہنے لگیں گے۔ (یاد رکھو!) ہم نے انسان کی طبیعت ہی ایسی بنائی ہے کہ ہر گروہ کو اپنا ہی عمل اچھا دکھائی دیتا ہے۔ پھر بالآخر سب کو اپنے پروردگار کی طرف لوٹنا ہے اور وہیں ہر گروہ پر اس کے اعمال کی حقیقت کھلنے والی ہے۔

''تشیع'' اور ''تحزب'' کی گمراہی اور تجدید دعوت کی ضرورت

اچھا! جب تمام مذاہب کا اصل مقصد ایک ہی ہے اور سب کی بنیاد سچائی پر ہے تو پھر قرآن کے ظہور کی ضرورت کیا تھی؟

وہ کہتا ہے: اس لئے کہ اگر چہ تمام مذاہب سچے ہیں، لیکن تمام مذاہب کے پیرو سچائی سے منحرف ہو گئے ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ سب کو ان کی گم شدہ سچائی پر از سرنو جمع کر دیا جائے۔

اس سلسلے میں اس نے پیروان مذاہب کی تمام گمراہیاں ایک ایک کر کے گنائی ہیں۔ وہ اعتقادی اور عملی دونوں طرح کی ہیں۔ من جملہ ان کے ایک سب سے بڑی گمراہی جس پر جا بجا زور دیتا ہے، وہ ہے، جسے اس نے "تشیع" اور "تحزب" کے الفاظ سے تعبیر کیا ہے۔ عربی میں "تشیع" اور "تحزب" کے معنی یہ ہیں کہ الگ الگ جتھے بنا لینا اور ان میں ایسی روح کا پیدا ہو جانا جسے اردو میں گروہ پرستی کی روح سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِيْ شَيْءٍ ۭ اِنَّمَآ اَمْرُهُمْ اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ۝ (۶:۱۵۹)

جن لوگوں نے اپنے ایک ہی دین کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے اور الگ الگ گروہ بندیوں میں بٹ گئے، تمہیں ان سے کوئی واسطہ نہیں، ان کا معاملہ خدا کے حوالے ہے، جیسے کچھ ان کے عمل رہے ہیں اس کا نتیجہ خدا انہیں بتا دے گا۔

فَتَقَطَّعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ زُبُرًا ۭ كُلُّ حِزْبٍۢ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ۝ (۲۳:۵۳)

پھر لوگوں نے ایک دوسرے سے کٹ کر جدا جدا دین بنا لئے، ہر ٹولی کے پلے جو کچھ پڑ گیا اسی میں مگن ہے۔

تشیع اور تحزب کی حقیقت

"تشیع" اور "تحزب" کی گمراہی سے کیا مقصود ہے، اسے پوری وضاحت کے ساتھ سمجھ لینا چاہئے۔ وہ کہتا ہے: خدا کے ٹھہرائے ہوئے دین کی حقیقت تو یہ تھی کہ نوع انسانی پر خدا پرستی اور نیک عملی کی راہ کھولنا تھا، یعنی خدا کے اس قانون کا اعلان کرنا تھا کہ دنیا کی ہر چیز کی طرح انسانی افکار و اعمال کے بھی خواص و نتائج ہیں۔ اچھے فکر و عمل کا بدلہ اچھا ہے۔ برے فکر و عمل کا بدلہ برا ہے۔ لیکن لوگوں نے یہ حقیقت فراموش کر دی اور دین و مذہب کو نسلوں،

قوموں، ملکوں اور طرح طرح کی رسموں اور رواجوں کا ایک جتھا بنا لیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اب انسان کی نجات وسعادت کی راہ یہ نہیں سمجھی جاتی کہ کس کا اعتقاد اور عمل کیسا ہے، بلکہ سارا دارومدار اس پر آکے ٹھہر گیا ہے کہ کون کس جتھے اور گروہ بندی میں داخل ہے۔ تو یقین کیا جاتا ہے کہ وہ نجات یافتہ ہے اور دین کی سچائی اسے مل گئی۔ اگر داخل نہیں ہے تو یقین کیا جاتا ہے کہ نجات کا دروازہ اس پر بند ہو گیا اور دین کی سچائی میں اس کا کوئی حصہ نہیں۔ گویا دین کی سچائی، آخرت کی نجات اور حق و باطل کا معیار تمام تر گروہ بندی اور گروہ پرستی ہو گئی، اعتقاد اور عمل کوئی چیز نہیں ہے۔ پھر باوجودیکہ تمام مذاہب کا مقصود اصلی ایک ہی ہے اور سب ایک ہی پروردگار عالم کی پرستش کرنے کے مدعی ہیں، لیکن ہر گروہ یقین کرتا ہے کہ دین کی سچائی صرف اسی کے حصے میں آئی ہے، باقی تمام نوع انسانی اس سے محروم ہے۔ چنانچہ ہر مذہب کے خلاف نفرت وتعصب کی تعلیم دیتا ہے اور دنیا میں خدا پرستی اور دین کی راہ سرتاسر بغض عداوت، نفرت وتوحش اور قتل وخوں ریزی کی راہ بن گئی ہے۔

اس بارے میں دعوت قرآنی کی تین مہمات

اس سلسلے میں قرآن نے جن مہمات پر زور دیا ہے ان میں تین باتیں سب سے نمایاں ہیں۔

۱۔ انسان کی نجات وسعادت کا دارومدار اعتقاد وعمل پر ہے، نہ کہ کسی خاص گروہ بندی پر۔

۲۔ نوع انسانی کیلئے دین الٰہی ایک ہی ہے اور یکساں طور پر سب کو اسی کی تعلیم دی گئی ہے۔ پس یہ جو پیروان مذہب نے دین کی وحدت اور عالم گیر حقیقت ضائع کر کے بہت سے متخالف اور متخاصم جتھے بنا لیے ہیں، یہ صریح گمراہی ہے۔

۳۔ اصل دین توحید ہے، یعنی ایک پروردگار عالم کی براہ راست پرستش کرنی، اور تمام بانیان مذاہب نے اسی کی تعلیم دی ہے۔ اس کے خلاف جس قدر عقائد اور اعمال اختیار کر لیے گئے ہیں، اصلیت سے انحراف کا نتیجہ ہیں۔

یہودیت اور نصرانیت کی گروہ بندی اور اس کا رد

چنانچہ آیات مندرجہ صدر کے علاوہ حسب ذیل آیات میں بھی اسی حقیقت پر زور دیا گیا ہے۔

وَقَالُوا لَنْ يَدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّامَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ قُلْ هَاتُوْابُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَO بَلٰى مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَمُحْسِنٌ فَلَهٗ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَO (۲:۱۱۱-۱۱۲)

اور یہود اور نصاریٰ نے کہا: جنت میں کوئی انسان داخل نہیں ہوسکتا جب تک یہود اور نصاریٰ نہ ہو (یعنی جب تک یہودیت اور نصرانیت کی گروہ بندیوں میں داخل نہ ہو) یہ ان لوگوں کی (جاہلانہ) امنگیں ہیں۔ (اے پیغمبر) ان سے کہہ دو: اگر تم (اس زعم باطل میں) سچے ہو تو بتاؤ تمہاری دلیل کیا ہے؟ ہاں! (بلاشبہ نجات کی راہ کھلی ہوئی ہے، مگر وہ کسی خاص گروہ بندی کی راہ نہیں ہو سکتی، وہ تو ایمان و عمل کی راہ ہے) جس کسی نے بھی خدا کے آگے سر جھکا دیا اور وہ نیک عمل بھی ہوا تو (خواہ وہ یہودی اور نصرانی ہو، خواہ کوئی ہو) وہ اپنے پروردگار سے اپنا اجر پائے گا، اس کیلئے نہ تو کسی طرح کا کھٹکا ہے، نہ کسی طرح کی غمگینی۔

دوسری جگہ یہی حقیقت زیادہ واضح لفظوں میں بیان کی گئی ہے۔:

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْاوَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰى وَالصّٰبِئِيْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَO (۲:۶۲)

جو لوگ (پیغمبر اسلام پر) ایمان لائے ہیں، وہ ہوں یا وہ لوگ ہوں جو یہودی کہلاتے ہیں یا نصاریٰ اور صابی ہوں (کوئی بھی ہو) لیکن جو کوئی بھی اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لایا اور اس کے کام بھی اچھے ہوئے تو وہ اپنے ایمان و عمل کا اجر اپنے پروردگار سے ضرور پائے گا۔ اس کیلئے نہ تو کسی طرح کا کھٹکا ہے، نہ کسی طرح کی غمگینی۔

یعنی دین سے مقصود تو خدا پرستی اور نیک عملی کی راہ تھی، وہ کسی خاص حلقہ بندی کا نام نہ تھا۔ کوئی انسان ہو، کسی نسل و قوم سے ہو، کسی نام سے پکارا جاتا ہو، لیکن اگر خدا پر سچا ایمان

رکھتا ہے اور اس کے اعمال بھی نیک ہیں تو دین الٰہی پر چلنے والا ہے اور اس کیلئے نجات ہے۔ لیکن یہودیوں اور عیسائیوں نے ایک خاص طرح کی نسلی اور جماعتی گروہ بندی کا قانون بنا دیا۔ یہودیوں نے گروہ بندی کا ایک دائرہ کھینچا اور اس کا نام ''یہودیت'' رکھ دیا۔ جو اس دائرے کے اندر ہے وہ سچائی پر ہے اور اس کیلئے نجات ہے، جو اس سے باہر ہے وہ باطل پر ہے اور اس کیلئے نجات نہیں۔

اسی طرح عیسائیوں نے بھی ایک دائرہ کھینچ لیا اور اس کا نام ''مسیحیت'' یا کلیسا رکھ دیا۔ جو اس میں داخل ہے صرف وہی سچائی پر ہے اور صرف اسی کیلئے نجات ہے۔ جو اس سے باہر ہے اس کا سچائی میں کوئی حصہ نہیں اور نجات سے قطعاً محروم۔ باقی رہا عمل واعتقاد تو اس کا قانون یک قلم غیر موثر ہو گیا۔ ایک شخص کتنا ہی خدا پرست اور نیک عمل ہو لیکن اگر ''یہودیت'' کی نسلی گروہ بندی یا ''مسیحیت'' کی جماعتی گروہ بندی میں داخل نہیں تو اسے کوئی یہودی اور عیسائی ہدایت یافتہ انسان تسلیم نہیں کر سکتا۔ لیکن ایک سخت سے سخت بدعمل اور بداعتقاد انسان بھی نجات یافتہ سمجھ لیا جائے گا، اگر ان گروہ بندیوں میں داخل ہو گا۔ قرآن ان کے اسی اعتقاد کو ان لفظوں میں نقل کرتا ہے۔ كُونُوا هُودًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا (۲:۱۳۵) یعنی ہدایت کی راہ اعتقاد اور عمل کی راہ نہیں ہے، بلکہ یہودیت اور نصرانیت کی گروہ بندی کی راہ ہے۔ جب تک کوئی یہودی یا نصرانی نہ ہو جائے، ہدایت یافتہ نہیں ہو سکتا۔ پھر اس کا رد کرتے ہوئے کہتا ہے: خدا کی ہدایت جو دنیا کا عالمگیر قانون ہے، وہ بھلا ان خود ساختہ گروہ بندیوں میں کیونکر محدود ہو جا سکتی ہے؟ بَلٰى مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَ هُوَ مُحْسِنٌ (۲:۱۱۲) کے زور اور عموم پر غور کرو! کوئی انسان ہو، کسی نسل وقوم اور گروہ بندی کا ہو، لیکن جس کسی نے بھی اللہ کے آگے عبودیت کا سر جھکا دیا اور نیک عملی کی زندگی اختیار کی، اس نے دین کی نجات وسعادت پا لی اور اس کیلئے کوئی غم اور کھٹکا نہیں۔

غور کرو! مذہبی صداقت کی عالمگیر وسعت کا اس سے زیادہ واضح اور ہمہ گیر اعلان اور کیا ہو سکتا ہے۔

وَقَالَتِ الْیَهُوْدُ لَیْسَتِ النَّصٰرٰی عَلٰی شَیْءٍ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰی لَیْسَتِ الْیَهُوْدُ عَلٰی شَیْءٍ وَّهُمْ یَتْلُوْنَ الْکِتٰبَ ؕ کَذٰلِکَ قَالَ الَّذِیْنَ لَایَعْلَمُوْنَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ فَاللّٰهُ یَحْکُمُ بَیْنَهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ فِیْمَا کَانُوْا فِیْهِ یَخْتَلِفُوْنَ ۝ (۲:۱۱۳)

اور یہودیوں نے کہا: عیسائیوں کا دین کچھ نہیں ہے۔ اسی طرح عیسائیوں نے کہا: یہودیوں کے پاس کیا دھرا ہے؟ حالانکہ دونوں (اللہ کی) کتاب پڑھتے ہیں (اور دونوں کا سرچشمہ دین ایک ہی ہے) ٹھیک ایسی ہی بات ان لوگوں نے بھی کہی جو (مقدس نوشتوں کا) علم نہیں رکھتے (یعنی مشرکین عرب نے کہ وہ بھی صرف اپنے ہی کو نجات کا وارث سمجھتے ہیں) اچھا! جس بات میں باہم دگر جھگڑ رہے ہیں، قیامت کے دن اللہ اس کا فیصلہ کردے گا (اور اس وقت حقیقت حال سب پر کھل جائے گی)

یعنی باوجودیکہ خدا کا دین ایک ہی ہے اور کتاب الٰہی یعنی تورات دونوں کے سامنے ہے، بایں ہمہ مذہبی گروہ بندی کا نتیجہ یہ ہے کہ باہم دگر مخالف اور مکذب جتھے قائم ہو گئے ہیں ہر جتھا دوسرے کو جھٹلاتا ہے اور ہر جتھا صرف اپنے ہی کو نجات و سعادت کا مالک سمجھتا ہے۔

سچائی اصلاً سب کے پاس مگر عملاً سب نے کھودی ہے

سوال یہ ہے کہ جب دین کی راہ ایک ہونے کی جگہ بے شمار جتھوں اور ٹولیوں میں بٹ گئی اور ہر جتھا ایک ہی طریقے پر اپنی سچائی کا مدعی ہے اور ایک ہی طریقے پر دوسروں کو جھٹلا رہا ہے تو اب اس بات کا فیصلہ کیونکر ہو کہ فی الحقیقت سچائی ہے کہاں؟ قرآن کہتا ہے: سچائی اصلاً سب کے پاس ہے، مگر عملاً سب نے کھودی ہے۔ سب کو ایک ہی دین کی تعلیم دی گئی تھی اور سب کیلئے ایک ہی عالم گیر قانون ہدایت تھا۔ لیکن سب نے اصل حقیقت ضائع کردی اور ''الدین'' پر قائم رہنے کی جگہ الگ الگ گروہ بندیاں کرلیں۔ اب ہر گروہ دوسرے گروہ سے لڑ رہا ہے اور سمجھتا ہے دین کی سعادت اور نجات صرف اُنہی کے ورثے میں آئی ہے،

دوسروں کا اس میں کوئی حصہ نہیں۔

عبادت گاہوں میں تفرقہ

سورہ بقرہ میں مندرجہ صدر آیت کے بعد ہی حسب ذیل بیان شروع ہو جاتا ہے:

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَآ اِلَّا خَآئِفِيْنَ ؕ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝ (۱۱۴:۲)

اور غور کرو! اس سے بڑھ کر ظلم کرنے والا انسان کون ہو سکتا ہے جو اللہ کی عبادت گاہوں میں اس کے نام کی یاد سے مانع آئے اور ان کی ویرانی میں کوشاں ہو؟ جن لوگوں کے ظلم و شرارت کا یہ حال ہے، یقیناً وہ اس لائق نہیں کہ خدا کی عبادت گاہوں میں قدم رکھیں بجز اس حالت کے کہ (دوسروں کو اپنی طاقت سے ڈرانے کی جگہ خود دوسروں کی طاقت سے) ڈرے سہمے ہوئے ہوں۔ یاد رکھو! ایسے لوگوں کیلئے دنیا میں بھی رسوائی ہے اور آخرت میں بھی سخت ترین عذاب۔

یعنی مذہبی گروہ بندی کی گمراہی کا نتیجہ یہ ہے کہ خدا کی عبادت گاہیں تک الگ الگ ہو گئی ہیں اور باوجودیکہ تمام پیروان مذہب ایک ہی خدا کے نام لیوا ہیں، لیکن ممکن نہیں ایک مذہب کا پیرو دوسرے مذہب کی بنائی ہوئی عبادت گاہ میں جا کر خدا کا نام لے سکے۔ اتنا ہی نہیں، بلکہ ہر گروہ صرف اپنی عبادت گاہ کو خدا کی عبادت گاہ سمجھتا ہے، دوسرے گروہ کی عبادت گاہ اس کی نظروں میں کوئی احترام نہیں رکھتی، حتیٰ کہ بسا اوقات وہ مذہب کے نام پر اٹھتا ہے اور دوسروں کی عبادت گاہیں منہدم کر ڈالتا ہے۔ قرآن کہتا ہے: اس سے بڑھ کر انسان کا ظلم اور کیا ہو سکتا ہے کہ خدا کے بندوں کو خدا کی یاد سے روکا جائے اور صرف اس لئے روکا جائے کہ وہ ایک دوسرے مذہبی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں یا ایک عبادت گاہ ڈھا دی جائے اور اس لئے ڈھا دی جائے کہ وہ ہماری بنائی ہوئی نہیں ہے، دوسرے گروہ کی بنائی ہوئی ہے۔ کیا تمہارے بنائے ہوئے مذہبی جتھوں کے اختلاف سے خدا بھی مختلف ہو گئے؟

اور اس لئے ایک جتھے کی بنائی ہوئی عبادت گاہ تو خدا کی عبادت گاہ ہوئی، مگر دوسرے کی بنائی ہوئی عبادت گاہ خدا کی عبادت گاہ نہیں:

وَلَا تُؤْمِنُوٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ ۭ قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ ۙ اَنْ يُّؤْتٰٓى اَحَدٌ مِّثْلَ مَآ اُوْتِيْتُمْ اَوْ يُحَاۗجُّوْكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ ۭ قُلْ اِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ ۚ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ (۳:۷۳)

اور (یہ لوگ آپس میں ایک دوسرے سے کہتے ہیں) یہ بات کبھی نہ مانو کہ دین کی جو سعادت تمہیں دی گئی ہے (یعنی یہودیوں کو دی گئی ہے) ویسی اب کسی دوسرے انسان کو مل سکے یا اللہ کے حضور تمہارے خلاف کسی کی کوئی حجت چل سکے۔ (اے پیغمبر!) ان لوگوں سے کہہ دو: ہدایت تو وہی ہے جو اللہ کی ہدایت ہے (اور اس کی راہ سب کیلئے کھلی ہوئی ہے) اور فضل اور بخشش کا سررشتہ تمہارے ہاتھ نہیں ہے، اللہ کے ہاتھ ہے۔ جسے چاہے دے دے۔ وہ (اپنے فضل میں) بڑی وسعت رکھنے والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔

یعنی یہودیوں کا اعتقاد یہ ہے کہ وحی ونبوت کی ہدایت جو انہیں دی گئی ہے، وہ صرف انہیں کیلئے ہے، ممکن نہیں کسی دوسرے انسان یا قوم کو یہ بات حاصل ہو سکے۔ چنانچہ اسی بنا پر وہ کہتے ہیں: اپنے مذہب کے آدمیوں کے علاوہ اور کسی آدمی کی سچائی اور بزرگی تسلیم نہ کرو اور نہ یہ بات مانو کہ تمہارے خلاف (یعنی یہودیوں کے خلاف) کسی آدمی کی کوئی دلیل خدا کے حضور مقبول ہو سکتی ہے۔ قرآن اس زعم باطل کو رد کرتا ہے اور کہتا ہے "اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ" ہدایت کی راہ تو وہی ہے جو اللہ کی ہدایت ہے اور اللہ کا فضل کسی ایک انسان یا گروہ ہی کیلئے نہیں ہے، سب کیلئے ہے۔ پس جو انسان بھی ہدایت کی راہ پر چلے گا، ہدایت یافتہ ہوگا، خواہ یہودی ہو یا کوئی ہو۔

یہودی اپنے آپ کو نجات یافتہ امت سمجھتے تھے اور کہتے تھے دوزخ کی آگ ہم پر حرام کردی گئی ہے

یہودیوں کی گروہ بندی کا غرور یہاں تک بڑھ گیا تھا کہ وہ کہتے تھے: خدا نے دوزخ کی آگ ہم پر حرام کردی ہے۔ اگر ہم میں سے کوئی آدمی جہنم میں ڈالا بھی جائے گا تو اس لئے

نہیں کہ اسے عذاب میں ڈالا جائے، بلکہ اس لئے کہ گناہ کے داغ دھبوں سے پاک وصاف کر دیا جائے اور پھر جنت میں جا داخل ہو۔ قرآن ان کا یہ زعم باطل جابجا نقل کرتا ہے اور پھر اس کا رد کرتے ہوئے پوچھتا ہے: یہ بات تمہیں کہاں سے معلوم ہوگئی کہ یہودی گروہ بندی کا ہر فرد نجات یافتہ ہے اور عذاب اخروی سے اسے چھٹکارا مل چکا ہے؟ کیا تمہیں خدا نے غیر مشروط نجات کا کوئی پٹا لکھ کر دے دیا ہے کہ جہاں ایک انسان یہودی ہوا اور آتش دوزخ اس پر حرام ہوگئی؟ اگر نہیں دیا ہے تو پھر بتاؤ ایسا اعتقاد رکھنا خدا پر افترا نہیں ہے تو اور کیا ہے؟ اس کے بعد صاف صاف لفظوں میں خدا کے قانون عمل کا اعلان کرتا ہے۔ ''جس کسی نے بھی اپنے عمل سے برائی کمائی، اس کیلئے برائی ہے۔ جس کسی نے بھی بھلائی کمائی، اس کیلئے بھلائی ہے''۔ یعنی جس طرح سنکھیا کھانے سے ہر کھانے والا ہلاک ہو جاتا ہے، خواہ یہودی ہو یا غیر یہودی، اور دودھ پینے سے صحت و توانائی ملتی ہے، خواہ پینے والا کسی نسل و قوم اور گروہ سے تعلق رکھتا ہو، اسی طرح عالم معنویات میں بھی ہر عمل کا ایک خاصہ ہے اور وہ اس لئے بدلا نہیں جا سکتا کہ عمل کرنے والے کی نسل یا گروہ بندی کیا ہے۔ چنانچہ سورہ بقرہ میں ہے۔

وَقَالُوا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ؕ قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗٓ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓئَتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ (۲:۸۰-۸۲)

اور ان لوگوں نے (یعنی یہودیوں نے) کہا: ہمیں جہنم کی آگ کبھی چھونے والی نہیں، اور اگر چھوئے بھی تو اس سے زیادہ نہیں کہ چند دنوں کیلئے چھوئے۔ (اے پیغمبر!) ان سے کہو: یہ جو تم کہتے ہو تو کیا تم نے خدا سے کوئی قول و قرار کرا لیا ہے ور اب وہ اپنے قول و قرار سے پھر نہیں سکتا، یا پھر تم خدا کے نام سے ایک ایسی (جھوٹی) بات کہہ رہے ہو جس کا تمہیں کوئی علم نہیں۔

نہیں! (خدا کا قانون تو یہ ہے کہ کسی نسل اور کسی گروہ کا انسان ہو، لیکن) جس کسی نے بھی برائی کمائی اور اپنے گناہوں میں گھر گیا تو وہ دوزخی گروہ میں سے ہے، ہمیشہ دوزخ میں رہنے والا۔ اور جس کسی نے بھی ایمان کی راہ اختیار کی اور نیک عمل ہوا تو وہ بہشتی گروہ میں سے ہے، ہمیشہ بہشت میں رہنے والا۔

قانون نجات کا اعلان عام

سورہ نساء میں نہ صرف یہودیوں اور عیسائیوں کو بلکہ سب کو مخاطب کر کے صاف صاف اعلان کر دیا ہے، ایسا اعلان جس کے بعد کسی طرح کے شک وشبہ کی گنجائش باقی نہیں رہی۔

لَيْسَ بِأَمَانِيِّكُمْ وَلَآ أَمَانِيِّ أَهْلِ الْكِتٰبِ ۗ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ وَلَا يَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ۝ (۴:۱۲۳)

(مسلمانو! یاد رکھو نجات اور سعادت) نہ تو تمہاری آرزوؤں پر موقوف ہے نہ اہل کتاب کی آرزوؤں پر (خدا کا قانون تو یہ ہے کہ) جو کوئی بھی برائی کرے گا اس کا نتیجہ اس کے سامنے آئے گا اور پھر نہ تو کسی کی دوستی بچا سکے گی نہ کسی طاقت کی مددگاری۔

یہودی سمجھتے تھے غیر مذہب والوں کے ساتھ معاملت میں دیانت داری ضروری نہیں، قرآن کا اس پر انکار

اس مذہبی گروہ بندی کا نتیجہ تھا کہ یہودی سمجھتے تھے سچائی اور دیانت داری کے جس قدر بھی احکام ہیں وہ اس لئے نہیں ہیں کہ تمام انسانوں کے ساتھ عمل میں لائے جائیں، بلکہ محض اس لئے ہیں کہ ایک یہودی دوسرے یہودی کیساتھ بددیانتی نہ کرے۔ وہ کہتے تھے: اگر ایک آدمی ہمارا ہم مذہب نہیں ہے تو ہمارے لئے جائز ہے کہ جس طرح بھی چاہیں اس کا مال کھا لیں، کچھ ضروری نہیں کہ راست بازی و دیانت کے اصول ملحوظ رکھے جائیں۔ چنانچہ لین دین میں سود لینے کی ممانعت کو انہوں نے صرف اپنے ہم مذہبوں کے ساتھ مخصوص کر دیا تھا اور آج تک ان کا طرز عمل یہی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک یہودی کو دوسرے یہودی سے ظالمانہ سود نہیں لینا چاہئے۔ لیکن ایک یہودی غیر یہودی سے لے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ قرآن ان کے

اس عقیدے کا ذکر کرتا اور اسے ان کی بہت بڑی گمراہی قرار دیتا ہے۔

وَاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَ قَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَاَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ. (۱۶۱:۴)

اور ان کا سود کھانا، حالانکہ وہ اس سے روک دیئے گئے تھے، اور ان کی یہ بات کہ لوگوں کا مال ناجائز طریقے سے کھا لیتے تھے۔

اسی طرح جو یہودی عرب میں آباد تھے وہ کہتے تھے: عرب کے ان پڑھ باشندوں کے ساتھ معاملہ کرنے میں راست بازی و دیانت داری کچھ ضروری نہیں۔ یہ لوگ بت پرست ہیں ہم ان لوگوں کا مال جس طرح بھی کھالیں ہمارے لئے جائز ہے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ وَ يَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ o بَلٰى مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰى فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ o (۳:۷۵-۷۶)

(یہودیوں کی) یہ (بدمعاملگی) اس لئے ہے کہ وہ کہتے ہیں (عرب کے) ان پڑھ لوگوں سے (بدمعاملگی کرنے میں) ہم سے کوئی باز پرس نہیں ہوگی، (جس طرح بھی ہم چاہیں ان کا مال کھا سکتے ہیں، حالانکہ) ایسا کہتے ہوئے وہ صریح اللہ پر افترا کرتے ہیں۔

ہاں! (ان سے باز پرس ہو اور ضرور ہو، کیونکہ اللہ کا قانون تو یہ ہے کہ) جو کوئی اپنا قول و قرار سچائی کے ساتھ پورا کرتا ہے اور برائی سے بچتا ہے تو وہی اللہ کی خوشنودی حاصل کرتا ہے۔ اور اللہ برائی سے بچنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

یعنی ایسا عقیدہ رکھنا خدا کے دین پر صریح افتراء ہے۔ خدا کا دین تو یہ ہے کہ ہر انسان کے ساتھ نیکی کرنی چاہئے اور ہر حال میں راست بازی و دیانت داری کی راہ چلنی چاہئے، خواہ کوئی انسان ہو اور کسی عقیدے اور گروہ کا ہو، کیونکہ سفید ہر حال میں سفید ہے اور سیاہ ہر حال میں سیاہ۔ کوئی سفید چیز اس لئے کالی نہیں ہوسکتی کہ کس آدمی کو دی گئی ہے۔ اور کوئی کالی چیز اس لئے سفید نہیں ہوسکتی کہ کس نسل اور کس گروہ کے ہاتھوں نکلی ہے۔ پس دیانت داری

ہر حال میں دیانت داری ہے اور بددیانتی ہر حال میں بددیانتی۔

حضرت ابراہیم کی شخصیت سے استشہاد

نزول قرآن کے وقت بڑے مذہبی گروہ عرب میں تین تھے۔ یہودی، عیسائی اور مشرکین عرب۔ اور یہ تینوں حضرت ابراہیمؑ کی شخصیت کو یکساں طور پر عزت واحترام کی نظر سے دیکھتے تھے۔ کیونکہ تینوں گروہوں کے مورث اعلیٰ وہی تھے۔ پس قرآن مذہبی گروہ بندی کی گمراہی واضح کرنے کیلئے ایک نہایت سیدھا سادہ سوال ان تینوں کے آگے پیش کرتا ہے۔ اگر دین کی سچائی گروہ بندیوں کے ساتھ وابستہ ہے تو بتاؤ حضرت ابراہیم کس گروہ بندی کے آدمی تھے؟ یہ ظاہر ہے کہ اس وقت تک نہ تو یہودیت کا ظہور ہوا تھا، نہ مسیحیت کا اور نہ کوئی دوسری گروہ بندی ہی موجود تھی۔ پھر اگر ابراہیم کسی گروہ بندی میں داخل نہ ہونے پر بھی دین حق کی راہ پر تھے تو بتاؤ وہ راہ کون سی تھی؟ قرآن کہتا ہے: وہ اسی دین حقیقی کی راہ تھی جو تمہاری تمام بنائی ہوئی گروہ بندیوں سے بالاتر اور نوع انسانی کیلئے عالم گیر قانون نجات ہے، یعنی خدا کی مواحدانہ پرستش اور نیک عملی کی زندگی۔

وَقَالُوا كُونُوا هُودًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا ؕ قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ○ (۱۳۵:۲)

اور یہودی کہتے ہیں: یہودی ہو جاؤ، ہدایت پاؤ گے۔ نصاریٰ کہتے ہیں، نصرانی ہو جاؤ، ہدایت پاؤ گے۔ (اے پیغمبر) تم کہو: نہیں! (اللہ کی عالمگیر ہدایت تمہاری ان گروہ بندیوں کی پابند نہیں ہوسکتی) ہدایت کی راہ تو وہی حنفی راہ ہے جو ابراہیم کا طریقہ تھا اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھا۔

سورہ آل عمران میں یہی مضمون زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔

يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمَآ اُنْزِلَتِ التَّوْرٰىةُ وَالْاِنْجِيْلُ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ○ (۶۵:۳)

اے اہل کتاب! تم ابراہیم کے بارے میں کیوں حجت کرتے ہو، حالانکہ یہ بات

بالکل ظاہر ہے کہ تورات اور انجیل نازل نہیں ہوئیں مگر اس کے بعد۔ پھر کیا اتنی صاف بات سمجھ نہیں سکتے؟

یعنی وہ یہودیوں اور عیسائیوں سے سوال کرتا ہے: تمہاری ان گروہ بندیوں کی تاریخ زیادہ سے زیادہ تورات اور انجیل کے ظہور تک جا سکتی ہے، کیونکہ انہیں کی نسبت سے گروہ بندیوں کے حلقے کھینچے گئے ہیں۔ اچھا! بتاؤ تورات سے پہلے بھی ہدایت یافتہ انسان موجود تھے یا نہیں؟ اگر تھے تو ان کی راہ کیا تھی؟ خود تمہارے اسرائیلی گھرانے کے تمام نبیوں کی راہ کیا تھی؟ حضرت ابراہیم نے اپنے بیٹوں اور پوتوں کو جس دین کی تلقین کی وہ دین کون سا تھا؟ حضرت یعقوب جب بستر مرگ پر تھے اور اپنے بیٹوں کو دین الٰہی پر قائم رہنے کی وصیت کر رہے تھے تو اس دین سے مقصود کون سا دین تھا؟ یہ تو ظاہر ہے کہ وہ یہودیت یا مسیحیت کی گروہ بندی نہیں ہو سکتی، کیونکہ یہ دونوں گروہ بندیاں حضرت موسیٰ اور حضرت مسیح کے نام پر کی گئی ہیں اور وہ حضرت ابراہیم اور حضرت یعقوب وغیرہم سے کئی سو برس بعد پیدا ہوئے۔ پس معلوم ہوا تمہارے ان خود ساختہ حلقہ ہائے نجات سے بھی کوئی بالاتر راہ نجات موجود ہے جو اس وقت بھی نوع انسانی کے سامنے موجود تھی جب ان حلقہ بندیوں کا نام ونشان تک نہ تھا۔ قرآن کہتا ہے یہی راہ نجات دین کی اصلی راہ ہے اور اسے حاصل کرنے کیلئے کسی گروہ بندی کی نہیں، بلکہ اعتقاد اور عمل کی ضرورت ہے۔

اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ اِذْقَالَ لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِیْ ؕ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚۖ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ○ (۲:۱۳۳)

پھر کیا تم اس وقت موجود تھے جب یعقوب کے سرہانے موت آ کھڑی ہوئی تھی اور اس نے اپنی اولاد سے پوچھا تھا: بتاؤ میرے بعد کس کی عبادت کرو گے؟ انہوں نے جواب میں کہا تھا: اس ایک خدا کی عبادت کریں گے جس کی تو نے عبادت کی ہے اور تیرے بزرگوں ابراہیم، اسماعیل اور اسحاق نے کی ہے، اور ہم خدا کے

حکموں کے فرماں بردار ہیں۔

اصل دین وحدت واخوت ہے نہ کہ تفرقہ ومنافرت

وہ کہتا ہے: دین الٰہی کی اصل نوع انسانی کی اخوت ووحدت ہے نہ کہ تفرقہ و منافرت۔ خدا کے جتنے رسول بھی دنیا میں آئے، سب نے یہی تعلیم دی تھی کہ تم سب اصلاً ایک ہی امت ہو اور تم سب کا پروردگار ایک ہی پروردگار ہے۔ پس چاہئے کہ سب اسی ایک پروردگار کی بندگی کریں اور ایک گھرانے کے بھائیوں کی طرح مل جل کر رہیں۔ اگرچہ ہر مذہب کے داعی نے اسی راہ کی تعلیم دی، لیکن ہر مذہب کے پیروؤں نے اس سے انحراف کیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہر ملک، ہر قوم، ہر نسل نے اپنے اپنے جتھے الگ بنا لئے اور ہر جتھا اپنے طور طریقے میں مگن ہو گیا۔

قرآن نے پچھلے رسولوں اور مذہب کے بانیوں میں سے جن جن رہنماؤں کے مواعظ نقل کئے ہیں ان سب میں بھی اصل اصول یہی حقیقت ہے اور عموماً اکثر مواعظ کا خاتمہ دین کی وحدت اور انسان کی عالمگیر اخوت کی تعلیم پر ہی ہوتا ہے۔ مثلاً سورہ مومنون میں سب سے پہلے حضرت نوحؑ کی دعوت کا ذکر کیا ہے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰی قَوْمِهٖ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ (۲۳:۲۳)

اس کے بعد ان دعوتوں کی طرف اشارہ کیا ہے جو حضرت نوح کے بعد ہوتی رہیں۔

ثُمَّ اَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِيْنَ ۝ فَاَرْسَلْنَا فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ (۲۳:۳۱-۳۲)

پھر حضرت موسیٰؑ کا ذکر کیا ہے۔

ثُمَّ اَرْسَلْنَا مُوْسٰی وَاَخَاهُ هٰرُوْنَ ۝ (۲۳:۴۵)

حضرت موسیٰؑ کے بعد حضرت مسیحؑ کی دعوت نمایاں ہوئی۔

وَجَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗۤ اٰيَةً (۲۳:۵۰)

پھر ان تمام دعوتوں کے بعد صدائے حق بلند ہوتی ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ۭ اِنِّىْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ۝ وَاِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ ۝ فَتَقَطَّعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ زُبُرًا ۭ كُلُّ حِزْبٍۢ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ۝ (۲۳:۵۱-۵۳)

(اور) ہم نے تمام رسولوں کی یہی حکم دیا تھا کہ پاک وصاف چیزیں کھاؤ اور نیک عملی کی زندگی بسر کرو۔ تم جو کچھ کرتے ہو اس سے میں بے خبر نہیں ہوں۔ اور (دیکھو!) یہ تمہاری قوم دراصل ایک ہی قوم ہے اور میں تم سب کا پروردگار ہوں، پس نافرمانی سے بچو۔ لیکن پھر ایسا ہوا کہ لوگوں نے ایک دوسرے سے کٹ کر جدا جدا دین بنا لیے۔ ہر ٹولی کے پلے جو کچھ پڑ گیا ہے اسی میں مگن ہے۔

یعنی تمام رسولوں نے یکے بعد دیگرے یہی تعلیم دی تھی کہ خدا کی بندگی کرو اور نیک عملی کی زندگی اختیار کرو۔ تم سب خدا کے نزدیک ایک ہی امت ہو اور تم سب کا پروردگار ایک ہی پروردگار ہے۔ تم میں سے کوئی گروہ دوسرے گروہ کو اپنے سے الگ نہ سمجھے، نہ کوئی گروہ دوسرے گروہ کا مخالف ہو جائے۔ "فَتَقَطَّعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ زُبُرًا" لیکن لوگوں نے یہ تعلیم فراموش کر دی اور اپنی الگ الگ ٹولیاں بنا لیں۔ "كُلُّ حِزْبٍۢ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ۝" اب ہر ٹولی اسی میں مگن ہے جو اس کے پلے پڑ گیا۔

رسم اصطباغ

مذہبی گروہ بندی کی رسموں میں سے ایک رسم وہ ہے جو عیسائی کلیسا نے اختیار کر رکھی ہے اور جسے وہ اصطباغ (بپتسما) سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ دراصل ایک یہودی رسم تھی جو اس وقت ادا کی جاتی تھی جب لوگ گناہوں سے توبہ کیا کرتے تھے اور اس لئے فی نفسہ ایک مقررہ رسم سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ لیکن عیسائیوں نے اسے انسانی نجات وسعادت کی بنیاد سمجھ لیا ہے۔ جب تک ایک شخص مسیح علیہ السلام کے نام پر اصطباغ نہ لے وہ نجات یافتہ

انسان نہیں سمجھا جاتا۔ قرآن کہتا ہے: یہ کیسی گمراہی ہے کہ انسانی نجات وسعادت جس کا دار ومدار عمل واعتقاد پر ہے، محض ایک مقررہ رسم کے ساتھ وابستہ کر دی جائے! انسانوں کا یہ ٹھہرایا ہوا اصطباغ اللہ کا اصطباغ نہیں ہے، اللہ کا اصطباغ تو یہ ہے کہ تمہارے دل خدا پرستی کے رنگ میں رنگ جائیں۔

صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ٥

(۲:۱۳۸)

یہ اللہ کا رنگ ہے (یعنی دینِ الٰہی کا قدرتی اصطباغ ہے) اور اللہ سے بہتر رنگ دینے میں اور کون ہو سکتا ہے؟ ہم تو اسی کی بندگی کرنے والے ہیں۔

قانون عمل

اسی طرح سورہ بقرہ میں بار بار کہتا ہے: دینِ الٰہی عمل کا قانون ہے اور ہر انسان کیلئے وہی ہوتا ہے جو اس کے عمل کی کمائی ہے۔ یہ بات کہ ایک گروہ میں بہت سے نبی اور برگزیدہ انسان ہو چکے ہیں یا نیک انسانوں کی نسل میں سے ہے یا کسی پچھلی قوم سے رشتہ قدامت رکھتا ہے نجات وسعادت کیلئے کچھ سودمند نہیں۔

تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ٥ (۲:۱۳۴)

قرآن کی دعوت

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کوئی بات بھی قرآن کے صفحوں پر اس درجہ نمایاں نہیں ہے جس قدر یہ بات ہے۔ اس نے بار بار صاف اور قطعی لفظوں میں اس حقیقت کا اعلان کر دیا ہے کہ وہ کسی نئی مذہبی گروہ بندی کی دعوت لے کر نہیں آیا ہے، بلکہ چاہتا ہے تمام مذہبی گروہ بندیوں کی جنگ و نزاع سے دنیا کو نجات دلا دے اور سب کو اسی ایک راہ پر جمع کر دے جو سب کی مشترک اور متفقہ راہ ہے۔

وہ بار بار کہتا ہے: جس راہ کی میں دعوت ہوں وہ کوئی نئی راہ نہیں ہے اور نہ سچائی کی راہ نئی ہو سکتی ہے۔ یہ وہی راہ ہے جو اول روز سے موجود ہے اور تمام مذاہب کے داعیوں نے اسی کی طرف بلایا ہے۔

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَ مُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ. (۴۲:۱۳)

اور (دیکھو!) اس نے تمہارے لئے دین کی وہی راہ ٹھہرائی ہے جس کی وصیت نوح کو کی گئی تھی اور جس پر چلنے کا ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو حکم دیا تھا۔ (ان سب کی تعلیم یہی تھی) کہ الدین (یعنی خدا کا ایک ہی دین) قائم رکھو اور اس راہ میں الگ الگ نہ ہو جاؤ۔

سورہ نساء میں ہے

اِنَّآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ كَمَآ اَوْحَيْنَآ اِلٰى نُوْحٍ وَّالنَّبِيّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَ

سْبَاطِ وَعِيسٰى وَاَيُّوبَ وَيُونُسَ وَهٰرُونَ وَ سُلَيْمٰنَ وَ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ. (۴:۱۶۳-۱۶۴)

(اے پیغمبر!) ہم نے تمہیں اسی طرح اپنی وحی سے مخاطب کیا ہے جس طرح نوح کو کیا تھا اور ان تمام نبیوں کو کیا تھا جو نوح کے بعد ہوئے۔ نیز جس طرح ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب، عیسیٰ، ایوب، یونس، ہارون، سلیمان (وغیرہم) کو مخاطب کیا اور داؤد کو زبور عطا کی۔ علاوہ بریں وہ رسول جن میں سے بعض کا حال ہم تمہیں پہلے سنا چکے ہیں اور بعض ایسے ہیں جن کا حال تمہیں نہیں سنایا۔

سورہ انعام میں پچھلے رسولوں کا ذکر کر کے پیغمبر اسلام کو مخاطب کیا ہے اور کہا ہے:

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ. (۶:۹۰)

یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ نے راہ حق دکھائی، پس (اے پیغمبر!) تم بھی انہیں کی ہدایت کی پیروی کرو۔

سب کی یکساں تصدیق اور سب کے متفقہ دین کی پیروی اس کی دعوت کا اصل اصول ہے

اسی لئے اس کی دعوت کی پہلی بنیاد ہی یہ ہے کہ تمام بانیان مذاہب کی یکساں طور پر تصدیق کی جائے، یعنی یقین کیا جائے کہ سب حق پر تھے، سب خدا کی سچائی کے پیغامبر تھے، سب نے ایک ہی اصل و قانون کی تعلیم دی اور سب کی اس متفقہ تعلیم پر کار بند ہونا ہی ہدایت و سعادت کی تنہا راہ ہے۔

قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَالنَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ○ (۳:۸۴)

(اے پیغمبر!) کہہ دو: ہمارا طریقہ تو یہ ہے کہ ہم اللہ پر ایمان لائے ہیں اور جو کچھ اس

نے ہم پر نازل کیا ہے اس پر ایمان لائے ہیں۔ نیز جو کچھ ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور اولاد یعقوب پر نازل ہوا ہے، ان سب پر ایمان رکھتے ہیں۔ اسی طرح جو کچھ موسیٰ اور عیسیٰ کو اور دنیا کے تمام نبیوں کو ان کے پروردگار سے دیا گیا ہے، سب پر ہمارا ایمان ہے۔ ہم ان میں سے کسی ایک کو بھی دوسرے سے جدا نہیں کرتے (کہ اسے نہ مانیں، دوسروں کو مانیں، ہم سب کی یکساں طور پر تصدیق کرتے ہیں) اور ہم اللہ کے فرماں بردار ہیں (اس کی سچائی جہاں کہیں بھی اور جس کسی کی زبانی بھی آئی ہو، اس پر ہمارا ایمان ہے)

تفریق بین الرسل

قرآن نے اس آیت میں اور نیز متعدد موقعوں پر ''تفریق بین الرسل'' کو ایک بہت بڑی گمراہی قرار دیا ہے۔ اور سچائی کی راہ یہ بتلائی ہے کہ ''تفریق بین الرسل'' سے انکار کیا جائے۔ ''تفریق بین الرسل'' کے معنی یہ ہیں کہ خدا کے رسولوں میں باعتبار تصدیق تفرقہ و امتیاز کرنا۔ یعنی ایسا سمجھنا کہ ان میں سے فلاں سچا تھا، فلاں سچا نہ تھا یا کسی ایک کی تصدیق کرنی، باقی سب سے انکار کر دینا۔ یا سب کی تصدیق کرنی، کسی ایک سے انکار دینا۔ قرآن کہتا ہے: ہر راست باز انسان کا جو خدا کے سچے دین پر چلنا چاہتا ہے، فرض ہے کہ بلا کسی امتیاز کے تمام رسولوں، تمام کتابوں، تمام مذہبی دعوتوں پر ایمان لائے اور کسی ایک کا بھی انکار نہ کرے۔ اس کا شیوہ یہ ہونا چاہئے کہ وہ کہے: سچائی جہاں کہیں بھی ظاہر ہوئی ہے اور جس کسی کی زبان پر بھی ظاہر ہوئی ہے، سچائی ہے اور میرا اس پر ایمان ہے۔

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ. كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ۝

(۲:۲۸۵)

اللہ کا رسول اس (کلام حق) پر ایمان رکھتا ہے جو اس کے پروردگار کی طرف سے اس پر

نازل ہوا ہے اور وہ لوگ بھی جو ایمان لائے ہیں یہ سب اللہ پر، اس کے ملائکہ پر، اس کی کتابوں پر، اس کے رسولوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ (ان کے ایمان کا دستور العمل یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں) ہم اللہ کے رسولوں میں سے کسی کو دوسرے سے جدا نہیں کرتے (کہ کسی کو مانیں کسی کو نہ مانیں) انہوں نے کہا: خدایا! ہم نے تیرا پیام سنا اور تیری فرمانبرداری کی۔ ہمیں تیری مغفرت نصیب ہو ہم سب کو بالآخر تیری ہی طرف لوٹنا ہے۔

وہ کہتا ہے: خدا ایک ہے، اس کی سچائی ایک ہے، لیکن سچائی کا پیغام بہت سی زبانوں نے پہنچایا ہے۔ پھر اگر تم کسی ایک پیغامبر کی تصدیق کرتے ہو، دوسروں کا انکار کر دیتے ہو تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ ایک ہی حقیقت کو ایک جگہ مان لیتے ہو، دوسری جگہ ٹھکرا دیتے ہو یا ایک ہی بات کو مانتے بھی ہو، رد بھی کرتے ہو۔ ظاہر ہے کہ ایسا ماننا، ماننا نہیں ہے، بلکہ ایک زیادہ بری قسم کا انکار ہے۔

خدا کی سچائی اس کی عالمگیر بخشش ہے

وہ کہتا ہے: خدا کی سچائی، اس کی ساری باتوں کی طرح، اس کی عالم گیر بخشش ہے۔ وہ نہ تو کسی خاص زمانے سے وابستہ کی جا سکتی ہے، نہ کسی خاص نسل و قوم سے اور نہ کسی خاص مذہبی گروہ بندی سے۔ تم نے اپنے لئے طرح طرح کی قومیتیں اور جغرافیائی اور نسلی حد بندیاں بنالی ہیں، لیکن تم خدا کی سچائی کیلیئے کوئی ایسا امتیاز نہیں گھڑ سکتے اس کی نہ تو کوئی قومیت ہے، نہ نسل ہے، نہ جغرافیائی حد بندی ہے، نہ جماعتی حلقہ بندی۔ وہ خدا کے سورج کی طرح ہر جگہ چمکتی اور نوع انسانی کے ہر فرد کو روشنی بخشتی ہے۔ اگر تم خدا کی سچائی کی ڈھونڈ ھ میں ہو تو اسے کسی ایک ہی گوشے میں نہ ڈھونڈھو۔ وہ ہر جگہ نمودار ہوئی ہے اور ہر عہد میں اپنا ظہور رکھتی ہے۔ تمہیں زمانوں کا، قوموں کا، وطنوں کا، زبانوں کا اور اور طرح طرح کی گروہ بندیوں کا پرستار نہیں ہونا چاہئے۔ صرف خدا کا اور اس کی عالم گیر سچائی کا پرستار ہونا چاہئے۔ اس کی سچائی جہاں کہیں بھی آئی ہو اور جس بھیس میں بھی آئی ہو تمہاری متاع ہے اور تم اس کے وارث ہو۔

راہیں صرف دو ہیں، ایمان کی یہ ہے کہ سب کو مانو، انکار کی یہ ہے کہ سب کا یا کسی ایک کا انکار کر دو

چنانچہ اس نے جابجا ''تفریق بین الرسل'' کی راہ کو انکار کی راہ قرار دیا ہے اور ایمان کی راہ یہ بتائی ہے کہ بلا تفریق سب کی تصدیق کی جائے۔ وہ کہتا ہے: یہاں راہیں صرف دو ہی ہیں، تیسری نہیں ہو سکتی۔ ایمان کی راہ یہ ہے کہ سب کو مانو، انکار کی راہ یہ ہے کہ سب کا یا کسی ایک کا انکار کرو۔ یہاں کسی ایک کا انکار بھی وہی حکم رکھتا ہے جو سب کے انکار کا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّ نَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَّيُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ۝ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا وَ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ۝ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَلَمْ يُفَرِّقُوْا بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ اُولٰٓئِكَ سَوْفَ يُؤْتِيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝ (۴:۱۵۰-۱۵۲)

جو لوگ اللہ اور اس کے پیغمبروں سے برگشتہ ہیں اور چاہتے ہیں اللہ اور اس کے رسولوں میں تفرقہ کریں (یعنی کسی کو خدا کا رسول مانیں، کسی کو نہ مانیں) اور کہتے ہیں: ان میں سے بعض کو ہم مانتے ہیں، بعض کا انکار کرتے ہیں، اور پھر اس طرح چاہتے ہیں کفر اور ایمان کے درمیان کوئی تیسرا راستہ اختیار کرلیں تو یقین کرو یہی لوگ ہیں کہ ان کے کفر میں کوئی شبہ نہیں، اور جن لوگوں کی راہ کفر کی راہ ہے تو ان کیلئے رسوا کن عذاب تیار ہے۔ لیکن ہاں! جو لوگ اللہ اور اس کے تمام پیغمبروں پر ایمان لائے اور کسی ایک پیغمبر کو بھی دوسروں سے جدا نہیں کیا (یعنی کسی ایک کی سچائی سے بھی انکار نہیں کیا) تو بلاشبہ یہی لوگ ہیں جنہیں عنقریب اللہ ان کے اجر عطا فرمائے گا، اور وہ بڑا ہی بخشنے والا مہربان ہے۔

سورہ بقرہ میں جو سورہ فاتحہ کے بعد قرآن کی پہلی سورۃ ہے، سچے مومنوں کی راہ یہ بتلائی ہے۔

وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ○ اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○ (۲:۴-۵)

اور وہ لوگ جو اس سچائی پر ایمان لائے جو پیغمبر اسلام پر نازل ہوئی ہے اور ان تمام سچائیوں پر جو ان سے پہلے نازل ہو چکی ہیں اور نیز آخرت کی زندگی پر بھی یقین رکھتے ہیں سو یہی لوگ ہیں جو اپنے پروردگار کی ٹھہرائی ہوئی ہدایت پر ہیں اور یہی ہیں جنہوں نے فلاح پائی۔

جب سب ایک ہی خدا کے پرستار ہیں اور سب کو اپنے اپنے عمل کے مطابق نتیجہ ملنا ہے تو پھر دین کے نام پر نزاع کیوں ہو

وہ کہتا ہے: اگر تمہیں اس بات سے انکار نہیں کہ تمام کارخانہ ہستی کا خالق ایک ہی خالق ہے اور اس کی پروردگاری یکساں طور پر ہر مخلوق کو پرورش کر رہی ہے تو پھر تمہیں اس بات سے کیوں انکار ہو کہ اس کی روحانی سچائی کا قانون بھی ایک ہی ہے اور ایک ہی طرح پر تمام نوع انسانی کو دیا گیا ہے؟ وہ کہتا ہے: تم سب کا پروردگار ایک ہے، تم سب ایک ہی خدا کے نام لیوا ہو، تم سب کے رہنماؤں نے تمہیں ایک ہی راہ دکھلائی ہے۔ پھر یہ کیسی گمراہی کی انتہا اور عقل کی موت ہے کہ رشتہ ایک ہے، مقصد ایک ہے، راہ ایک ہے، لیکن ہر گروہ دوسرے گروہ کا دشمن ہے۔ اور ہر انسان دوسرے انسان سے متنفر۔ اور پھر یہ تمام جنگ و نزاع کس کے نام پر کی جا رہی ہے؟ اسی خدا کے نام پر اور اسی خدا کے دین کے نام پر جس نے سب کو ایک ہی چوکھٹ پر جھکایا تھا اور سب کو ایک ہی رشتہ اخوت میں جکڑ دیا تھا۔

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ هَلْ تَنْقِمُوْنَ مِنَّآ اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلُ وَاَنَّ اَكْثَرَكُمْ فٰسِقُوْنَ ○ (۵:۵۹)

ان لوگوں سے کہو کہ اے اہل کتاب! تم جو ہماری مخالفت میں کمر بستہ ہو گئے ہو تو بتلاؤ اس کے سوا ہمارا جرم کیا ہے کہ ہم اللہ پر ایمان لائے ہیں اور جو کچھ ہم پر نازل

ہوا ہے اور جو کچھ ہم سے پہلے نازل ہو چکا ہے، سب پر ایمان رکھتے ہیں! (پھر کیا خدا پرستی اور خدا کے تمام رسولوں کی تصدیق تمہارے نزدیک جرم اور عیب ہے؟ افسوس تم پر!) تم میں اکثر ایسے ہی ہیں جو راہ حق سے یکسر برگشتہ ہیں۔

وَاِنَّ اللّٰهَ رَبِّیْ وَ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ ○ (۱۹:۳۶)

(دیکھو!) خدا تو میرا اور تمہارا دونوں کا پروردگار ہے، پس اس کی بندگی کرو، یہی دین کی سیدھی راہ ہے۔

قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِی اللّٰهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ وَلَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ (۲:۱۳۹)

(اے پیغمبر! ان سے) کہو: کیا تم خدا کے بارے میں ہم سے جھگڑا کرتے ہو؟ حالانکہ ہمارا اور تمہارا دونوں کا پروردگار وہی ہے اور ہمارے لئے ہمارے اعمال ہیں، تمہارے لئے تمہارے اعمال (یعنی ہر انسان کو اس کے عمل کے مطابق نتیجہ ملتا ہے، پھر اس بارے میں جھگڑا کیوں ہو؟)

یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ قرآن میں جہاں کہیں اس طرح کے مخاطبات ہیں۔ جیسا کہ آیات مندرجہ صدر میں ہے: "اِنَّ اللّٰهَ رَبِّیْ وَ رَبُّكُمْ" اللہ ہمارا اور تمہارا دونوں کا پروردگار ہے یا "اِلٰهُنَا وَاِلٰهُكُمْ وَاحِدٌ" (۲۹:۴۶) ہمارا اور تمہارا دونوں کا خدا ایک ہی ہے یا "اَتُحَآجُّوْنَنَا فِی اللّٰهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ وَلَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ" کیا تم خدا کے بارے میں ہم سے جھگڑا کرتے ہو؟ حالانکہ وہ ہمارا اور تمہارا دونوں کا پروردگار ہے اور ہمارے لئے ہمارے عمل ہیں، تمہارے لئے تمہارے تو ان تمام مخاطبات سے مقصود اسی حقیقت پر زور دینا ہے، یعنی جب سب کا پروردگار ایک ہے اور ہر انسان کے لئے ویسا ہی نتیجہ ہے جیسا اس کا عمل ہے تو پھر خدا اور مذہب کے نام پر یہ عالمگیر جنگ وجدل کیوں برپا ہے؟ وہ بار بار کہتا ہے: میری تعلیم اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ خدا پرستی اور نیک عملی کی طرف بلاتا ہوں، میں کسی مذہب کو نہیں جھٹلاتا، میں کسی رہنما سے انکار نہیں کرتا۔ "سب کی یکساں

تصدیق''، اور ''سب کی مشترکہ اور متفقہ تعلیم'' میرا دستور العمل ہے۔ پھر میرے خلاف تمام پیروان مذہب نے کیوں اعلان جنگ کر دیا ہے؟

قرآن کا پیروان مذاہب سے مطالبہ

اور یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں اس نے کسی مذہب کے پیرو سے بھی یہ مطالبہ نہیں کیا کہ وہ کوئی نیا دین قبول کر لے، بلکہ ہر گروہ سے یہی مطالبہ کرتا ہے کہ اپنے اپنے مذاہب کی حقیقی تعلیم پر جسے تم نے طرح طرح کی تحریفوں اور اضافوں سے مسخ کر دیا ہے، سچائی کے ساتھ کاربند ہو جاؤ۔ وہ کہتا ہے: اگر تم نے ایسا کر لیا تو میرا کام پورا ہو گیا، کیونکہ جوں ہی تم اپنے مذہب کی تعلیم کی طرف لوٹو گے، تمہارے سامنے وہی حقیقت آ موجود ہو گی جس کی طرف میں تمہیں بلا رہا ہوں۔ میرا پیام کوئی نیا پیام نہیں ہے۔ وہی قدیم اور عالمگیر پیام ہے جو تمام بانیان مذاہب دے چکے ہیں۔

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۭ وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّكُفْرًا ۚ فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالصّٰبِـُٔوْنَ وَالنَّصٰرٰى مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ (۵: ۶۸-۶۹)

(اے پیغمبر! ان لوگوں سے) کہہ دو ''اے اہل کتاب! جب تک تم تورات اور انجیل کی اور ان تمام صحیفوں کی جو تم پر نازل ہوئے ہیں، حقیقت قائم نہ کرو، اس وقت تک تمہارے پاس دین میں سے کچھ بھی نہیں ہے۔ اور (اے پیغمبر!) تمہارے پروردگار کی طرف سے جو کچھ تم پر نازل ہوا ہے (بجائے اس کے کہ یہ لوگ اس سے ہدایت حاصل کریں، تم دیکھو گے کہ) ان میں سے بہتوں کا کفر و طغیان اس کی وجہ سے اور زیادہ بڑھ جائے گا۔ تو جن لوگوں نے انکار حق کی راہ اختیار کر لی ہے تم ان

کی حالت پر بے کار کو غم نہ کھاؤ۔

جو لوگ تم پر ایمان لائے ہیں، جو یہودی ہیں، جو صابی ہیں، جو نصاری ہیں (یہ ہوں یا کوئی ہو) جو کوئی بھی اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان لایا اور اس کے عمل بھی نیک ہوئے تو اس کے لئے نہ تو کسی طرح کا خوف ہے، نہ کسی طرح کی غمگینی۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن نے ان راست باز انسانوں کے ایمان و عمل کا پوری فراخ دلی کے ساتھ اعتراف کیا ہے جو نزول قرآن کے وقت مختلف مذاہب میں موجود تھے اور جنہوں نے اپنے مذہبوں کی حقیقی روح ضائع نہیں کی تھی۔ البتہ وہ کہتا ہے: ایسے لوگوں کی تعداد بہت ہی کم ہے۔ غالب تعداد انہی لوگوں کی ہے جنہوں نے دین الٰہی کی اعتقادی اور عملی حقیقت یک قلم ضائع کر دی ہے۔

لَيْسُوْا سَوَآءً ؕ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ ○ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ○ وَمَا يَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُّكْفَرُوْهُ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِالْمُتَّقِيْنَ ○ (۳:۱۱۳-۱۱۵)

یہ بات نہیں ہے کہ ایک ہی طرح کے ہوں انہیں اہل کتاب میں سے ایسے لوگ بھی ہیں کہ اصل دین پر قائم ہیں، وہ راتوں کو اٹھ اٹھ کر اللہ کے کلام کی تلاوت کرتے ہیں اور ان کے سر اس کے سامنے جھکے ہوتے ہیں۔ اور وہ اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں، نیکی کا حکم دیتے ہیں، برائی سے روکتے ہیں، نیکی کی راہوں میں تیز گام ہیں۔ اور بلاشبہ یہی لوگ ہیں جو نیک انسانوں میں سے ہیں۔ اور (یاد رکھو!) یہ لوگ جو کچھ بھی نیکی کرتے ہیں تو ہرگز ایسا نہیں ہوگا کہ اس کی قدر نہ کی جائے وہ جانتا ہے کہ (کس گروہ میں) کون پرہیزگار ہے۔

مِنْهُمْ اُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ ؕ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ سَآءَ مَا يَعْمَلُوْنَ ○ (۵:۶۶)

ان میں ایک گروہ ایسے لوگوں کا بھی ہے جو میانہ رو ہیں، لیکن بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے کہ جو کچھ کرتے ہیں، برا ہی کرتے ہیں۔

یہ جو قرآن جا بجا اس بات پر زور دیتا ہے کہ وہ پچھلی آسمانی کتابوں کی تصدیق کرنے والا ہے، جھٹلانے والا نہیں، اور اہل کتاب سے بار بار کہتا ہے "وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ (۴۱:۲) اور اس کتاب پر ایمان لاؤ جو تمہاری کتاب کی تصدیق کرتی ہوئی نمایاں ہوئی ہے" تو اس سے مقصود بھی اسی حقیقت پر زور دینا ہے، یعنی جب میری تعلیم تمہارے مقدس نوشتوں کے خلاف کوئی نیا دین نہیں پیش کرتی اور نہ ان سے تمہیں منحرف کرنا چاہتی ہے، بلکہ سرتا سر مصدق اور مؤید ہے تو پھر تم میں اور مجھ میں نزاع کیوں ہے؟ کیوں تم میرے خلاف اعلان جنگ کر دو؟

اصطلاح قرآنی میں "المعروف" اور "المنکر"

اور پھر یہ وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں اس نے نیکی کے لئے "معروف" کا اور برائی کے لئے "منکر" کا لفظ اختیار کیا ہے۔ وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ (۱۷:۳۱) معروف "عرف" سے ہے جس کے معنی پہچاننے کے ہیں، پس "معروف" وہ بات ہوئی جو جانی پہچانی بات ہو۔ "منکر" کے معنی انکار کرنے کے ہیں، یعنی ایسی بات جس سے عام طور سے انکار کیا گیا ہو۔ پس قرآن نے نیکی اور برائی کیلئے یہ الفاظ اس لئے اختیار کیے کہ وہ کہتا ہے: دنیا میں عقائد و افکار کا کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو، لیکن کچھ باتیں ایسی ہیں جن کے اچھے ہونے پر سب کو اتفاق ہے اور کچھ باتیں ایسی ہیں جن کے برے ہونے پر سب متفق ہیں۔ مثلاً اس بات میں سب کا اتفاق ہے کہ سچ بولنا اچھا ہے، جھوٹ بولنا برا ہے۔ اس میں سب کا اتفاق ہے کہ دیانت داری اچھی بات ہے، بددیانتی برائی ہے۔ اس سے کسی کو اختلاف نہیں کہ ماں باپ کی خدمت، ہمسایہ سے سلوک، مسکینوں کی خبر گیری، مظلوم کی داد رسی انسان کے اچھے اعمال ہیں اور ظلم اور بدسلوکی برے اعمال ہیں۔ گویا یہ وہ باتیں ہوئیں جن کی اچھائی عام طور پر جانی بوجھی ہوئی ہے اور جن کے خلاف جانا عام طور پر قابل انکار

واعتراض ہے۔ دنیا کے تمام مذاہب، دنیا کے تمام اخلاق، دنیا کی تمام حکمتیں، دنیا کی تمام جماعتیں دوسری باتوں میں کتنا ہی اختلاف رکھتی ہوں، لیکن جہاں تک ان اعمال کا تعلق ہے سب ہم آہنگ وہم رائے ہیں۔

قرآن کہتا ہے: یہ اعمال جن کی اچھائی عام طور پر نوع انسانی کی جانی بوجھی ہوئی ہے، دین الٰہی کے مطلوبہ اعمال ہیں۔ اسی طرح وہ اعمال جن سے عام طور پر انکار کیا گیا ہے اور جن کی برائی پر تمام مذاہب متفق ہیں، دین الٰہی کے ممنوعہ اعمال ہیں۔ یہ بات چونکہ دین کی اصل حقیقت تھی، اس لئے اس میں اختلاف نہ ہوسکا اور مذہبی گروہوں کی بے شمار گمراہیوں اور حقیقت فراموشیوں پر بھی ہمیشہ معلوم ومسلم رہی۔ ان اعمال کی اچھائی اور برائی پر نوع انسانی کے تمام عہدوں، تمام مذہبوں اور تمام قوموں کا عالمگیر اتفاق ان کی فطری اصلیت پر ایک بہت بڑی دلیل ہے۔ پس جہاں تک اعمال کا تعلق ہے، میں انہیں باتوں کے کرنے کا حکم دیتا ہوں جن کی اچھائی عام طور پر جانی بوجھی ہوئی ہے اور انہیں باتوں سے روکتا ہوں جن سے عام طور پر نوع انسانی نے انکار کیا ہے، یعنی میں معروف کا حکم دیتا ہوں، منکر سے روکتا ہوں۔ پس جب میری دعوت کا یہ حال ہے تو پھر کسی انسان کو بھی جسے راست بازی سے اختلاف نہیں، کیوں مجھ سے اختلاف ہو؟

"الدین القیم" اور "فطرة الله"

وہ کہتا ہے: یہی راہ عمل نوع انسانی کے لئے خدا کا ٹھہرایا ہوا فطری دین ہے اور فطرت کے قوانین میں کبھی تبدیلی نہیں ہوسکتی۔ یہی "الدین القیم" ہے، یعنی سیدھا اور درست دین جس میں کسی طرح کی کجی اور خامی نہیں۔ یہی "دین حنیف" ہے جس کی دعوت حضرت ابراہیم نے دی تھی۔ اسی کا نام میری اصطلاح میں "الاسلام" ہے، یعنی خدا کے ٹھہرائے ہوئے قوانین کی فرماں برداری

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ؕ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ؕ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۙ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ

النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ مُنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ وَاتَّقُوْهُ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا ؕ كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ۝ (۳۰:۳۰-۳۲)

تم ہر طرف سے منہ پھیر کر ''الدین'' کی طرف رخ کرو، یہی خدا کی بناوٹ ہے جس پر اس نے انسان کو پیدا کیا ہے۔ اللہ کی بناوٹ میں کبھی تبدیلی نہیں ہو سکتی یہی ''الدین القیم'' (یعنی سیدھا اور سچا دین) ہے، لیکن اکثر انسان ایسے ہیں جو نہیں جانتے۔ (دیکھو!) اسی (ایک خدا) کی طرف متوجہ رہو، اس کی نافرمانی سے بچو، نماز قائم کرو اور مشرکوں میں سے نہ ہو جاؤ جنہوں نے اپنے دین کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے اور گروہ بندیوں میں بٹ گئے۔ ہر گروہ کے پاس جو کچھ ہے وہ اسی میں مگن ہے۔

''الاسلام''

وہ کہتا ہے: خدا کا ٹھہرایا ہوا دین جو کچھ ہے یہی ہے۔ اس کے سوا جو کچھ بنا لیا گیا ہے وہ انسانی گروہ بندیوں کی گمراہیاں ہیں۔ پس اگر تم خدا پرستی اور عمل صالح کی اصل پر جو تم سب کے یہاں اصل دین ہے، جمع ہو جاؤ اور خود ساختہ گمراہیوں سے باز آ جاؤ تو میرا مقصد پورا ہو گیا۔ میں اس سے زیادہ اور کیا چاہتا ہوں''۔

اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝ فَاِنْ حَآجُّوْكَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ ؕ وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ ؕ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ۝ (۳:۱۹-۲۰)

اللہ کے نزدیک دین ایک ہی ہے اور وہ ''الاسلام'' ہے۔ اور یہ جو اہل کتاب نے اختلاف کیا (اور ایک دین پر مجتمع رہنے کی جگہ یہودیت اور نصرانیت کی گروہ بندیوں

میں بٹ گئے) تو یہ اس لئے ہوا کہ اگرچہ علم وحقیقت کی راہ ان پر کھل چکی تھی، لیکن آپس کی ضد اور سرکشی سے اختلاف میں پڑ گئے۔ اور (یاد رکھو!) جو کوئی اللہ کی آیتوں سے انکار کرتا ہے تو اللہ (کا قانون مکافات بھی) حساب لینے میں سست رفتار نہیں۔
پھر اگر یہ لوگ تم سے اس بارے میں جھگڑا کریں تو تم کہو: میری اور میرے پیرووں کی راہ تو یہ ہے کہ اللہ کے آگے سر اطاعت جھکا دینا، اور ہم نے سر جھکا دیا ہے۔ پھر اہل کتاب سے اور ان پڑھ لوگوں سے (یعنی مشرکین عرب سے) پوچھو: تم بھی اللہ کے آگے جھکتے ہو یا نہیں؟ (یعنی ساری باتیں جھگڑے کی چھوڑو، یہ بتاؤ تمہیں خدا پرستی منظور ہے یا نہیں؟) اگر وہ جھک گئے تو (سارا جھگڑا ختم ہو گیا اور) انہوں نے راہ پالی اگر روگردانی کریں تو تمہارے ذمے جو کچھ ہے وہ پیام حق پہنچا دینا ہے۔ اور اللہ کی نظروں سے بندوں کا حال پوشیدہ نہیں۔

اس نے دین کے لئے ''الاسلام'' کا لفظ اسی لئے اختیار کیا ہے کہ ''اسلام'' کے معنی کسی بات کے مان لینے اور فرماں برداری کرنے کے ہیں۔ وہ کہتا ہے: دین کی حقیقت یہی ہے کہ خدا نے جو قانون سعادت انسان کیلئے ٹھہرا دیا ہے، اس کی ٹھیک ٹھیک اطاعت کی جائے۔ وہ کہتا ہے: یہ کچھ انسان ہی کیلئے نہیں ہے، بلکہ تمام کائنات ہستی اسی اصل پر قائم ہے۔ سب کے بقاء وقیام کیلئے خدا نے کوئی نہ کوئی قانون عمل ٹھہرا دیا ہے اور سب اس کی اطاعت کر رہے ہیں۔ اگر ایک لمحے کیلئے بھی روگردانی کریں تو کارخانۂ ہستی درہم برہم ہو جائے۔

اَفَغَیْرَ دِیْنِ اللّٰهِ یَبْغُوْنَ وَلَهٗۤ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّاِلَیْهِ یُرْجَعُوْنَ۝ (۸۳:۳)

پھر کیا یہ لوگ چاہتے ہیں اللہ کا ٹھہرایا ہوا دین چھوڑ کر کوئی دوسرا دین ڈھونڈ نکالیں، حالانکہ آسمان اور زمین میں جو کوئی بھی ہے سب چار و ناچار اسی کے (ٹھہرائے ہوئے قانون عمل کے) آگے جھکے ہوئے ہیں، اور (بالآخر) سب کو اسی کی طرف لوٹنا ہے۔

وہ جب کہتا ہے ''الاسلام'' کے سوا کوئی دین اللہ کے نزدیک مقبول نہیں'' تو اس کا مطلب

یہی ہوتا ہے کہ دین حقیقی کے سوا جو ایک ہی ہے اور تمام رسولوں کی مشترک تعلیم ہے، انسانی ساخت کی کوئی گروہ بندی مقبول نہیں۔ سورہ آل عمران میں جہاں یہ بات بیان کی ہے کہ دین حقیقی کی راہ تمام مذہبی رہنماؤں کی تصدیق اور پیروی کی راہ ہے، وہیں متصلاً یہ بھی کہہ دیا ہے

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ○ (۸۵:۳)

اور جو کوئی اسلام کے سوا کوئی دوسرا دین چاہے گا تو یاد رکھو! اس کی راہ کبھی قبول نہ کی جائے گی اور وہ آخرت کے دن (دیکھے گا کہ) تباہ ہونے والوں میں سے ہے۔

اور اسی لئے وہ تمام پیروان دعوت کو بار بار متنبہ کرتا ہے کہ دین میں تفرقہ اور گروہ بندی سے بچیں اور اسی گمراہی میں مبتلا نہ ہو جائیں جس سے قرآن نے نجات دلائی ہے۔ وہ کہتا ہے: میری دعوت نے تمام انسانوں کو جو مذہب کے نام پر ایک دوسرے کے دشمن ہو رہے تھے، خدا پرستی کی راہ میں اس طرح جوڑ دیا کہ ایک دوسرے کے جان نثار بھائی بن گئے۔ ایک یہودی جو پہلے حضرت مسیح کا نام سنتے ہی نفرت سے بھر جاتا تھا، ایک عیسائی جو ہر یہودی کے خون کا پیاسا تھا، ایک مجوسی جس کے نزدیک تمام غیر مجوسی ناپاک تھے، ایک عرب جو اپنے سوا سب کو انسانی شرف ومحاسن سے تہی دست سمجھتا تھا، ایک صابی جو یقین کرتا تھا کہ دنیا کی قدیم سچائی صرف اسی کے حصے میں آئی ہے، ان سب کو دعوت قرآنی نے ایک صف میں کھڑا کر دیا ہے اور اب یہ سب ایک دوسرے سے نفرت کرنے کی جگہ ایک دوسرے کے مذہبی رہنماؤں کی تصدیق کرتے اور سب کی بتائی ہوئی متفقہ راہ ہدایت پر گامزن ہیں۔

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ○ (۱۰۳:۳)

اور (دیکھو!) سب مل جل کر اللہ کی رسی مضبوط پکڑ لو اور جدا جدا نہ ہو، اللہ نے تم پر جو فضل کرم کیا ہے اسے یاد کرو۔ تمہارا حال یہ تھا کہ ایک دوسرے کے دشمن ہو رہے تھے، پھر اللہ نے تمہارے دلوں میں باہم دگر الفت پیدا کر دی، پھر ایسا ہوا کہ انعام الٰہی سے بھائی بھائی ہو گئے۔ اور (دیکھو!) تمہارا حال یہ تھا گویا آگ سے بھرا ہوا گڑھا ہے اور اس کے کنارے کھڑے ہو، لیکن اللہ نے تمہیں بچا لیا اللہ اسی طرح اپنی کارفرمائیوں کی نشانیاں تم پر واضح کرتا ہے، تاکہ ہدایت پاؤ۔

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ۗ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝ (۳:۱۰۵)

اور (دیکھو!) ان لوگوں کی سی چال اختیار نہ کر لینا جو (ایک دین پر قائم رہنے کی جگہ) جدا جدا ہو گئے اور اختلافات میں پڑ گئے، باوجودیکہ روشن دلیلیں ان کے سامنے آ چکی تھیں۔ (یاد رکھو!) یہی لوگ ہیں جن کیلئے (کامیابی وفلاح کی جگہ) بڑا (بھاری) عذاب ہے۔

وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۗ ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝ (۶:۱۵۴)

اور (دیکھو!) یہ میری راہ ہے، بالکل سیدھی راہ پس اسی ایک راہ پر چلو، طرح طرح کی راہوں کے پیچھے نہ پڑ جاؤ کہ وہ تمہیں خدا کی راہ سے ہٹا کر جدا جدا کر دیں گی۔ یہی بات ہے جس کا خدا تمہیں حکم دیتا ہے تاکہ تم (نافرمانی سے) بچو۔

قرآن اور اس کے مخالفوں میں بناءِ نزاع

اب چند لمحوں کے لیے اس نزاع پر غور کرو جو قرآن اور اس کے مخالفوں میں پیدا ہو گئی تھی یہ مخالف کون تھے؟ پچھلے مذاہب کے پیرو تھے جن میں بعض کے پاس کتاب تھی، بعض کے پاس نہ تھی۔

اچھا بناء نزاع کیا تھی؟

کیا یہ تھی کہ قرآن نے ان کے بانیوں اور رہنماؤں کو جھٹلایا تھا یا ان کی مقدس کتابوں سے انکار کیا تھا اور اس لئے وہ اس کی مخالفت میں کمر بستہ ہو گئے تھے۔

کیا یہ تھی کہ اس نے دعویٰ کیا تھا خدا کی سچائی صرف میرے ہی حصہ میں آئی ہے اور تمام پیروان مذاہب کو چاہیے اپنے اپنے نبیوں سے برگشتہ ہو جائیں؟

یا پھر اس نے دین کے نام سے کوئی ایسی بات کر دی تھی جو پیروان مذاہب کے لیے بالکل نئی بات تھی اور اس لیے قدرتی طور پر انہیں ماننے میں تامل تھا؟

قرآن کے صفحے کھلے ہوئے ہیں اور اس کے نزول کی تاریخ بھی دنیا کے سامنے ہے۔ یہ دونوں ہمیں بتلاتے ہیں کہ ان باتوں میں سے کوئی بات بھی نہ تھی اور نہ ہو سکتی تھی۔ اس نے نہ صرف ان تمام رہنماؤں کی تصدیق کی جن کے نام لیوا اس کے سامنے تھے، بلکہ صاف صاف لفظوں میں کہہ دیا: مجھ سے پہلے جتنے بھی پیغمبر آ چکے ہیں، میں سب کی تصدیق کرتا ہوں اور ان میں سے کسی ایک کے انکار کو بھی خدا کی سچائی کا انکار سمجھتا ہوں۔ اس نے کسی مذہب کے ماننے والے سے یہ مطالبہ نہیں کیا کہ وہ اپنے مذہب کی دعوت سے انکار کر دے بلکہ جب کبھی مطالبہ کیا تو یہی کیا کہ اپنے اپنے مذہبوں کی حقیقی تعلیم پر کاربند ہو جاؤ، کیونکہ تمام مذہبوں کی اصل تعلیم ایک ہی ہے۔ اس نے نہ تو کوئی نیا اصول پیش کیا، نہ کوئی نیا عمل بتایا۔ اس نے ہمیشہ انہیں باتوں پر زور دیا جو دنیا کے مذاہب کی سب سے زیادہ جانی بوجھی ہوئی باتیں رہی ہیں۔ یعنی ایمان اور عمل صالح۔ اس نے جب کبھی لوگوں کو اپنی طرف بلایا ہے تو یہی کہا ہے: اپنے اپنے مذہبوں کی حقیقت از سر نو تازہ کر لو، ایسا کرنا ہی مجھے قبول کر لینا ہے۔

سوال یہ ہے کہ جب قرآن کی دعوت کا یہ حال تھا تو پھر آخر اس میں اور اس کے مخالفوں میں وجہ نزاع کیا تھی؟ ایک شخص جو کسی کو برا نہیں کہتا، سب کو مانتا اور سب کی تعظیم کرتا ہے اور ہمیں انہیں باتوں کی تلقین کرتا ہے جو سب کے یہاں مانی ہوئی ہیں، کوئی اس سے لڑے تو کیوں لڑے اور کیوں لوگوں کو اس کا ساتھ دینے سے انکار ہو؟

کہا جاتا ہے کہ قریش مکہ کی مخالفت اس بنا پر تھی کہ قرآن نے بت پرستی سے انکار کر دیا تھا اور وہ بت پرستی کے طریقوں سے مالوف ہو چکے تھے۔ بلا شبہ ایک وجہ نزاع یہ بھی ہے لیکن صرف یہی وجہ نزاع نہیں ہو سکتی۔ سوال یہ ہے کہ یہودیوں نے کیوں مخالفت کی جو بت پرستی سے قطعاً کنارہ کش تھے؟ عیسائی کیوں برسر پیکار ہو گئے جنہوں نے کبھی بت پرستی کی حمایت کا دعویٰ نہیں کیا؟

پیروان مذاہب کی مخالفت اس لئے نہ تھی کہ جھٹلاتا کیوں ہے، بلکہ اس لئے کہ جھٹلاتا کیوں نہیں؟

اصل یہ ہے کہ پیروان مذاہب کی مخالفت اس لئے نہ تھی کہ وہ انہیں جھٹلاتا کیوں ہے، بلکہ اس لیے تھی کہ جھٹلاتا کیوں نہیں، ہر مذہب کا پیرو چاہتا تھا کہ وہ صرف اسی کو سچا کہے، باقی سب کو جھٹلائے۔ اور چونکہ وہ یکساں طور پر سب کی تصدیق کرتا تھا، اس لئے کوئی بھی اس سے خوش نہیں ہو سکتا تھا۔ یہودی اس بات سے تو بہت خوش تھے کہ قرآن حضرت موسیٰ کی تصدیق کرتا ہے، لیکن وہ صرف اتنا ہی نہیں کرتا تھا، وہ حضرت مسیح کی بھی تصدیق کرتا تھا اور یہیں آ کر اس میں اور یہودیوں میں نزاع شروع ہو جاتی تھی۔ عیسائیوں کو اس پر کیا اعتراض ہو سکتا تھا کہ حضرت مسیح اور حضرت مریم کی پاکی وصداقت کا اعلان کیا جائے؟ لیکن قرآن صرف اتنا ہی نہیں کرتا تھا، وہ یہ کہتا تھا کہ نجات کا دار مدار اعتقاد وعمل پر ہے، نہ کہ کفارہ اور اصطباغ پر۔ اور قانون نجات کی یہ عالم گیر وسعت عیسائی کلیسا کے لیے ناقابل برداشت تھی۔

اسی طرح قریش مکہ کے لیے اس سے بڑھ کر دل خوش صدا نہیں ہو سکتی تھی کہ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل کی بزرگی کا اعتراف کیا جائے، لیکن جب وہ دیکھتے تھے کہ قرآن جس طرح ان دونوں کی بزرگی کا اعتراف کرتا ہے، اسی طرح یہودیوں کے پیغمبروں اور عیسائیوں کے داعی کا بھی معترف ہے تو ان کے نسلی اور جماعتی غرور کو ٹھیس لگتی تھی۔ وہ کہتے تھے ایسے لوگ حضرت ابراہیم اور اسماعیل کے پیرو کیونکر ہو سکتے ہیں جو ان کی بزرگی اور صداقت کی صف میں دوسروں کو بھی لا کھڑا کرتے ہیں۔

تین اصول جو قرآن میں اور اس کے مخالفوں میں بناء نزاع ہوئے

مختصر یوں سمجھنا چاہیے کہ قرآن کے تین اصول ایسے تھے جو اس میں اور تمام پیروان مذاہب میں وجہ نزاع ہو گئے۔

۱۔ وہ مذہبی گروہ بندی کی روح کا مخالف تھا اور دین وحدت یعنی ایک ہونے کا اعلان کرتا تھا۔ اگر پیروان مذہب یہ مان لیتے تو انہیں تسلیم کر لینا پڑتا کہ دین کی سچائی کسی ایک ہی گروہ کے حصے میں نہیں آئی ہے، سب کو یکساں طور پر ملی ہے۔ لیکن یہی ماننا ان کی گروہ پرستی پر شاق گزرتا تھا۔

۲۔ قرآن کہتا تھا نجات اور سعادت کا دارومدار اعتقاد وعمل پر ہے، نسل، قوم گروہ بندی اور ظاہری رسم ریت پر نہیں ہے۔ اگر یہ اصل وہ تسلیم کر لیتے تو پھر نجات کا دروازہ بلا امتیاز تمام نوع انسانی پر کھل جاتا اور کسی ایک مذہبی حلقے کی ٹھیکے داری باقی نہ رہتی۔ لیکن اس بات کے لیے ان میں سے کوئی بھی تیار نہ تھا۔

۳۔ وہ کہتا تھا اصل دین خدا پرستی ہے اور خدا پرستی یہ ہے کہ خدا کی براہ راست پرستش کی جائے۔ لیکن پیروان مذاہب نے کسی نہ کسی شکل میں شرک و بت پرستی کے طریقے اختیار کر لئے تھے۔ اور گو انہیں اس بات سے انکار نہ تھا کہ اصل دین خدا پرستی ہی ہے، لیکن یہ بات شاق گزرتی تھی کہ اپنے مالوف و معتاد طریقوں سے دست بردار ہو جائیں۔

خلاصہ بحث

متذکرہ بالا صدر تفصیلات کا ماحصل حسب ذیل دفعات میں بیان کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ نزول قرآن کے وقت دنیا کا مذہبی تخیل اس سے زیادہ وسعت نہیں رکھتا تھا کہ نسلوں خاندانوں اور قبیلوں کی معاشرتی حد بندیوں کی طرح مذہب کی بھی ایک خاص گروہ بندی کر لی گئی تھی۔ ہر گروہ بندی کا آدمی سمجھتا تھا دین کی سچائی صرف اسی کے حصے میں آئی ہے۔ جو انسان اس کی مذہبی حد بندی میں داخل ہے نجات یافتہ ہے، جو داخل نہیں ہے نجات سے محروم ہے۔

۲۔ ہر گروہ کے نزدیک مذہب کی اصل وحقیقت محض اس کے ظاہری اعمال ورسوم تھے۔ جوں ہی ایک انسان انہیں اختیار کر لیتا، یقین کیا جاتا کہ نجات وسعادت اسے حاصل ہوگئی، مثلاً عبادت کی شکل، قربانیوں کے رسوم، کسی خاص طعام کا کھانا یا نہ کھانا، کسی خاص وضع وقطع کا اختیار کرنا یا نہ کرنا۔

۳۔ چونکہ اعمال ورسوم ہر مذہب میں الگ الگ تھے اور ہر گروہ کے اجتماعی مقتضیات یکساں نہیں ہو سکتے تھے، اس لئے ہر مذہب کا پیرو یقین کرتا تھا کہ دوسرا مذہب صداقت سے خالی ہے، کیونکہ اس کے اعمال ورسوم ویسے نہیں ہیں جیسے خود اس نے اختیار کر رکھے ہیں۔

۴۔ ہر مذہبی گروہ کا دعویٰ صرف یہی نہ تھا کہ وہ سچا ہے، بلکہ یہ بھی تھا کہ دوسرا جھوٹا ہے۔ نتیجہ یہ تھا کہ ہر گروہ صرف اتنے ہی پر قانع نہیں رہتا کہ اپنی سچائی کا اعلان کرے، بلکہ یہ بھی ضروری سمجھتا کہ دوسروں کے خلاف تعصب ونفرت و پھیلائے۔ اس صورت حال سے نوع انسانی کو ایک دائمی جنگ وجدال کی حالت میں مبتلا کر دیا تھا۔ مذہب اور خدا کے نام پر ہر گروہ دوسرے گروہ سے نفرت کرتا اور اس کا خون بہانا جائز سمجھتا۔

۵۔ لیکن قرآن نے نوع انسانی کے سامنے مذہب کی عالمگیر سچائی کا اصول پیش کیا۔

(الف) اس نے صرف یہی نہیں بتایا کہ مذہب میں سچائی ہے بلکہ صاف صاف کہہ دیا کہ تمام مذاہب سچے ہیں۔ اس نے کہا دین خدا کی عام بخشش ہے، اس لئے ممکن نہیں کہ کسی ایک جماعت ہی کو دیا گیا ہو۔ دوسروں کا اس میں کوئی حصہ نہ ہو۔

(ب) اس نے کہا، خدا کے تمام قوانین فطرت کی طرح انسان کی روحانی سعادت کا قانون بھی ایک ہی ہے اور سب کے لیے ہے۔ پس پیروان مذہب کی سب سے بڑی گمراہی یہ ہے کہ انہوں نے دین الٰہی کی وحدت فراموش کر کے الگ الگ گروہ بندیاں کر لی ہیں اور ہر گروہ بندی دوسری گروہ بندی سے لڑ رہی ہے۔

(ج) اس نے بتایا کہ خدا کا دین اس لئے تھا کہ نوع انسانی کا تفرقہ اور اختلاف دور ہو، اس لئے نہ تھا کہ تفرقہ ونزاع کی علت بن جائے۔ پس اس سے بڑھ کر گمراہی اور

کیا ہو سکتی ہے کہ جو چیز تفرقہ دور کرنے کے لیے آئی تھی، اسی کو تفرقہ کی بنیاد بنالیا ہے۔

(د) اس نے بتایا کہ ایک چیز دین ہے، ایک شرع و منہاج ہے۔ دین ایک ہی ہے اور ایک ہی طرح پر سب کو دیا گیا ہے۔ البتہ شرع و منہاج میں اختلاف ہوا اور یہ اختلاف ناگزیر تھا۔ کیونکہ ہر عہد اور ہر قوم کی حالت یکساں نہ تھی اور ضروری تھا کہ جیسی جس کی حالت ہو ویسے ہی احکام واعمال بھی اس کے لئے اختیار کیے جائیں۔ پس شرع و منہاج کے اختلاف سے اصل دین مختلف نہیں ہو سکتے۔ تم نے دین کی حقیقت تو فراموش کر دی ہے، محض شرع و منہاج کے اختلاف پر ایک دوسرے کو جھٹلا رہے ہو۔

۵۔ اس نے بتلایا کہ تمہاری مذہبی گروہ بندیاں اور ان کے ظواہر و رسوم کو انسانی نجات وسعادت میں کوئی دخل نہیں۔ یہ گروہ بندیاں تمہاری بنائی ہوئی ہیں ورنہ خدا کا ٹھہرایا ہوا دین تو ایک ہی ہے۔ وہ دین حقیقی کیا ہے؟ وہ کہتا ہے: ایمان اور عمل صالح کا قانون۔

(و) اس نے صاف صاف لفظوں میں اعلان کر دیا کہ اس کی دعوت کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ تمام مذاہب سچے ہیں، لیکن پیروان مذہب سچائی سے منحرف ہو گئے ہیں۔ اگر وہ اپنی فراموش کردہ سچائی از سرنو اختیار کر لیں تو میرا کام پورا ہو گیا اور انہوں نے مجھے قبول کر لیا۔ تمام مذاہب کی یہی مشترک اور متفقہ سچائی ہے جسے وہ ''الدین'' اور ''الاسلام'' سے پکارتا ہے۔

(ز) وہ کہتا ہے: خدا کا دین اس لئے نہیں ہے کہ ایک انسان دوسرے انسان سے نفرت کرے، بلکہ اس لئے ہے کہ ہر انسان دوسرے انسان سے محبت کرے اور سب ایک ہی پروردگار کے رشتہ عبودیت میں بندھ کر ایک ہو جائیں۔ وہ کہتا ہے: جب سب کا پروردگار ایک ہے، جب سب کا مقصود اسی کی بندگی ہے، جب ہر انسان کے لئے وہی ہونا ہے جیسا کچھ اس کا عمل ہے تو پھر خدا اور مذہب کے

نام پر یہ تمام جنگ ونزاع کیوں ہے؟

۶۔ مذاہب عالم کا اختلاف صرف اختلاف ہی کی حد تک نہیں رہا ہے، بلکہ باہمی نفرت ومخاصمت کا ذریعہ بن گیا ہے۔سوال یہ ہے کہ مخاصمت کیوں کر دور ہو؟ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ تمام پیروان مذاہب اپنے دعوے میں سچے مان لئے جائیں، کیونکہ ہر مذہب کا پیرو صرف اسی بات کا مدعی نہیں ہے کہ وہ سچا ہے، بلکہ اس کا مدعی ہے کہ دوسرے جھوٹے ہیں۔ پس اگر ان کے دعاوی مان لئے جائیں تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ ہر مذہب بیک وقت سچا بھی ہے اور جھوٹا بھی ہے۔ یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ سب کو جھوٹا قرار دیا جائے، کیونکہ اگر تمام مذاہب جھوٹے ہیں تو پھر مذہب کی سچائی ہے کہاں؟ پس اگر کوئی صورت رفع نزاع کی ہو سکتی ہے تو وہ وہی ہے جس کی دعوت لے کر قرآن نمودار ہوا ہے۔ تمام مذاہب سچے ہیں۔ کیونکہ اصل دین ایک ہی ہے اور سب کو دیا گیا ہے لیکن تمام پیروان مذاہب سچائی سے منحرف ہو گئے ہیں ، کیونکہ انہوں نے دین کی حقیقت اور وحدت ضائع کر دی ہے۔ اور اپنی گمراہیوں کی الگ الگ ٹولیاں بنالی ہیں۔ اگر ان گمراہیوں سے لوگ باز آ جائیں اور اپنے اپنے مذہب کی حقیقی تعلیم پر کاربند ہو جائیں تو مذاہب کی تمام نزاعات ختم ہو جائیں گی۔ ہر گروہ دیکھ لے گا کہ اس کی راہ بھی اصلاً ہی ہے جو اور تمام گروہوں کی راہ ہے۔ قرآن کہتا ہے: تمام مذاہب کی یہی مشترک اور متفقہ حقیقت ''الدین'' ہے، یعنی نوع انسانی کے لیے حقیقی دین اور اسی کو وہ ''الاسلام'' کے نام سے پکارتا ہے۔

۷۔ نوع انسانی کی باہمی یگانگت اور اتحاد کے جتنے رشتے بھی ہو سکتے تھے سب انسان کے ہاتھوں ٹوٹ چکے۔ سب کی نسل ایک تھی، مگر ہزاروں نسلیں ہو گئیں۔ سب کی قومیت ایک تھی، مگر بے شمار قومیتیں بن گئیں۔ سب کی وطنیت ایک تھی، لیکن سینکڑوں وطنیتوں میں بٹ گئے۔ سب کا درجہ ایک تھا، لیکن امیر وفقیر، شریف ووضیع اور ادنی واعلی کے بہت سے درجے ٹھہرا لئے گئے۔ ایسی حالت میں کون سا رشتہ ہے جو ان تمام تفرقوں پر غالب آ سکتا ہے اور تمام انسان ایک ہی صف میں کھڑے ہو سکتے ہیں؟ قرآن کہتا ہے کہ خدا پرستی کا رشتہ۔ یہی ایک رشتہ

ہے جو انسانیت کا بچھڑا ہوا گھرانا پھر آباد کر دے سکتا ہے۔ یہ اعتقاد کہ ہم سب کا پروردگار ایک ہی پروردگار ہے اور ہم سب کے سر اسی ایک چوکھٹ پر جھکے ہوئے ہیں، یک جہتی اور یگانگت کا ایسا جذبہ پیدا کر دیتا ہے کہ ممکن نہیں انسان کے بنائے ہوئے تفرقے اس پر غالب آسکیں۔

صراط مستقیم

اسی بناء پر سورہ فاتحہ میں جس دعا کی تلقین کی گئی وہ ''صراط مستقیم'' پر چلنے کی طلب گاری ہے۔ ''صراط'' کے معنی راہ کے ہیں اور ''مستقیم'' کے معنی سیدھا ہونے کے۔ پس ''صراط مستقیم'' ایسی راہ جو سیدھی ہو، کسی طرح کا پیچ وخم نہ ہو۔ پھر اس راہ کی پہچان یہ بتلائی کہ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ غَیْرِالْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلَاالضَّآلِّیْنَ. یعنی ان لوگوں کی راہ جن پر خدا کا انعام ہوا۔ ان کی راہ نہیں جو مغضوب ہوئے، نہ ان کی جو گمراہ ہیں۔

یہ انعام یافتہ انسان کون ہیں جن کی راہ سیدھی راہ ہوئی۔ قرآن نے جا بجا واضح کیا ہے کہ خدا کے تمام رسول اور راست باز انسان جو دنیا کے مختلف عہدوں اور گوشوں میں گزر چکے ہیں، انعام یافتہ انسان ہیں اور انہیں کی راہ صراط مستقیم ہے۔

وَمَنْ یُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ مِّنَ النَّبِیّٖنَ وَالصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِیْنَ وَ حَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِیْقًا ۝ (۶۹:۴)

اور جس کسی نے اللہ اور رسول کی اطاعت کی تو بلا شبہ وہ ان لوگوں کا ساتھی ہوا جن پر اللہ نے انعام کیا ہے۔ یہ انعام یافتہ جماعت نبیوں کی ہے، صدیقوں کی ہے، شہداء کی ہے، نیک عمل انسانوں کی ہے اور (جس کے ساتھی ایسے لوگ ہوں تو) کیا ہی اچھی اس کی رفاقت ہے۔

اس آیت میں بالترتیب چار جماعتوں کا ذکر کیا گیا ہے اور انہیں انعام یافتہ قرار دیا ہے ، انبیاء، صدیقین، شہداء، صالحین۔

''انبیاء'' سے مقصود خدا کی سچائی کے تمام پیغام بر ہیں جو نوع انسانی کی ہدایت کے لئے پیدا ہوئے۔

''صدیق'' سے مقصود ایسے انسان ہیں جو کامل معنوں میں سچے ہوں، یعنی سچائی کے سانچے میں کچھ اس طرح ڈھلے ہوئے ہوں کہ سچائی کے خلاف کوئی بات ان کے دماغ میں اتر ہی نہ سکے۔

''شہید'' کے معنی گواہ کے ہیں۔ یعنی ایسے انسان جو اپنے قول و فعل سے حق وصداقت کی شہادت بلند کرنے والے ہیں۔

''صالحین'' سے مقصود وہ تمام انسان ہیں جو نیک عملی کی راہ میں استقامت رکھیں اور برائی کی راہوں سے کنارہ کش ہوں۔

پس معلوم ہوا انعام یافتہ انسانوں سے مقصود دنیا کے رسول اور داعیان حق ہیں جو قرآن کے نزول سے پہلے دنیا میں ہو چکے تھے اور تمام راست باز انسان ہیں جو نوع انسانی میں گزر چکے تھے۔ اس میں تو کسی خاص نسل وقوم کی خصوصیت رکھی گئی ہے، نہ خاص مذہب اور اس کے پیرووں کی۔ دنیا کے تمام نبی، تمام صدیق، تمام شہداء حق، تمام صالح انسان، خواہ کسی ملک وقوم میں ہوں قرآن کے نزدیک ''انعام یافتہ'' انسان ہیں اور انہیں کی راہ ''صراط مستقیم'' ہے۔

خدا کے ان رسولوں اور نوع انسانی کے راست باز افراد کی راہ کون سی راہ تھی؟ وہی راہ جسے قرآن دین حقیقی کی راہ قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے: دنیا میں جس قدر بھی سچائی کے داعی آئے، سب نے یہی تعلیم دی کہ ''اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ (۴۲:۱۳) خدا کا ایک ہی دین قائم رکھو اور اس راہ میں جدا جدا نہ ہو جاؤ (یہی راہ سچائی کی سیدھی راہ ہے)۔

چنانچہ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے جا بجا ''الدین'' کو صراط مستقیم سے تعبیر کیا ہے۔ سورہ شوریٰ میں پیغمبر اسلام کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے ''تم صراط مستقیم کی طرف ہدایت کرنے والے ہو صراط مستقیم ہی صراط اللہ ہے''۔ یعنی اللہ کی ٹھہرائی ہوئی سعادت۔

وَاِنَّكَ لَتَهْدِیْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۝ صِرَاطِ اللّٰهِ الَّذِیْ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ اَلَاۤ اِلَى اللّٰهِ تَصِیْرُ الْاُمُوْرُ ۝ (۴۲:۵۲-۵۳)

اور (اے پیغمبر!) بلاشبہ تم صراط مستقیم کی طرف ہدایت کرنے والے ہو، صراط اللہ یعنی اللہ کی راہ کی طرف، وہ اللہ کہ آسمان وزمین میں جو کچھ ہے سب اسی کا ہے۔ ہاں یادرکھو (کائنات خلقت کے) تمام کاموں کا مرجع اسی کی ذات ہے۔

اسی طرح وہ جابجا کہتا ہے کہ خدا کے تمام رسولوں کی دعوت صراط مستقیم کی دعوت تھی۔ سورہ نحل میں حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی نسبت ہے: وَهَدٰهُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (۱۶:۱۲۱) خدا نے اسے صراط مستقیم دکھا دی۔ سورہ زخرف میں حضرت مسیح (علیہ السلام) کی زبانی سنتے ہیں اِنَّ اللّٰهَ هُوَ رَبِّیْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ (۴۳:۶۴) اللہ میرا اور تمہارا سب کا پروردگار ہے، پس اسی کی بندگی کرو، یہی صراط مستقیم ہے۔ سورہ انعام میں پہلے حضرت نوح اور حضرت ابراہیم کا ذکر کیا ہے، پھر سلسلہ ابراہیمی کے متعدد نبیوں کا جو تورات کی مشہور شخصیتیں ہیں۔ اس کے بعد کہا ہے۔ وَاجْتَبَیْنٰهُمْ وَهَدَیْنٰهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۝ (۶:۸۷) ان سب کو ہم نے صراط مستقیم دکھا دی۔

اصل یہ ہے کہ خدا کے عالم گیری دین کی حقیقت ظاہر کرنے کے لئے صراط مستقیم سے بہتر تعبیر نہیں ہوسکتی تھی۔ تم کسی خاص مقام تک پہنچنے کے لئے کتنی ہی راہیں نکال لو، لیکن سیدھی راہ ہمیشہ ایک ہی ہوگی اور اسی پر چل کر ہر مسافر منزل مقصود تک بحفاظت وامن پہنچ سکے گا۔ علاوہ بریں سیدھی راہ ہی ہمیشہ شاہراہ عام کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ تمام مسافر، خواہ کسی گوشے کے رہنے والے ہوں، لیکن سب مل جل کر وہی راہ اختیار کریں گے اور کبھی یہ نہ کریں گے کہ الگ الگ ٹولیاں بنا کر ٹیڑھی ترچھی راہوں میں متفرق ہو جائیں۔ قرآن کہتا ہے: ٹھیک اسی طرح دین کی سیدھی راہ بھی ایک ہی ہے۔ بہت سی نہیں ہوسکتیں اور وہ اول دن سے موجود ہے۔ ہر عہد، ہر قوم، ہر ملک اسی پر چل کر منزل مقصود تک پہنچا ہے۔ بعد

کو پیروان مذاہب نے ایسا کیا کہ بہت سی ٹیڑھی ترچھی راہیں نکال لیں اور ایک راہ پر متفق رہنے کی جگہ الگ الگ ٹولیاں بنا کر متفرق ہو گئے۔ وہ کہتا ہے۔ اب اگر تم چاہتے ہو کہ منزل مقصود کا سراغ پاؤ تو چاہئے کہ اسی سیدھی راہ پر اکٹھے ہو جاؤ۔ فھو [(سبیل اللّٰہ) طریقا مستقیما ۔سھلا ملوکا واسعا موصلا الی المقصود] ۱۱۱

وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ؕ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ○ (۶:۱۵۳)

اور (دیکھو!) یہ میری راہ ہے، بالکل سیدھی راہ، پس اسی ایک راہ پر چلو اور طرح طرح کے راستوں کے پیچھے نہ پڑو، وہ تمہیں خدا کی سیدھی راہ سے ہٹا کر جدا جدا کر دیں گے۔ یہی بات ہے جس کا خدا تمہیں حکم دیتا ہے تا کہ (اس کی نافرمانی سے بچو)۔

چنانچہ یہ حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے جب ''صراط مستقیم'' کی اس تفسیر پر نظر ڈالی جائے جو خود پیغمبر اسلام ﷺ نے فرمائی ہے۔

عن ابی مسعودقال خط لنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خطا بیدہ ثم قال ھذا سبیل اللہ مستقیما ثم خط خطوطا عن یمین ذلک الخط وعن شمالہ ثم قال وھذالسبل لیس منھا سبیل الا علیہ شیطان یدعو الیہ ثم قرا ھذا الا یۃ.(اخرجہ انسائی واحمد والبزار وابن المنذر وابو الشیخ والحاکم وصححہ)

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے اپنی انگلی سے ایک لکیر کھینچی اور فرمایا یوں سمجھو کہ یہ اللہ کا ٹھہرایا ہوا راستہ ہے، بالکل سیدھا۔ اس کے بعد اس لکیر کے دونوں طرف بہت سی ترچھی لکیریں کھینچ دیں اور فرمایا یہ طرح طرح کے راستے ہیں جو بنا لئے گئے ہیں اور ان میں کوئی راستہ نہیں جس کی طرف بلانے کیلئے ایک شیطان موجود نہ ہو، پھر یہ آیت پڑھی ''وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا'' الی آخرھا

اس سے معلوم ہوا تمام ادھر ادھر کے ٹیڑھے ترچھے راستے ''سبل متفرقہ'' ہیں جو جمعیت بشری کو متحد کرنے کی جگہ متفرق کر دیتے ہیں اور درمیان کی ایک ہی سیدھی راہ ''صراط مستقیم'' ہے یہ متفرق کرنے کی جگہ تمام رہروان منزل کو ایک ہی شاہراہ پر جمع کر دیتی ہے۔

یہ سبل متفرقہ کیا ہے؟ اسی گمراہی کا نتیجہ ہیں جسے قرآن نے ''تشیع'' اور ''تحزب'' کی گمراہی سے تعبیر کیا ہے اور تشریح اس کی اوپر گزر چکی۔

دین حقیقی کی راہ کا سیدھا ہونا اور ''سبل متفرقہ'' یعنی خود ساختہ گروہ بندیوں کا پر پیچ وخم ہونا، ایک ایسی حقیقت ہے جسے ہر انسان بغیر کسی عقلی کاوش کے سمجھ سکتا ہے۔ خدا کا دین اگر انسان کی ہدایت کے لئے ہے تو ضروری ہے کہ خدا کے تمام قوانین کی طرح یہ بھی صاف اور واضح ہو۔ اس میں کوئی راز نہ ہو۔ پیچیدگی نہ ہو۔ نا قابل حل معمہ نہ ہو۔ اعتقاد میں سہل ہو اور عمل میں ہلکا۔ ہر عقل اسے بوجھ لے، ہر طبیعت اس پر مطمئن ہو جائے۔ اچھا اب غور کرو! یہ تعریف کس راہ پر صادق آتی ہے'' ۔ ان مختلف راہوں پر جو پیروان مذہب نے الگ الگ گروہ بندیاں کر کے نکالی ہیں یا اس ایک ہی راہ پر جسے قرآن اصل دین کی راہ بتلاتا ہے؟

ان گروہ بندیوں میں سے کوئی گروہ بندی بھی ایسی نہیں ہے جو اپنے بوجھل عقیدوں، نا قابل فہم عقیدوں اور نا قابل برداشت عملوں کی ایک طول طویل فہرست نہ ہو۔ ہم یہاں تفصیلات میں نہیں جائیں گے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ دنیا کے تمام پیروان مذہب کے مزعومہ عقائد واعمال کا کیا حال ہے اور ان کی نوعیت کیسی ہے۔ مذہب کا عقل کے لئے معمہ اور طبیعت کے لئے بوجھ ہونا ایک ایسی بات ہے جو عام طور پر مذاہب کا خاصہ تسلیم کر لی گئی ہے، لیکن قرآن جس راہ کو دین حقیقی کی راہ کہتا ہے، اس کا کیا حال ہے؟ اس کی راہ تو اتنی واضع، اتنی سہل، اتنی مختصر ہے کہ عقائد واعمال کی پوری فہرست دو لفظوں میں ختم کر دی جا سکتی ہے۔ ''ایمان اور عمل صالح'' [212] اس کے عقائد میں عقل کے لئے کوئی بوجھ نہیں۔ اس کے اعمال میں طبیعت کے لئے کوئی سختی نہیں، ہر طرح کے پیچ وخم سے پاک، ہر معنی میں اعتقاد وعمل کی سیدھی سے سیدھی بات الحنيفية السمحة ليلها كنهارها، اس کی رات بھی اس

کے دن کی طرح روشن ہے"۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلٰي عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَلَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا ۝ (۱:۱۸)

ہر طرح کی ستائش اللہ ہی کے لئے ہے جس نے اپنے بندے پر کتاب نازل کی اور اس میں کسی طرح کی بھی کجی نہیں رکھی۔

بہر حال قرآن کا پیرو وہ ہے جو دین کی سیدھی راہ پر چلنے والا ہے۔ وہ راہ نہیں جو کسی خاص نسل، کسی خاص قوم، کسی خاص عہد کی راہ ہے، بلکہ خدا کی عالمگیر سچائی کی راہ جو ہر جگہ اور ہر عہد میں نمایاں ہوئی ہے اور ہر طرح کی جغرافیائی اور جماعتی حد کے امتیازات سے پاک ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ هُوَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ۝ (۶۴:۴۳)

اللہ میرا اور تمہارا دونوں کا پروردگار ہے پس اسی کی بندگی کرو، یہی صراط مستقیم ہے۔

علاوہ بریں بحث ونظر کے بعض دوسرے پہلو بھی ہیں جو اس موقع پر پیش نظر رہنے چاہئیں۔

اولاً۔ فلاح وسعادت کی راہ کو "سیدھی راہ" سے تعبیر کیا گیا اور سیدھی راہ پر چلنا ایک ایسی بات ہے جس کی سمجھ اور طلب بالطبع ہر انسان کے اندر موجود ہے۔ پھر اس کی پہچان بتلاتے ہوئے کوئی اس طرح کی تعریف نہیں کی جس کے سمجھنے اور منطبق کرنے میں ذہنی کاوشوں کی ضرورت ہو، بلکہ ایک خاص طرح کے انسانوں کی طرف انگلی اٹھا دی کہ "صراط مستقیم" ان لوگوں کی راہ ہے۔ اس اسلوب بیان نے ہر انسان کے سامنے صراط مستقیم کو ایک محسوس ومشہود صورت میں نمایاں کر دیا۔ ہر انسان خواہ کسی عہد اور کسی ملک وقوم سے تعلق رکھتا ہو، لیکن اس بات سے بے خبر نہیں ہوسکتا کہ یہاں دو طرح کے انسان موجود ہیں۔ ایک وہ ہیں جن کی راہ سعادت وکامیابی کی راہ ہے، ایک وہ ہیں جن کے حصے میں محرومی وشقاوت آئی ہے۔ پس

کامیابی کی راہ کی پہچان اس سے زیادہ بہتر اور موثر طریقے سے بیان نہیں کی جاسکتی کہ وہ کامیاب انسان کی راہ ہے۔ اگر اس کی پہچان منطقی تعریفوں کی طرح بیان کی جاتی تو ظاہر ہے نہ تو ہر انسان بغیر کاوش وفکر کے سمجھ سکتا، نہ قطعی طور پر کسی ایک ہی راہ پر منطبق کی جاسکتی۔

ثانیاً۔ جہاں تک انسانی فلاح وسعادت کا تعلق ہے، صراط مستقیم کی تعبیر ہی ہر لحاظ سے حقیقی اور قدرتی تعبیر ہوسکتی تھی۔ انسان کے فکر وعمل کا کوئی گوشہ ہو لیکن صحت ودرستگی کی راہ ہمیشہ وہی ہوگی جو سیدھی راہ ہو۔ جہاں انحراف اور کجی پیدا ہوئی، نقص وفساد ظہور میں آ گیا۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی تمام زبانوں میں سیدھا ہونا اور سیدھی چال چلنا فلاح وسعادت کے معنوں میں عام طور پر بولا جاتا ہے۔ گویا اچھائی کے معنوں میں یہ ایک ایسی تعبیر ہے جو تمام نوع انسانی کی عالم گیر تعبیر کہی جاسکتی ہے۔

حضرت مسیح سے چار سو برس پہلے دارا یوش اول نے جو فرامین کندہ کرائے تھے، ان میں سے بے ستون کا کتبہ آج تک موجود ہے اور اس کا خاتمہ ان جملوں پر ہوتا ہے "اے انسان اھورامزدکا (یعنی خدا کا) تیرے لئے حکم یہ ہے کہ برائی کا دھیان نہ کر، سیدھا راستہ نہ چھوڑ، گناہ سے بچتا رہ"۔ [113]

پس صراط مستقیم پر چلنے کی طلب زندگی کی تمام راہوں میں درستگی وصحت کی راہ چلنے کی طلب ہوئی اور اسی لئے سعی وعمل کے ہر گوشے میں انعام یافتہ گروہ وہی ہوسکتا ہے جس کی راہ صراط مستقیم ہو۔

"المغضوب علیہم" اور "الضالین"

پھر "صراط مستقیم" کی پہچان صرف اس کے مثبت پہلو ہی سے واضح نہیں کی گئی، بلکہ اس کا ضد مخالف پہلو بھی واضح کر دیا گیا: "غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ" انکی راہ نہیں جو مغضوب ہوئے، نہ ان کی جو گمراہ ہو کر بھٹک گئے"۔

"مغضوب علیہ" گروہ "منعم علیہ" کی بالکل ضد ہے۔ کیونکہ انعام کی ضد غضب ہے، اور فطرت کائنات کا قانون یہ ہے کہ راست باز انسانوں کے حصے میں انعام

آتا ہے، نافرمانوں کے حصے میں غضب۔ ''گمراہ'' وہ ہیں جو راہ حق نہ پاسکے اور اس کی جستجو میں بھٹک گئے۔ پس مغضوب وہ ہوئے جنھوں نے راہ پائی اور اس کی نعمتیں بھی پائیں، لیکن پھر اس سے منحرف ہو گئے اور نعمت کی راہ چھوڑ کر محرومی و شقاوت کی راہ اختیار کر لی۔ ''گمراہ'' وہ ہوئے جو راہ ہی نہ پاسکے، اس لئے ادھر ادھر بھٹک رہے ہیں اور صراط مستقیم کی سعادتوں سے محروم ہیں۔

مغضوب علیہ'' کی محرومی حصول و معرفت کے بعد انکار کا نتیجہ ہے اور ''گمراہ'' کی محرومی جہل کا نتیجہ۔ پہلے نے پا کر روگرانی کی اس لئے محروم ہوا۔ دوسرا پا ہی نہ سکا اس لئے محروم ہے۔ محروم دونوں ہوئے، مگر یہ ظاہر ہے کہ پہلے کی محرومی زیادہ مجرمانہ ہے، کیونکہ اس نے نعمت حاصل کر کے پھر اس سے روگردانی کی، اسی لئے اسے مغضوب کہا گیا اور دوسرے کی حالت صرف گمراہی کے لفظ سے تعبیر کی گئی۔

ہم دیکھتے ہیں دنیا میں فلاح وسعادت سے محروم آدمی ہمیشہ دو ہی طرح کے ہوتے ہیں جاحد اور جاہل۔ جاحد وہ ہوتا ہے جو حقیقت پالیتا ہے، بایں ہمہ اس سے روگردانی کرتا ہے۔ جاہل وہ ہوتا ہے جو حقیقت سے نا آشنا ہوتا ہے اور اپنے جہل پر قانع ہو جاتا ہے۔ پس صراط مستقیم پر چلنے کی طلب گاری کے ساتھ محرومی وشقاوت کی ان دونوں صورتوں سے بچنے کی طلب بھی سکھلا دی تا کہ فلاح وسعادت کی راہ کا تصور ہر طرح کامل اور لغزشوں سے محفوظ ہو جائے۔

جہاں تک مذہبی صداقت کا تعلق ہے، دونوں طرح کی محرومیوں کی مثالیں قوموں کی تاریخ میں موجود ہیں۔ کتنی ہی قومیں ہیں جن کے قدم صراط مستقیم پر استوار ہو گئے تھے اور فلاح وسعادت کی تمام نعمتیں ان کے لئے مہیا تھیں۔ بایں ہمہ انہوں نے روگردانی کی اور راہ حق کی معرفت حاصل کر کے پھر اس سے منحرف ہو گئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہی قوم جو کل تک دنیا کی انعام یافتہ جماعت تھی، سب سے زیادہ محروم و نامراد جماعت ہو گئی۔ اسی طرح کتنی ہی جماعتیں ہیں جن کے سامنے فلاح وسعادت کی راہ کھول دی گئی۔ لیکن انہوں نے معرفت کی جگہ جہل اور روشنی کی جگہ تاریکی پسند کی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ راہ حق نہ پاسکے اور نامرادی و محرومی کی وادیوں میں گم ہو گئے۔

احادیث وآثار میں اس کی جو تفسیر بیان کی گئی ہے اس سے یہ حقیقت اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے۔ ترمذی اور احمد وابن حبان وغیرہم کی مشہور حدیث ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ''المغضوب'' یہودی ہیں اور ''الضالین'' نصاری ہیں۔ یقیناً اس تفسیر کا مطلب یہ نہیں ہے ہو سکتا کہ مغضوب سے مقصود صرف یہودی اور گمراہ سے مقصود صرف نصاری ہیں۔ بلکہ مقصود یہ ہے کہ مغضوبیت اور گمراہی کی حالت واضح کرنے کیلئے دو جماعتوں کا ذکر بطور مثال کے کر دیا جائے۔ چنانچہ ان دونوں جماعتوں کی تاریخ میں ہم محرومی کی دونوں حالتوں کا کامل نمونہ دیکھ سکتے ہیں۔ یہودیوں کی قومی تاریخ مغضوبیت کے لئے اور عیسائیوں کی تاریخ گمراہی کے لئے عبرت وتذکیر کا بہترین سرمایہ ہے۔

قرآن کے قصص اور استقراء تاریخی

یہی وجہ ہے ہم دیکھتے ہیں قرآن نے ہدایت وتذکیر امم کے لئے جن اصولوں پر زور دیا ہے ان میں سب سے زیادہ نمایاں اصل پچھلی قوموں کے ایام ووقائع اور ان کے نتائج ہیں۔ وہ کہتا ہیں: کائنات ہستی کے ہر گوشے کی طرح قوموں اور جماعتوں کے لئے بھی خدا کا قانون سعادت وشقاوت ایک ہی ہے اور ہر عہد اور ہر ملک میں ایک ہی طرح کے احکام و نتائج رکھتا ہے۔ اس کے احکام میں کبھی تبدیلی نہیں ہو سکتی اور اس کے نتائج ہمیشہ اور ہر حال میں اٹل ہیں۔ جس طرح سنکھیا کی تاثیر اس لئے بدلی نہیں جا سکتی کہ کہ وہ کس عہد اور کس سنہ میں استعمال کی گئی، اسی طرح قوموں اور جماعتوں کے اعمال کے نتائج بھی اس لئے متغیر نہیں ہو سکتے کہ کس ملک میں پیش آئے۔ اگر ماضی میں ہمیشہ شہد شہد کا خاصہ رکھتا آیا ہے اور سنکھیا کی تاثیر سنکھیا ہی کی رہی ہے تو مستقبل میں بھی شہد شہد ہی رہے گا اور سنکھیا کی تاثیر سنکھیا ہی کی ہو گی۔ پس جو کچھ ماضی میں پیش آ چکا ہے ضروری ہے کہ مستقبل میں بھی پیش آئے۔

سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۝ (۳۳:۶۲)

جو لوگ تم سے پہلے گزر چکے ہیں ان کے لئے اللہ کی سنت یہی رہی ہے (یعنی اللہ کے قوانین واحکام کا دستور یہی رہا ہے) اور اللہ (کی سنت) میں تم کبھی ردوبدل نہیں پاؤ گے۔

فَهَلْ يَنظُرُونَ إِلَّا سُنَّتَ الْأَوَّلِينَ فَلَن تَجِدَ لِسُنَّتِ اللَّهِ تَبْدِيلًا ۖ وَلَن تَجِدَ لِسُنَّتِ اللَّهِ تَحْوِيلًا ○ (۴۳:۳۵)

پھر یہ لوگ کس بات کی راہ تک رہے ہیں؟ کیا اس سنت کی جو اگلے لوگوں کے لئے رہ چکی ہے؟ تو یاد رکھو! تم اللہ کو کبھی بدلتا ہوا نہیں پاؤ گے اور نہ کبھی ایسا ہو سکتا ہے کہ اس کی سنت کے احکام پھیر دیئے جائیں

سُنَّةَ مَن قَدْ أَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِن رُّسُلِنَا ۖ وَلَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِيلًا ○ (۱۷:۷۷)

(اے پیغمبر!) تم سے پہلے جن رسولوں کو ہم نے بھیجا ہے، ان کے لئے ہماری سنت یہی رہی ہے اور ہماری سنت کبھی ٹلنے والی نہیں۔

چنانچہ وہ ایک طرف تو انعام یافتہ جماعتوں کی کامرانیوں کا بار بار ذکر کرتا ہے، دوسری طرف مغضوب اور گمراہ جماعتوں کی محرومیوں کی سرگزشتیں بار بار سناتا ہے۔ پھر جا بجا ان سے عبرت وبصیرت کے نتائج اخذ کرتا ہے جن پر اقوام و جماعات کا عروج وزوال موقوف ہے۔ وہ کھول کھول کر بتلاتا ہے کہ انعام یافتہ جماعتوں کی سعادت وکامرانی ان ان اعمال کا انعام تھی اور مغضوب وگمراہ جماعتوں کی شقاوت ومحرومی ان ان بدعملیوں کی پاداش تھی۔ اچھے نتائج کو "انعام" کہا جاتا ہے، کیونکہ یہ فطرت الٰہی کی قبولیت ہے، برے نتائج کو "غضب" کہتا ہے، کیونکہ یہ قانون الٰہی کی پاداش ہے، وہ کہتا ہے جن اسباب وعلل سے دس مرتبہ ایک خاص طرح کا معلول پیدا ہو چکا ہے، تم کیوں کر انکار کر سکتے ہو کہ گیارھویں مرتبہ بھی ویسا ہی معلول پیدا نہ ہوگا۔

قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِكُمْ سُنَنٌ فَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ

كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ○ (۳:۱۳۷)

تم سے پہلے بھی دنیا میں (خدا کے) احکام وقوانین کے نتائج گزر چکے ہیں۔ پس ملکوں کی سیر کرو اور دیکھو ان لوگوں کا انجام کیا ہوا جنہوں نے (اللہ کے احکام وقوانین کو) جھٹلایا تھا۔

قرآن کی سورتوں میں ایک بڑی تعداد ایسی سورتوں کی ہے جو تمام تر اسی مطلب پر مشتمل ہیں۔ کہا جاسکتا ہے کہ قرآن میں جس قدر بیان بھی پچھلے عہدوں کے وقائع وقصص کا ہے وہ تمام تر سورہ فاتحہ کی اسی آیت کی تفصیل ہے۔

سورہ فاتحہ کی تعلیمی روح

اچھا! اب چند لمحوں کیلیے سورہ فاتحہ کے مطالب پر بحیثیت مجموعی نظر ڈالو اور دیکھو اس کی سات آیتوں کے اندر مذہبی عقائد وتصور کی جو روح مضمر ہے وہ کس طرح کی ذہنیت پیدا کرتی ہے۔ سورہ فاتحہ ایک دعا ہے۔ فرض کرو ایک انسان کے دل وزبان سے شب وروز یہی دعا نکلتی رہتی ہے، اس صورت میں اس کے فکر واعتقاد کا کیا حال ہوگا؟

وہ خدا کی حمد وثنا میں زمزمہ سنج ہے، لیکن اس خدا کی حمد میں نہیں جو نسلوں، قوموں اور مذہبی گروہ بندیوں کا خدا ہے، بلکہ ''رب العالمین'' کی حمد میں جو تمام کائنات خلقت کا پروردگار ہے اور اس لئے نوع انسانی کے لئے یکساں طور پر پروردگاری ورحمت رکھتا ہے۔ پھر وہ اسے اس کی صفتوں کے ساتھ پکارنا چاہتا ہے، لیکن اس کی تمام صفتوں میں سے صرف رحمت اور عدالت ہی کی صفتیں اسے یاد آتی ہیں۔ گویا خدا کی ہستی کی نمود اس کے لئے سرتاسر رحمت وعدالت کی نمود ہے اور جو کچھ بھی اس کی نسبت جانتا ہے وہ رحمت وعدالت کے سوا کچھ نہیں ہے۔ پھر وہ اپنا سر نیاز جھکاتا اور اس کی عبودیت کا اقرار کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے: صرف تیری ہی ایک ذات ہے جس کے آگے بندگی ونیاز کا سر جھک سکتا ہے اور صرف تو ہی ہے جو ہماری ساری درماندگیوں اور احتیاجوں میں مددگاری کا سہارا ہے۔ وہ اپنی عبادت

اور استعانت دونوں کو صرف ایک ہی ذات کے ساتھ وابستہ کر دیتا ہے اور اس طرح دنیا کی ساری قوتوں اور ہر طرح کی انسانی فرماں روائیوں سے بے پروا ہو جاتا ہے۔ اب کسی چوکھٹ پر اس کا سر جھک نہیں سکتا، اب کسی قوت سے وہ ہراساں نہیں ہو سکتا، اب کسی کے آگے اس کا دست طلب دراز نہیں ہو سکتا۔

پھر وہ خدا سے سیدھی راہ چلنے کی توفیق طلب کرتا ہے۔ یہی ایک مدعا ہے جس سے زبان احتیاج آشنا ہوتی ہے، لیکن کون سی سیدھی راہ؟ کسی خاص نسل کی سیدھی راہ؟ کسی خاص قوم کی سیدھی راہ؟ کسی خاص مذہبی حلقے کی سیدھی راہ؟ نہیں، وہ راہ جو دنیا کے مذہبی رہنماؤں اور تمام راست باز انسانوں کی متفقہ راہ ہے، خواہ کسی عہد اور کسی قوم میں ہوئے ہوں۔ اسی طرح وہ محرومی اور گمراہی کی راہوں سے پناہ مانگتا ہے۔ لیکن یہاں بھی کسی خاص نسل و قوم یا کسی خاص مذہبی گروہ کا ذکر نہیں کرتا بلکہ ان راہوں سے بچنا چاہتا ہے جو دنیا کے تمام محروم اور گمراہ انسانوں کی راہیں رہ چکی ہیں۔ گویا جس بات کا طلب گار ہے وہ بھی نوع انسانی کی عالم گیر اچھائی ہے اور جس بات سے وہ پناہ مانگتا ہے وہ بھی نوع انسانی کی عالم گیر برائی ہے۔ نسل، قوم، ملک یا مذہبی گروہ بندی کے تفرقہ و امتیاز کی کوئی پرچھائیں اس کے دل و دماغ پر نظر نہیں آتی۔

غور کرو! مذہبی تصور کی یہ نوعیت انسان کے ذہن و عواطف کے لئے کس طرح کا سانچا مہیا کرتی ہے؟ جس انسان کا دل و دماغ ایسے سانچے میں ڈھل کر نکلے گا وہ کس قسم کا انسان ہوگا؟ کم از کم دو باتوں سے تم انکار نہیں کر سکتے ایک یہ کہ اس کی خدا پرستی خدا کی عالم گیر رحمت و جمال کے تصور کی خدا پرستی ہوگی، دوسری یہ کہ کسی معنی میں بھی نسل و قوم یا گروہ بندیوں کا انسان نہیں ہوگا۔ عالم گیر انسانیت کا انسان ہوگا اور دعوت قرآنی کی اصلی روح یہی ہے۔

حواشی

۱ پہلے ایڈیشن کے ص ۶ ۷ اپر یہ عبارت زیادہ ہے۔ (یعنی حسن و جمال کے اعتراف اور کبریائی اور کمال کے اعتقاد کے ساتھ جو کچھ بھی اور جیسا کچھ بھی کہا جائے) مصحح۔

۲ پہلے ایڈیشن کے ص ۶ ۷ اپر یہ عبارت زیادہ ہے۔ (جس کی پروردگاری کائنات خلقت کے ہر وجود کو زندگی اور بقاء کا سروسامان بخشتی اور پرورش کی ساری ضرورتیں مہیا کرتی رہتی ہے) م

۳ پہلے ایڈیشن میں آیت ۳ کا ترجمہ اس طرح ہے: جو جزاوسزا کے دن کا مالک ہے (اور جس کی عدالت نے ہر کام کیلیے بدلا اور ہر بات کے لئے نتیجہ ٹھہرا دیا ہے) م۔

۴ پہلے ایڈیشن میں یہ عبارت زیادہ ہے۔ (تیرے سوا کوئی معبود نہیں جس کی بندگی کی جائے اور طاقت و بخشش کا کوئی سہارا نہیں جس سے مدد مانگی جائے)۔م

۵ پہلے ایڈیشن میں یہ عبارت زیادہ ہے: اور منزل کا سراغ ان پر گم ہو گیا۔م

۶ امام بخاری اور اصحاب سنن نے ابو سعید بن المعلی سے روایت کی ہے "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ "هی السبع المثانی والقرآن العظيم الذی اوتيته۔اور امام مالک ،ترمذی اور حاکم نے ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ابی بن کعب کو سورہ فاتحہ تلقین کی اور یہی الفاظ فرمائے۔اسی طرح طبری نے حضرت عمر، حضرت علی، حضرت ابن عباس اور ابن مسعود وغیرھم سے روایت کی ہے کہ السبع المثانی فاتحہ الکتاب۔ابن مسعود کی اسناد منقطع ہے، لیکن ابن عباس کی حسن ہے، ابو العالیہ سے بھی ایسا ہی مروی ہے۔اس کے علاوہ ائمہ تا بعین کی ایک بڑی جماعت اسی طرف گئی ہے۔حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں تمام روایات جمع کر دی ہیں۔ (شرح کتاب التفسیر جلد ۸ ص ۱۲۰ طبع اول)

۷ صحیح بخاری ،موطا ، ابوداؤد ،ابن ماجہ اور مسند میں بہ اختلاف الفاظ اس مضمون کی روایت موجود ہیں۔

۸ ابوسعید بن المعلی کی روایت میں جس کی تخریج پچھلے حاشیے میں گزر چکی ہے اسے ''اعظم سورۃ فی القرآن'' فرمایا ہے اور مسند کی روایت ابن جابر میں ''خیر'' کا لفظ ہے (دونوں ایڈیشن میں لفظ ''اخیر'' طبع ہوا ہے جو غلط ہے، مسند ابن حنبل میں عبداللہ بن جابر کی روایت اس طرح ہے۔۔۔ثم قال الا اخبرك يا عبدالله بن جابر بخير سورة في القرآن ج ۴ ص ۱۷۷ ، مصر۔ م)

۹ پہلے ایڈیشن میں یہ حدیث نہیں ہے۔ م

۱۰ پہلے ایڈیشن میں یہ عنوان نہیں ہے۔ م

۱۱ پہلے ایڈیشن میں یہ عنوان نہیں ہے۔ م

۱۲ پہلے ایڈیشن میں فقرہ ذیل زیادہ ہے:

خداپرستی انسانی فطرت کا خمیر ہے، اس لئے خداپرستی کی کوئی سچی بات انسان کے لئے انوکھی بات ہو ہی نہیں سکتی اس کی فطرت کے لئے سب سے زیادہ جانی بوجھی ہوئی بات یہی ہے کہ خالق کائنات کا اقرار کرے۔ پس سورہ فاتحہ کی ندرت محض اس کے معانی میں نہیں بلکہ معانی کی تعبیر میں ڈھونڈنی چاہیے۔ خداپرستی کا جوش انسان میں پہلے سے موجود تھا، اس کی ربوبیت اور رحمت کے جلوے کبھی اس کی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہوئے۔ جزا وسزا کا اعتقاد سمندروں اور پہاڑوں سے بھی زیادہ پرانا ہے۔ ٹیڑھے راستے سے بچنے سیدھی راہ چلنے کی طلب نہ صرف انسان میں بلکہ کیڑوں مکوڑوں تک میں موجود ہے۔ انسان اپنی معیشت کے کسی عہد میں بھی اس درجہ مسخ نہیں ہوا کہ ان وجدانی تصورات سے اس کا ذہن خالی ہو گیا ہو لیکن اس کی محرومی یہ تھی کہ اپنے وجدان کی ٹھیک ٹھیک تعبیر نہیں کر سکتا تھا۔ وہ خدا کی ربوبیت محسوس کر رہا تھا، لیکن اسے ''رب'' کہہ کر پکارنا نہیں جانتا تھا اس کی رحمت کے جلوے ہر آن اس کے سامنے تھے لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ اپنے دل کا احساس کیونکر لفظوں اور ناموں میں ادا کر دے۔ جزا اور سزا اس کے دل کے ایک ایک ریشے کا اعتقاد تھا لیکن اسے معلوم نہ تھا کہ اس کی صحیح تعبیر کیا ہے۔ ہدایت کی طلب اور گمراہی سے گریز تو عقل حیوانی کا فطری خاصہ ہے، لیکن

انسان کی ساری درماندگی یہ تھی کہ اس بات کی زیادہ سے زیادہ طلب رکھنے پر بھی طلب گاری کی راہ سے آشنا نہ تھا (ص ۴۔۵) م۔

۱۳۔ پہلے ایڈیشن میں یہ فقرہ اس طرح ہے:

پھر حمد کے بعد صفات الٰہی میں سے ربوبیت اور رحمت کا ذکر کیا ہے اور اس طرح نوع انسانی کی اس عالم گیر غلطی کا ازالہ کر دیا ہے۔ کہ خدا کو صرف اس کی صفات قہر و جلال ہی میں دیکھتی تھی ،اس کی رحمت و جمال کی تماشائی نہ تھی۔ اس اسلوب بیان نے واضح کر دیا کہ خدا کا صحیح تصور وہی ہو سکتا ہے جو سر تا سر حسن و جمال اور رحمت و محبت کا تصور ہو (ص ۶) م۔

۱۴۔ یعنی ''خدایا! ایسا کر کہ تیری ہستی میں ہمارا تحیر بڑھتا رہے'' کیونکہ یہاں تحیر جہل کا نہیں بلکہ معرفت کا نتیجہ ہے (پہلے ایڈیشن میں یہ عربی شعر بھی ہے:

زدنی بفرط الحب فیك تحیرا

و ارحم حشا بلظی هو اك تسعرا م

۱۵۔ ''اللہ کی طرح ــــــ خبر دیتا ہے'' یہ فقرہ پہلے ایڈیشن میں نہیں ہے۔م

۱۶۔ مفردات راغب اصفہانی

۱۷۔ (Naked eye) غیر مسلح آنکھ، یعنی ایسی آنکھ جو قدرتی نگاہ سے دیکھ رہی ہو، زیادہ قوت کے ساتھ دیکھنے کا کوئی آلہ مثلاً خوردبین اس کے ساتھ نہ ہو۔

۱۸۔ انسان میں ماں کی محبت بلوغ کے بعد بھی بدستور باقی رہتی ہے اور بعض حالتوں میں اس کے انفعالات اتنے شدید ہوتے ہیں کہ عہد طفولیت کی محبت میں اور اس محبت میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا، لیکن یہ صورت حال غالباً انسان کی مدنی و عقلی زندگی کے نشو و نما کا نتیجہ ہے ،نہ کہ فطرت حیوانی کا۔ ابتدائی انسان میں بھی یہ علاقہ فطرتاً اس حد تک ہوگا کہ بچہ سن تمیز تک پہنچ جائے، لیکن بعد کو نسل و خاندان کی تشکیل اور اجتماعی احساسات کی ترقی سے مادری رشتہ ایک دائمی رشتہ بن گیا۔

۱۹۔ یہ حاشیہ پہلے ایڈیشن میں ہے ص ۲۴ لیکن دوسرے میں نہیں ہے۔ م
یہی حقیقت ہے جسے آج علمی مصطلحات میں یوں ادا کیا جاتا ہے۔

From the motion of the electrons round the positively charged nucleus of an atom to the motion of the planets round the sun, and so forth, every thing points only to the one conclusion, viz predetermined law.sir oliver Lodge.

اس کی مزید تشریح اپنے مقام پر آئے گی۔ جس حقیقت کو یہاں "Predetermined law" سے تعبیر کیا گیا ہے اسی کو قرآن "تخلیق بالحق" سے تعبیر کرتا ہے۔

۲۰۔ یہ حاشیہ پہلے ایڈیشن میں ہے ص ۲۴ لیکن دوسرے میں نہیں ہے۔ م
یہ تعبیر اسلئے اختیار کی گئی کہ نزول قرآن سے پہلے تمام پیروان مذاہب نے دنیا کی پیدائش کا جو نقشہ کھینچا تھا وہ حکمت ومصالح کے تصور سے یک قلم خالی تھا۔ لوگ خیال کرتے تھے کہ طاقت واختیار کے ساتھ حکم ومصالح کی رعایت جمع نہیں ہوسکتی۔ حکم ومصالح کی پابندی وہی کرے گا جو کسی کے آگے جواب دہ ہو۔ خدا جو سب سے بڑا اور سب پر حکمراں ہے اس کے کام حکم ومصالح سے کیوں وابستہ ہوں۔ وہ مطلق العنان بادشاہوں کو دیکھتے تھے جو جی میں آتا ہے کر گزرتے ہیں اور ان کے کاموں میں چون وچرا کی گنجائش نہیں ہوتی۔ پس سمجھتے تھے کہ خدا کے کاموں کا بھی یہی حال ہے۔ چنانچہ ہندوستان، مصر، بابل اور یونان کی تمام علم الاصنامی روایات اسی تخیل کا نتیجہ ہیں۔ دیوتاؤں نے عشق بازی میں رنگ رلیاں منائیں اور ستارے پیدا ہو گئے۔ کسی دیوتا نے شکار کھیلتے ہوئے تیر مارا پہاڑ پیدا ہو گیا۔ ایک دیوتا نے جٹا کھول دی دریا وجود میں آ گیا۔ اصنام پرست اقوام کے علاوہ یہودیوں اور عیسائیوں کے خیالات بھی اس بارے میں عقلی تصورات سے خالی تھے۔ یہودیوں کا خیال تھا کہ ایک مطلق العنان اور مستبد بادشاہ کی طرح خدا کے افعال بھی حکم ومصالح کی جگہ محض جوش وہیجان کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ وہ غصے میں آکر قوموں کو ہلاک کر دیتا ہے اور جوش محبت میں آکر کسی خاص قوم کو اپنی چہیتی قوم بنا لیتا ہے۔

بلاشبہ عیسائی تصور کا مایہ خمیر رحم ومحبت ہے لیکن حکم ومصالح کے لئے اس میں بھی جگہ نہ تھی۔ کفارہ کے اعتقاد کے ساتھ حکم ومصالح کا اعتقاد نشوونما نہیں پا سکتا تھا۔ قرآن تاریخ مذاہب

میں پہلی کتاب ہے جس نے خدا کی صفات و افعال کیلئے عقلی تصور قائم کیا اور یہ حقیقت واضح کی کہ حکم و مصالح کی رعایت منافی نہیں ہے، بلکہ محاسن قدرت میں ہے بلاشبہ خدا جو کچھ چاہے کر سکتا ہے، لیکن اس کی حکمت و عدالت کا مقتضی یہی ہے کہ جو کچھ کرتا ہے، حکمت و مصلحت کے ساتھ کرتا ہے۔

اسی اصل کا نتیجہ ہے اس نے تخلیق کائنات کا بھی جو نقشہ کھینچا، وہ سرتاسر عقلی نقشہ ہے۔ اسی لئے اس نے جا بجا "تخلیق بالباطل" کے خیال کو کفر کی طرف نسبت دی ہے۔ وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا ۔ ذٰلِكَ ظَنُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا (۳۸:۲۷) ہم نے آسمان و زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، بغیر حکمت و مصلحت کے نہیں بنایا ہے یہ خیال کہ ہم نے بغیر حکمت و مصلحت کے پیدا کیا، ان لوگوں کا گمان ہے جنہوں نے کفر کا شیوہ اختیار کیا۔

۲۱ آیت کے آخری حصے کا ترجمہ چھوٹ گیا تھا جو قوسین میں لکھ دیا گیا ہے۔ م

۲۲ "قل" کا ترجمہ چھوٹ گیا تھا جو قوسین میں لکھ دیا گیا ہے۔ م

۲۳ اس موقع پر یہ اصل پیش نظر رکھنی چاہئے کہ جس طرح کائنات کی ہر چیز نظر و اعتبار کے مختلف پہلو رکھتی ہے اسی طرح قرآن کا استشہاد بھی بیک وقت مختلف پہلوؤں سے تعلق رکھتا ہے، البتہ خصوصیت کے ساتھ زور کسی ایک ہی پہلو کے لئے ہوتا ہے۔ مثلاً شہد کی پیدائش اور شہد کی مکھی کے اعمال کے مختلف پہلو ہیں ۔ یہ بات کہ ایک نہایت مفید اور لذیذ غذا پیدا ہو جاتی ہے، ربوبیت ہے۔ یہ بات کہ ایک حقیر سا جانور اس دانش مندی و دقت کے ساتھ یہ کام انجام دیتا ہے، ذہن و ادراک کی بخشش کا عجیب و غریب منظر ہے اور اس لئے حکمت و قدرت کا پہلو رکھتا ہے۔ ان آیات کا سیاق و سباق بتلاتا ہے کہ یہاں زیادہ تر توجہ ربوبیت پر دلائی گئی ہے، لیکن ساتھ ہی حکمت و قدرت کے پہلوؤں پر بھی روشنی پڑ رہی ہے۔ اسی طرح اکثر مقامات میں ربوبیت، رحمت اور قدرت کے مشترک مظاہر بیان کیے گئے ہیں لیکن خصوصیت کے ساتھ زور کسی ایک ہی پہلو پر ہے۔

۲۴ "فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ" کا ترجمہ چھوٹ گیا تھا جو قوسین میں لکھ دیا گیا ہے۔ م

۲۵ پہلے ایڈیشن میں یہ جملہ زیادہ ہے: فعلی ظہور ان کے لئے ضروری نہیں ہوتا (ص ۳۹) م
۲۶ پہلے ایڈیشن میں یہ جملہ زیادہ ہے: اور اپنا فعلی ظہور بھی رکھتے ہیں (ص ۳۹) م۔
۲۷ ''قل'' کا ترجمہ چھوٹ گیا تھا جو قوسین میں لکھ دیا گیا ہے۔ م
۲۸ اس آیت میں اور اس کی تمام ہم معنی آیات میں ''سخر'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، یعنی تمام چیزیں تمہارے لئے مسخر کر دی ہیں ''تسخیر'' ٹھیک ٹھیک اسی معنی میں بولا جاتا ہے جس معنی میں ہم اردو میں بولا کرتے ہیں، یعنی کسی چیز کا قہراً وحکماً اس طرح مطیع ہو جانا کہ جس طرح چاہیں اس سے کام لیں۔ غور کرو! انسانی قوی کی عظمت وسروری کے اظہار کے لئے اس سے زیادہ موزوں تعبیر اور کیا ہو سکتی تھی؟ قرآن کے نزول سے پہلے اقوام عالم کی دینی ذہنیت انسان کی عقلی امنگوں کے قطعاً خلاف تھی۔ لیکن قرآن نے صرف یہی نہیں کیا کہ اس کی عقلی امنگوں کی جرأت افزائی کر دی، بلکہ اس کی ہمت اور اولوالعزمی علم کیلئے ایک ایسی بلند نظری کا نقشہ کھینچ دیا جس سے بہتر نقشہ آج بھی نہیں کھینچا جا سکتا۔ آسمان اور زمین میں جو کچھ ہے سب اس لئے ہے کہ انسان کے آگے مسخر ہو کر رہے اور انسان ان میں تصرف کرے۔ انسانی عقل وفکر کے لئے اس سے زیادہ بلند نصب العین اور کیا ہو سکتا ہے؟

پھر غور کرو ''تسخیر'' کا لفظ انسان کی حکمرانیوں کے لئے کس درجہ موزوں لفظ ہے؟ اس تسخیر کا قدیم منظر یہ تھا کہ انسان کا چھوٹا سا بچہ لکڑی کے دو گز تختے جوڑ کر سمندر کے سینے پر سوار ہو جاتا تھا اور نیا منظر یہ ہے کہ آگ، پانی، ہوا، بجلی تمام عناصر پر حکمرانی کر رہا ہے۔

البتہ یہ بات یاد رہے کہ قرآن نے جہاں کہیں اس تسخیر کا ذکر کیا ہے اس کا تعلق صرف کرہ ارضی کی کائنات سے ہے یا آسمان کے ان موثرات سے ہے جنہیں ہم یہاں محسوس کر رہے ہیں۔ یہ نہیں کہا ہے تمام موجودات ہستی اس کے لئے مسخر کر دی گئی ہیں۔ یا تمام موجودات ہستی میں وہ اشرف واعلیٰ مخلوق ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ ہماری دنیا کائنات ہستی کے بے کنار سمندر میں ایک قطرے سے زیادہ نہیں وما یعلم جنود ربک الا ھو (۳۱:۷۴) اور انسان کو جو کچھ بھی برتری حاصل ہے وہ صرف اس دنیا کی مخلوقات میں ہے۔

۲۹ "لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ" کا ترجمہ چھوٹ گیا تھا جو قوسین میں لکھ دیا گیا ہے۔م

۳۰ "اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا" کا ترجمہ چھوٹ گیا تھا جو قوسین میں لکھ دیا گیا ہے۔م

۳۱ "وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ" کا ترجمہ چھوٹ گیا تھا جو قوسین میں لکھ دیا گیا ہے۔م

۳۲ قرآن حکیم نے آخرت کے وجود کا جن جن دلائل سے اذعان پیدا کیا ہے ان میں سے ایک یہ بھی ہے۔ وہ کہتا ہے: دنیا میں ہر چیز اپنا کوئی نہ کوئی متقابل وجود یا مثنیٰ ضرور رکھتی ہے، پس ضروری ہے کہ دنیوی زندگی کے لئے بھی کوئی متقابل اور مثنیٰ زندگی ہو۔ دنیوی زندگی کی متقابل زندگی آخرت کی زندگی ہے۔ چنانچہ بعض سورتوں میں انہیں متقابل مظاہرات سے استشہاد کیا ہے۔ مثلاً سورہ والشمس میں فرمایا: وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا۔ وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰهَا۔ وَالنَّهَارِ اِذَا جَلّٰهَا۔ وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰهَا۔ وَالسَّمَآءِ وَمَا بَنٰهَا۔ وَالْاَرْضِ وَمَا طَحٰهَا۔ الخ (۹۱:۱۔۶)

۳۳ "لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ" کا ترجمہ چھوٹ گیا تھا جو قوسین میں لکھ دیا گیا ہے۔م

۳۴ یعنی حواء۔ مصحح (طبع دوم۔م)

۳۵ یعنی آدم اور حواء کی نسل ہے، مصحح (طبع دوم۔م)

۳۶ وَلَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ کا ترجمہ چھوٹ گیا تھا جو قوسین میں لکھ دیا گیا ہے۔م

۳۷ پہلے ایڈیشن میں حسب ذیل فقرات زیادہ ہیں۔

چنانچہ سورہ بقرہ میں جہاں تحویل قبلہ کے معاملے کا ذکر کیا ہے وہاں اہل کتاب کی متعصبانہ مخالفتوں کی طرف اشارہ کر کے فرمایا: اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ۝ (۲:۱۴۷) یہ (یعنی تحویل قبلہ کا معاملہ) تمہارے پروردگار کی طرف سے ایک امر حق ہے۔ پس دیکھو ایسا نہ ہو کہ تم شک کرنے والوں میں سے ہو جاؤ۔ چنانچہ عام مفسرین کی نظر اس اصل پر نہ تھی، اس لئے اس خطاب کا صحیح محل متعین نہ کر سکے اور "فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ" کا مطلب یہ سمجھا گیا کہ اس معاملے کے خدا کی طرف سے ہونے میں شک نہ کرو، حالانکہ داعی اسلام کا قلب جو خود محل وحی تھا اس بارے میں شک کا محل کیونکر ہو سکتا تھا دراصل اس خطاب

کا مقصد ہی دوسرا ہے۔ تحویل قبلہ کے معاملے میں کمزور اور بے سروسامان مسلمانوں کے ایمان کے لئے بہت بڑی آزمائش تھی۔ مٹھی بھر مظلوم و مقہور انسانوں کی جماعت نے دنیا کی دو سب سے بڑی مذہبی قوتوں کے قبلوں کے خلاف اپنا ایک نیا قبلہ مقرر کیا تھا اور یروشلم کا عظیم الشان اور صدیوں مسلمہ کا ہیکل چھوڑ کر ریگستان عرب کے ایک گمنام اور بے شان و شوکت معبد کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ ایسی حالت میں کون امید کر سکتا تھا کہ یہ بے باکانہ جرات کامیاب ہو سکے گی اور دنیا کی قوموں کا رخ اچانک پھر جائے گا۔ یہی حقیقت ہے جس کی طرف ان لفظوں میں اشارہ کیا گیا ہے کہ "وَاِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً اِلَّا عَلَى الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ۔ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ (۲:۱۴۳) پس ضرورت تھی کہ کمزور دلوں کی تقویت کے لئے واضح کر دیا جائے کہ یہ معاملہ کتنی ہی بے سروسامانیوں کے ساتھ ظہور میں آیا ہو اور ناکامیابی کے اسباب بظاہر کتنے ہی قوی نظر آتے ہوں۔ تاہم کامیابی و فتح مندی اسی کیلئے ہے اور اس کا نتیجہ ہر طرح کے شک و شبہ سے پاک ہے، کیونکہ یہ اللہ کی طرف سے ٹھہرایا ہوا "امر حق" ہے اور جو حق ہو وہ قائم و باقی رہنے کے لئے ہوتا ہے، مٹنے کے لئے نہیں ہوتا۔ ہر چیز جو اس سے مقابل ہوگی اور اس کی راہ روکے گی محو اور فنا ہو جائے گی۔ اسی طرح سورہ آل عمران میں جہاں الوہیت مسیح کے اعتقاد کا رد کیا ہے فرمایا: اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ○ (۲:۱۴۷) یہ تمہارے پروردگار کی طرف سے امر حق ہے۔ پس دیکھو! ایسا نہ ہو کہ تم شک کرنے والوں میں سے ہو جاؤ۔

الوہیت مسیح کا اعتقاد مسیحی کلیسا کا بنیادی اعتقاد بن گیا تھا اور اس قوت و وسعت کے ساتھ دنیا میں اس کی منادی کی گئی تھی کہ اب اس کے خلاف کسی دعوت کا کامیاب ہونا تقریباً محال معلوم ہوتا تھا۔ خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ اس دعوت کے پیچھے ایک نوزائیدہ اور بے سروسامان جماعت کے سوا کوئی طاقت و شوکت نظر نہ آتی ہو۔ فرمایا "اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ "الوہیت مسیح کے باطل اعتقاد نے کتنی ہی عظمت و وسعت حاصل کر لی ہو، لیکن عبدیت مسیح کی ثبوت ایک امر حق ہے اور اس لئے جب کبھی "حق" اور "باطل" میں مقابلہ ہوگا، تو بقاء و ثبات حق ہی کے

لئے ہوگا، باطل کے لئے نہیں ہوگا۔ باطل کا تو خاصہ ہی یہی ہے کہ وہ مٹ جانے والی چیز ہوتی ہے۔ سردست یہ دعوت کتنی ہی کمزور معلوم ہوتی ہو، لیکن وہ وقت دور نہیں جب یہ اپنی فتح مندی کا علم بلند کر دے گی۔

اسی طرح ''الحق'' کے تمام مقامات استعمال پر غور کرنا چاہیے (ص ۷۱،۷۲) م

۳۸ یہ فقرہ ''مثلاً فطرت۔۔۔۔ انتظار کیا جائے'' پہلے ایڈیشن میں نہیں ہے۔م

۳۹ "و لینصرن اللہ ـــ لقوی عزیز" اس حصہ کا ترجمہ چھوٹ گیا تھا جو قوسین میں لکھ دیا گیا ہے۔م

۴۰ ''قل'' کا ترجمہ چھوٹ گیا تھا جو قوسین میں لکھ دیا گیا ہے۔م

۴۱ (کتاب البر والصلة، باب فضل عیادة المریض۔م)

۴۲ طبرانی وابن جریر، سند صحیح۔

۴۳ امام احمد نے مسند میں، ترمذی اور ابوداؤد نے صحیح میں اور حاکم نے مستدرک میں ابن عمر سے روایت کی ہے۔ ورو ینا مسلسلا من طریق الشیخ محمود شکری الا لوسی العراقی و ایضا عن والدی المرحوم عن الشیخ صدر الدین الدھلوی من طریق الشیخ احمد ولی اللہ رحمھم اللہ (ترمذی ،ابواب البر والصلة باب ما جاء فی رحمة المسلمین،میں یہ حدیث اس طرح ھے۔ الراحمون یر حمھم الرحمن ،ارحموا من فی الارض یرحمکم من فی السماء،الر حم شجنة من الرحمن فمن وصلھا وصله اللہ ومن قطعھا قطعه اللہ۔م)

۴۴ رواہ البخاری فی الا دب المفرد [(باب رحمة البھا ئم (۱۷۶)حدیث (۳۸۱)والطبر انی عن ابی اما مة و صححه السیوطی فی الجامع الصغیر (المجلد الثانی (من رحم)]

۴۵ ''یعنی خدا نے آدم میں۔۔۔۔۔ عالم زد'' یہ عبارت پہلے ایڈیشن میں نہیں ہے۔م

۴۶ پہلے ایڈیشن سے اضافہ کیا گیا ہے، دوسرے ایڈیشن میں کاتب سے چھوٹ گیا تھا۔م

۴۷ شاید انسانی گمراہی کی بوالعجبیوں کی اس سے بہتر مثال نہیں مل سکتی کہ جس انجیل کی تعلیم کا یہ مطلب سمجھ لیا گیا تھا کہ وہ کسی حال میں بدلا لینے اور سزا دینے کی اجازت نہیں دیتی، اسی انجیل کے پیروؤں نے نوع انسانی کی تعذیب وہلاکت کا عمل ایسی وحشت و بے رحمی کے ساتھ صدیوں تک جاری رکھا کہ آج ہم اس کا تصور بھی بغیر وحشت وہراس کے نہیں کر سکتے اور پھر یہ جو کچھ کیا گیا انجیل اور اس کے مقدس معلم کے نام پر کیا گیا۔

۴۸ پہلے ایڈیشن میں یہ فقرہ زیادہ ہے: سب کو جواب میں کہنا پڑا ''وہ جسے زیادہ رقم معاف کر دی گئی'' ص ۹۰۔م

۴۹ پہلے ایڈیشن (ص ۹۰) میں یہ آیت بھی ہے۔

وَقَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ (۳۴: ۱۳)م

۵۰ وایضا عن انس قال رسول الله صلى الله عليه وسلم والذى نفسى بيده لواخطاتم حتى تملا خطايا كم بين السماء والاض ثم استغفرتم الله يغفرلكم۔والذى نفسى بيده لو لم تخطوء الجاء الله بقوم يخطوء ن ثم يستغفرون فيغفرلهم۔اخرجه احمد و ابو يعلى باسناد رجاله ثقات ۔وعن ابن عمر مرفوعا :لو لم تذنبوا لخلق الله خلقا يذنبون ثم يغفرلهم۔ اخرجه احمد والبزار و رجاله ثقات ۔ واخرج البزار من حديث ابى سعيد نحو حديث ابى هريرة فى الصحيح، وفى اسناده يحيى بن بكير وهو ضعيف۔

۵۱ پہلے ایڈیشن ص ۹۲ میں یہ فقرہ نہیں ہے۔

''پھر اس پہلو پر بھی نظر رکھے۔۔۔۔۔۔عفو و درگزر کی راہ اختیار کرتے ہیں''۔م

۵۲ پہلے ایڈیشن ص ۹۴ میں یہ جملہ بھی ہے:

''سورہ انفال کے مقدمے میں ہم قرآن کے احکام جنگ پر نظر ڈالیں گے اور اس سلسلے میں مبحث کے اس پہلو پر بھی روشنی پڑ جائے گی''۔م

۵۳ ''سامی زبانوں کا۔۔۔۔۔مرتب کی تھی'' یہ فقرہ پہلے ایڈیشن میں نہیں ہے۔م

۵۴ اسی طرح لکھا ہے، لیکن ہونا یوں چاہئے:

اصحاب دوزخ اور اصحاب جنت الخ۔م

۵۵ (صحیح مسلم، کتاب البر والصلة والا داب، باب تحریم الظلم۔م)

۵۶ پہلے ایڈیشن میں یہ فقرہ بھی ہے:

اگر یوں "ملک یوم الدین" کی جگہ کوئی ایسی صفت نمودار ہوتی جو صفات سلب وقہر پر دلالت کرتی تو ظاہر ہے کہ یہ حقیقت واضح نہ ہوتی اور خدا کا تصور قہر وغضب سے آلودہ ہو جاتا (ص ۹۹)۔م

۵۷ اَلَّا تَطْغَوْا فِی الْمِیْزَان کا ترجمہ چھوٹ گیا تھا جو قوسین میں لکھ دیا گیا ہے۔م

۵۸ پہلے ایڈیشن میں یہ فقرہ بھی ہے:

یہی وجہ ہے کہ علم الاجتماع کے مفکرین خصوصیت کے ساتھ اس پہلو پر زور دیتے ہیں وہ کہتے ہیں کسی جماعت کی ذہنی و اخلاقی رفتار ترقی معلوم کرنے کے لئے سب سے پہلے اس بات کا سراغ لگاؤ کہ اس نے اپنے خدا کو کس شکل و شباہت میں دیکھا تھا۔ اسی شکل و شباہت میں تمہیں خود اس جماعت کے ذہن و اخلاق کی صورت نظر آجائے گی (ص ۱۰۳)۔م

۵۹ پہلے ایڈیشن میں یہ فقرہ اس طرح ہے:

ایسا معلوم ہوتا ہے گویا انسان کے مادی تصورات کی طرح اس کے خدا پرستانہ تصور میں بھی ایک طرح کے تدریجی ارتقاء کا سلسلہ جاری رہا اور بتدریج ادنیٰ سے اعلیٰ اور پستی سے بلندی کی طرف ترقی ہوتی رہی۔ بلاشبہ یہ مشکل ہے کہ ہم اس سلسلے کی سب سے ابتدائی کڑیاں متعین کر سکیں، کیونکہ جس قدر ماضی کی طرف بڑھتے ہیں تاریخ کی روشنی دھندلی پڑ جاتی ہے اور وحی و نبوت کی زبانیں بھی تفصیلات سے خاموش ہیں۔ تاہم اقوام و جماعت کے مختلف عہد ہمارے سامنے ہیں اور ان سے اس سلسلے کی مختلف کڑیاں بہم پہنچائی جاسکتی ہیں۔ اگر یہ تمام کڑیاں تاریخی ترتیب کے ساتھ یک جا کر دی جائیں تو صاف نظر آجائے کہ اس سلسلے کی سب سے آخری اور اس لئے سب سے زیادہ ترقی یافتہ کڑی وہی ہے جو قرآن نے نوع انسانی کے

سامنے پیش کی ہے۔

لیکن یاد رہے یہاں خدا کے تصور سے مقصود اس کی صفات کا تصور ہے، اس کی ہستی کا اعتقاد نہیں ہے۔ (ص ۱۰۳، ۱۰۴) ۔م

۶۰۔ دی اوریجن اینڈ گروتھ آف ریلیجن ص ۸۔ (The origin and growth of religio)

۶۱۔ ایضاً۔ ص ۲۶۲۔

۶۲۔ ''مردہ کی کتاب'' قدیم مصری تصورات کا سب سے زیادہ مرتب اور منضبط نوشتہ ہے۔ مصریات کے مشہور محقق ڈاکٹر بج (Budge) کی رائے میں یہ سب سے زیادہ قدیم فکری مواد ہے جو مصری آثار نے ہمارے حوالے کیا ہے۔ یہ خود اتنی ہی پرانی ہے جتنا پرانا مصری تمدن ہے۔ لیکن جو تصورات اس میں جمع کئے گئے ہیں وہ مصری تمدن سے بھی زیادہ قدیم ہیں۔ وہ اتنے قدیم ہیں کہ ہم ان کی قدامت کی کوئی تاریخ معین نہیں کر سکتے۔ اس نوشتے میں اوسریز کے دو صفات ہمیں ملتے ہیں۔ معبود اعظم، الخیر، ازلی بادشاہ، آخرت کا مالک۔

۶۳۔ پہلے ایڈیشن میں اس جملے کی جگہ حسب ذیل جملہ ہے:

بہر حال انسان کے تمام تصورات کی طرح صفات الٰہی کا تصور بھی اس کی ذہنی و معنوی ترقی کے ساتھ ساتھ ترقی کرتا رہا ہے۔ (ص ۱۰۵) ۔م

۶۴۔ ''تجسم'' سے مقصود یہ ہے کہ خدا کی نسبت ایسا تصور قائم کرنا کہ وہ مخلوق کی طرح جسم و صورت رکھتا ہے۔ ''تشبیہ'' سے مقصود یہ ہے کہ ایسی صفات تجویز کرنی جو مخلوقات کی صفات سے مشابہ ہوں۔ ''تنزیہ'' سے مقصود یہ ہے کہ ان تمام باتوں سے جو اسے مخلوقات سے مشابہ کرتی ہوں، اسے مبرا یقین کرنا۔ انگریزی میں تجسم کیلئے ان تھرو پومارفزم (Anthropomorphism) اور شبہ کے لئے ان تھرو پوفیوازم (Anthropophuism) کی مصطلحات استعمال کرتے ہیں۔

۶۵۔ پہلے ایڈیشن میں یہ جملہ بھی ہے:

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ انسان کے بچے ہوں یا حیوان کے ڈرتے زیادہ ہیں اور انس دیر میں پکڑتے ہیں۔ پہلا اثر جو وہ قبول کریں گے خوف کا ہوگا، انس و محبت کا نہ ہوگا۔ (ص ۱۰۶) ۔م

۶۶ے پہلے ایڈیشن میں اسلام سے پہلے کے صرف چار دینی تصورات کا ذکر ہے۔یعنی اس میں چینی تصور مذکور نہیں ہے۔

اس کے علاوہ چار دینی تصورات کا ذکر بھی مختصر ہے اور اس کا انداز بیان کچھ بدلا ہوا ہے جو ص ۱۰۷ سے ۱۲۱ تک پھیلا ہوا ہے اور درج ذیل ہے۔

ہندوستانی تصور میں سب سے پہلے اپنشدوں کا فلسفہ الٰہی نمایاں ہوتا ہے۔اپ شدوں کے مطالب کی نوعیت کے بارے میں زمانہ حال کے شارحوں اور نقادوں کی آرائیں متفق نہیں ہیں[1]۔

تاہم ایک بات بالکل واضح ہے۔یعنی اپنشد مسئلہ وحدۃ الوجود کا سب سے قدیم سرچشمہ ہیں اور گیتا کا زمانہ تصنیف کچھ ہی کیوں نہ ہو،لیکن وہ بھی اپنشد ہی کی صداؤں کی بازگشت ہے۔ مسئلہ وحدۃ الوجود خدا کی ہستی وصفات کا جو تصور پیدا کرتا ہے اس کی نوعیت کچھ عجیب طرح کی واقع ہوئی ہے۔ایک طرف تو وہ ہر وجود کو خدا قرار دیتا ہے،کیونکہ وجود حقیقی کے علاوہ اور کوئی وجود موجود ہی نہیں۔دوسری طرف خدا کے لئے کوئی محدود اور مقید تخیل بھی قائم نہیں کرتا۔بہر حال جو کچھ بھی ہو یہ تصور اپنی نوعیت میں اس درجہ فلسفیانہ قسم کا تھا کہ کسی عہد اور ملک میں بھی عامتہ الناس کا عقیدہ نہ بن سکا۔خود ہندوستان میں بھی اس کی حیثیت فلسفہ الٰہیات کے ایک مذہب (اسکول) سے زیادہ نہیں رہی۔بہترین تعبیر جو اس صورت حال کی کی گئی ہے یہ کہ عوام کے لئے اصنام پرستی قرار دی گئی تھی اور خواص کے لئے وحدۃ الوجود کا اعتقاد تھا۔

---

[1] اپنشدوں کے متعلق ہماری جس قدر بھی معلومات ہیں تمام مستشرقین یورپ کی تحقیقات سے ماخوذ ہیں۔ مسٹر گف (Gough) کی رائے میں اپنشد روحانیت سے خالی ہیں لیکن پال ڈیوسن (Paul Deussen) میکس ملر (Max-Muller) اور نائٹ (Knight) انہیں روحانیت کا سرچشمہ کہتے ہیں۔مشہور جرمن حکیم شوپن ہار (Schopenhauer) تو اس درجہ معترف ہوا کہ اس کا یہ جملہ مشہور ہوگیا ہے:''اپنشد زندگی بھر میری تشفی کرتے رہے اور دم آخر بھی مجھے انہیں سے تشفی ملے گی''۔

اپنشدوں کے بعد بدھ مذہب کی تعلیم نمایاں ہوتی ہے اور ظہور قرآن کے وقت ہندستان کا عام مذہب یہی تھا۔ بدھ مذہب کی بھی مختلف تفسیریں کی گئی ہیں۔ مستشرقین کا ایک گروہ اسے اپنشدوں کی تعلیم ہی کی ایک عملی شکل قرار دیتا ہے اور کہتا ہے ''نروان'' میں جذب و انفصال کا عقیدہ پوشیدہ ہے، یعنی سرچشمہ الوہیت سے ہستی انسانی نکلی ہے پھر اسی میں داخل ہو جانا ''نروان'' ہے۔ لیکن دوسرا گروہ اس سے انکار کرتا ہے۔ اس گروہ کی رائے میں بدھ مذہب خدا کی ہستی کا کوئی تصور ہی نہیں رکھتا۔ وہ دنیا کا تنہا مذہب ہے۔ جس نے فلسفیانہ عقائد کو مذہب کا جامہ پہنا دیا۔ وہ صرف ''پراکرتی'' یعنی مادہ ازلی کا ذکر کرتا ہے جسے طبیعت اور نفس حرکت میں لاتے ہیں۔ ''نروان'' سے مقصود یہ ہے کہ ہستی کی انانیت فنا ہو جائے اور زندگی کے عذاب سے چھٹکارا مل جائے۔ ہم جب ان تصریحات کا مطالبہ کرتے ہیں جو براہ راست گوتم بدھ کی طرف منسوب ہیں تو ہمیں دوسری تفسیر ہی زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔

جہاں تک فطرت کائنات کی صفات کا تعلق ہے، گوتم بدھ دنیا میں درد و اذیت کے سوا کچھ نہیں دیکھتا۔ زندگی اس کے نزدیک سرتا سر عذاب ہے۔ وہ کہتا ہے زندگی کی بڑی اذیتیں چار ہیں۔ پیدائش، بڑھاپا، بیماری، موت۔ اور نجات کی راہ ''اشٹانگ مارگ'' ہے یعنی آٹھ راہوں کا سفر۔ ان آٹھ عملوں سے مقصود علم صحیح، رحم و شفقت، قربانی، ہوا و ہوس سے آزادی اور انانیت فنا کر دینا ہے۔[۲]

عملی نقطہ خیال سے بدھ مذہب کی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے تعزیر و سزا کی جگہ سرتا سر رحم و ہمدردی پر زور دیا۔ ''کسی جاندار کو دکھ نہ پہنچاؤ'' اس کی بنیادی تعلیم ہے۔

مجوسی کے تصور کی بنیاد ثنویت پر ہے، یعنی خیر و شر کی دو الگ قوتیں تسلیم کی گئی ہیں۔ ''یزداں'' نور اور خیر کا خدا ہے، ''اھرمن'' تاریکی و بدی کا۔ عبادت کی بنیاد آتش پرستی اور آفتاب پرستی پر رکھی گئی کہ روشنی یزدانی صفت کی سب سے بڑی مظہر ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ ایران نے خیر و شر کی کشمکش کی گتھی یوں سلجھائی کہ الوہیت کی قوت دو متقابل خداؤں میں تقسیم کر دی۔

---

[۲] ڈیوڈ کی ارلی بدھ ازم (David's Early Buddhism)

یہودیوں کا تصور تجسیم اور تنزہ کے بین بین تھا اور صفات الٰہی میں غالب عنصر قہر و غضب کا تھا۔ خدا کا گاہ گاہ متشکل ہو کر نمودار ہونا مخاطبات الٰہیہ کا سرتاسر انسانی صفات و جذبات پر مبنی ہونا، قہر و انتقام کی شدت اور ادنیٰ درجے کا تمثیلی اسلوب تورات کے صفحات کا عام تصور ہے۔

مسیحی تصور رحم و محبت کا پیام تھا اور خدا کے لئے باپ کی محبت و شفقت کا تصور پیدا کرنا چاہتا تھا. تجسیم و تنزہ کے لحاظ سے اس نے کوئی قدم آگے نہیں بڑھایا۔ گویا اس کی سطح وہیں تک رہی جہاں تک تورات کا تصور پہنچ چکا تھا۔ لیکن حضرت مسیح کے بعد جب مسیحی عقائد کا رومی اصنام پرستی کے تخیلات سے امتزاج ہوا تو اقالیم ثلاثہ، کفارہ اور مریم پرستی کے عقائد پیدا ہو گئے۔ نزول قرآن کے وقت بحیثیت مجموعی مسیحی تصور ترحم و محبت کے ساتھ کفارہ، تجسیم اور مریم پرستی کا مخلوط تصور تھا۔

ان تصورات کے علاوہ ایک تصور فلاسفہ یونان کا بھی ہے جو اگرچہ مذاہب کے تصورات کی طرح قوموں کا تصور نہ ہو سکا تاہم اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ تقریباً پانچ سو برس قبل از مسیح یونان میں توحید و تنزیہ کا اعتقاد نشو پانے لگا تھا۔ اس کی سب سے بڑی معلم شخصیت سقراط کی حکمت میں نمایاں ہوئی۔ سقراط کے تصور الٰہی کا جب ہم سراغ لگاتے ہیں تو افلاطون کی شہرہ آفاق کتاب جمہوریت (Republic) میں حسب ذیل مکالمہ ملتا ہے[3]۔

---

[3] افلاطون کی جمہوریت مکالمہ کے پیرایہ میں ہے۔ مکالمہ یوں شروع ہوتا ہے کہ ایک عید کے موقع پر سقراط اور گلوکن (Glaucon) سیفالس (Cephalus) کے مکان میں جمع ہوئے۔ سیفالس کا لڑکا پولی مارکس (Polemarchus) اڈمنٹس (Adeimantus) اور نسیر (Niceratus) بھی موجود تھے۔ اثنائے گفتگو میں سوال پیدا ہو گیا کہ عدالت کی حقیقت کیا ہے۔ اس پر پولی مارکس اور بعض حاضرین نے یکے بعد دیگرے عدالت کی تعریف بیان کی لیکن سقراط انہیں رد کرتا رہا۔ پھر عدالت میں سے بات نکلتے ہوئے حکومت و قوانین کی نوعیت تک پہنچ گئی اور یہی کتاب کا اصلی موضوع ہے۔ پوری کتاب دس ابواب میں منقسم ہے۔

اشخاص مکالمہ میں گلوکن اور اڈمنٹس افلاطون کے بھائی ہیں۔ گلوکن کا ذکر خود افلاطون نے اپنے مقالات میں کیا ہے۔ خلفائے عباسیہ کے عہد کے مترجمین نے جمہوریت کا بھی ترجمہ کیا تھا، چنانچہ چھٹی صدی هجری میں ابن رشد نے اس کی شرح لکھی۔ شرح کے دیباچے میں تصریح کی ہے کہ "میں نے ارسطو کی کتاب السیاسۃ کی شرح لکھنی چاہی تھی، لیکن اندلس میں اس کا کوئی نسخہ نہیں ملا، مجبوراً افلاطون کی کتاب شرح کے لیے منتخب کرتا ہوں" ابونصر فارابی نے گو تصریح نہیں کی ہے، لیکن یہ ظاہر ہے کہ "المدینۃ الفاضلۃ" کا تخیل اسے افلاطون کی جمہوریت ہی سے ہوا تھا۔ ابن رشد کی شرح کے عبرانی اور لاطینی تراجم یورپ کے کتب خانوں میں موجود ہیں، لیکن اصل عربی ناپید ہے۔ یورپ کی زبانوں کے موجودہ تراجم براہ راست یونانی سے ہوئے ہیں ہمارے پیش نظر اے۔ ای۔ ٹیلر (A. E. Taylor) کا انگریزی ترجمہ ہے۔

یاد رہے کہ "ری پبلک" کے لیے "جمہوریہ" کا لفظ موجودہ عہد کی اصطلاح نہیں ہے، بلکہ اسی عہد کے مترجمین کے اختیارات میں سے ہے۔

اڈمنٹس نے سوال کیا کہ شعراء کو الوہیت کا ذکر کرتے ہوئے کیا پیرایہ بیان اختیار کرنا چاہیے۔

سقراط: ہر حال میں خدا کی ایسی توصیف کرنی چاہیئے جیسی کہ وہ اپنی ذات میں ہے، خواہ قصصی شعر ہو، خواہ غنائی۔ علاوہ بریں اس میں کوئی شبہ نہیں کہ خدا کی ذات صالح ہے، پس ضروری ہے اس کی صفات بھی صلاح وحق پر مبنی ہوں۔

اڈمنٹس: یہ درست ہے۔

سقراط: اور یہ بھی ظاہر ہے کہ جو وجود صالح ہوگا، اس سے کوئی بات مضر صادر نہیں ہوسکتی اور جو ہستی غیر مضر ہوگی وہ کبھی شر کی صانع نہیں ہوسکتی۔ اسی طرح یہ بات بھی ظاہر ہے کہ جو ذات صالح ہوگی ضروری ہے کہ نافع بھی ہو۔ پس معلوم ہوا کہ خدا صرف خیر کی علت ہے، شر کی علت نہیں ہوسکتا۔

اڈمنٹس: درست ہے۔

سقراط: اور یہیں سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ خدا کا تمام حوادث وافعال کی علت ہونا ممکن نہیں جیسا کہ عام طور پر مشہور ہے۔ بلکہ وہ انسانی حالات کے بہت ہی تھوڑے حصے کی علت ہے، کیونکہ ہم دیکھتے ہیں ہماری برائیاں بھلائیوں سے کہیں زیادہ ہیں اور برائیوں کی علت خدا کی صالح ونافع ہستی نہیں ہوسکتی۔ پس چاہیئے کہ صرف اچھائی ہی کو اس طرف نسبت دیں اور برائی کی علت کسی دوسری جگہ ڈھونڈیں۔

اڈمنٹس: میں محسوس کرتا ہوں کہ یہ امر بالکل واضح ہے۔

سقراط: تو اب ضروری ہوا کہ ہم شعراء کے ایسے خیالات سے متفق نہ ہوں جیسے خیالات ھومر (Homer) کے حسب ذیل اشعار ظاہر کیے گئے ہیں۔ "مشتری[1] کی ڈیوڑھی میں دو پیالے

---

[1] مشتری (Jupiter) یونان کے اصنامی عقائد میں رب الارباب یعنی سب سے بڑا دیوتا تھا۔ ھومر نیایلیڈ میں دیوتاؤں کی جو مجلس آراستہ کی ہے اس میں تخت نشین ہستی مشتری ہی کی ہے۔ اس کی بیوی (Juno) ہوا کی ممثلہ اور ازدواج کی دیبی تھی۔ اپالو (Apollo) روشنی کا دیوتا تھا۔ اتھنا یا منروا (Minerva) حکمت کی دیبی تھی۔ مریخ (Mars) جنگ کا دیوتا تھا۔ زہرہ (Venus) حسن وغرام کی دیبی تھی۔ ھیڈس (Hades) تاریکی اور موت کا دیوتا تھا اور جہنم کا پاسبان یقین کیا جاتا تھا۔ عطارد یا ہرمیس (Hermes) کی نسبت ان کا خیال تھا کہ دیوتاؤں کا پیغام بر ہے۔

رکھے ہیں ایک خیر کا ہے ایک شر کا۔ اور وہی انسان کی بھلائی اور برائی کی تمام تر علت ہیں۔ جس انسان کے حصے میں پیالہ خیر کی شراب آ گئی اس کیلئے تمام تر خیر ہے، جس کے حصے میں شر کا گھونٹ آ گیا، اس کے لئے تمام تر شر ہے۔ اور پھر جس کسی کو دونوں پیالوں کا ملا جلا گھونٹ مل گیا اس کے حصے میں اچھائی بھی آ گئی برائی بھی آ گئی۔[۵]

پھر آگے چل کر تجسیم کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اور اس سے انکار کیا ہے کہ خدا ایک بازی گر اور بہروپیے کی طرح کبھی ایک بھیس میں نمودار ہوتا ہے، کبھی دوسرے بھیس میں۔[۶]

حکماء یونان کے تصور الٰہی کی یہ سب سے بہتر شبیہ ہے جو افلاطون کے قلم سے نکلی ہے۔ یہ خدا کے تشکل سے انکار کرتی ہے اور صفات رد یہ وحسیہ سے بھی ایک منزہ تخیل پیش کرتی ہے۔ لیکن بحیثیت مجموعی صفات حسنہ کا کوئی ارفع و اعلیٰ تصور نہیں رکھتی۔ اور خیر وشر کی گتھی سلجھانے سے یک قلم عاجز ہے۔ اسے مجبوراً یہ اعتقاد پیدا کرنا پڑا کہ حوادث عالم اور افعال انسانی کا غالب حصہ خدا کے دائرہ تصرف سے باہر ہے، کیونکہ دنیا میں غلبہ شر کو ہے نہ کہ خیر کو اور خدا کو شر کا صانع نہیں ہونا چاہئے۔

۵۔ یہ اشعار ایلیڈ (Iliad) کے ہیں۔ سلیمان بستانی نے اپنے عدیم النظیر ترجمۂ عربی میں ان کا ترجمہ حسب ذیل کیا ہے:

فبا عتاب زفس قارورتان
ذی لخیر و ذی لشر الهوان
فیهما کل قسمة الا نسان
فالذی متهما مزیجا انالا
زفس یلقی ،خیر او یلقی و بالا
والذی لا ینال من الشر
فتتابه الخطوب انتیابا
بطواه یطوی البلاد کلیلا
تا ئها فی عرض الفلاة ذلیلا
من بنی الخلد و الوری مخذولا

(الیاذہ نشید ۲۴ ص ۱۱۳۱)

ان اشعار میں ''زفس'' سے مقصود مشتری ہے۔

۶۔ ری پبلک، ترجمہ جیلر، باب دوم

بہر حال چھٹی صدی مسیحی میں دنیا کی خدا پرستانہ زندگی کے تصورات اس حد تک پہنچے تھے کہ قرآن کا نزول ہوا۔

اب غور کرو کہ قرآن کے تصور الٰہی کا کیا حال ہے۔ جب ہم ان تصورات کے مطالعے کے بعد قرآن کے تصور پر نظر ڈالتے ہیں تو صاف نظر آجاتا ہے کہ تصور الٰہی کے تمام عناصر میں اس کی جگہ سب سے الگ اور سب سے بلند ہے۔ اس سلسلے میں حسب ذیل امور قابل غور ہیں۔

اولاً، تجسیم اور تنزیہ کے لحاظ سے قرآن کا تصور تنزیہ کی ایسی تکمیل ہے جس کی کوئی نمود اس وقت دنیا میں موجود نہیں تھی قرآن سے پہلے تنزیہ کا بڑے سے بڑا مرتبہ جس کا ذہن انسانی متحمل ہو سکا تھا، یہ تھا کہ اصنام پرستی کی جگہ ایک ان دیکھے خدا کی پرستش کی جائے، لیکن جہاں تک صفات الٰہی کا تعلق ہے انسانی اوصاف وجذبات کی مشابہت اور جسم وہیئت کے تمثل سے کوئی تصور بھی خالی نہ تھا۔ یہودی تصور جس نے اصنام پرستی کی کوئی شکل بھی جائز نہیں رکھی تھی، اس کے شبہ وتمثل سے یک سر آلودہ ہے۔ حضرت ابراہیم کا خدا کو ممرے کے بلوطوں میں دیکھنا، خدا کا حضرت یعقوب سے کشتی لڑنا، مصر سے خروج کے وقت بدلی اور آگ کا ستون بن کر رہنمائی کرنا، کوہ طور پر شعلوں کے اندر نمودار ہونا، حضرت موسیٰ کا خدا کو پیچھے سے دیکھنا، خدا کا جوش غضب میں آکر کوئی کام کر بیٹھنا اور پھر پچھتانا، بنی اسرائیل کو اپنی چہیتی بیوی بنالینا اور پھر اس کی بد چلنی پر ماتم کرنا، ھیکل کی تباہی پر اسکا نوحہ، اس کی انتڑیوں میں درد کا اٹھنا اور کلیجے میں سوراخ پڑ جانا تورات کا عام اسلوب بیان ہے۔

اصل یہ ہے کہ قرآن سے پہلے فکر انسانی اس درجہ بلند نہیں ہوا تھا کہ تمثیل کا پردہ ہٹا کر صفات الٰہی کا جلوہ دیکھ لیتا۔ اس لئے ہر تصور کی بنیاد تمام تر تمثیل وتشبیہ ہی پر رکھنی پڑی۔

مثلاً تورات میں ہم دیکھتے ہیں کہ ایک طرف زبور کے ترانوں اور امثال سلیمان میں خدا کے لئے شائستہ صفات کا تخیل موجود ہے، لیکن دوسری طرف خدا کا کوئی مخاطبہ ایسا نہیں جو سرتاسر انسانی اوصاف وجذبات کی شبیہ سے مملو نہ ہو۔ حضرت مسیح نے جب چاہا کہ رحمت الٰہی کا عالم گیر تصور پیدا کریں تو وہ بھی مجبور ہوئے کہ خدا کے لئے باپ کی تشبیہ سے کام لیں اسی تشبیہ

سے ظاہر پرستوں نے ٹھوکر کھائی اور ابنیت مسیح کا عقیدہ پیدا کر لیا۔

لیکن ان تمام تصورات کے بعد جب ہم قرآن کی طرف رخ کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا اچانک فکر و تصور کی ایک بالکل نئی دنیا سامنے آ گئی۔ یہاں تمثیل و تشبیہ کے تمام پردے بیک دفعہ اٹھ جاتے ہیں، انسانی اوصاف و جذبات کی مشابہت مفقود ہو جاتی ہے۔ ہر گوشے میں مجاز کی جگہ حقیقت کا جلوہ نمایاں ہو جاتا ہے اور تجسیم کا شائبہ تک باقی نہیں رہتا۔ تنزیہ اس مرتبہ کمال تک پہنچ جاتی ہے کہ:

لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ (۴۲:۱۱) اس کے مثل کوئی شے نہیں، کسی چیز سے بھی تم اسے مشابہ نہیں ٹھہرا سکتے۔

لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ ۝ (۶:۱۰۳)

انسان کی نگاہیں اسے نہیں پا سکتیں، لیکن وہ انسان کو دیکھ رہا ہے، وہ بڑا ہی باریک بین اور آگاہ ہے۔

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ ۝ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝ (۱۱۲:۴)

اللہ کی ذات یگانہ ہے، بے نیاز ہے، اسے کسی کی احتیاج نہیں، نہ تو اس سے کوئی پیدا ہوا، نہ وہ کسی سے پیدا ہوا اور نہ کوئی ہستی اس کے درجے اور برابری کی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن کا اسلوب بیان اس تمثیلی اسلوب سے بالکل مختلف ہے جو تورات و انجیل وغیرھا میں پایا جاتا ہے۔ وہ ہر موقع پر تمثیل و مجاز کی جگہ حقیقت کا تصور پیدا کرنا چاہتا ہے اور تشبیہ کی جگہ تنزیہ کے اعتقاد پر زور دیتا ہے وہ نہ تو خدا کی ہستی کو مادے کی طرح اجسام و اشکال کی اصل قرار دیتا ہے، نہ تورات کی طرح شوہر کی تشبیہ اختیار کرتا ہے، نہ انجیل کی طرح باپ کے رشتے سے مشابہت پیدا کرتا ہے۔ بلکہ براہ راست ایک خالق اور مالک ہستی کا تصور پیدا کرتا ہے اور پھر اس کی ربوبیت و رحمت و صفات کاملہ و حسنہ کا ایک مکمل نقشہ کھینچ دیتا ہے۔ یہ گویا اس تعلیم کا سب سے اعلیٰ سبق تھا۔ پچھلے دوروں میں نوع انسانی کی ذہنی استعداد اس درجہ

شائستہ نہیں ہوئی تھی کہ تمثیلوں کے بغیر حقیقت کا تصور پیدا کر سکتی، لامحالہ پیرایہ تعلیم بھی تمام تر تشبیہ ومجاز پر مبنی ہوتا تھا۔ لیکن جب تعلیم اپنے درجہ کمال تک پہنچ گئی تو تمثیلوں کی ضرورت باقی نہ رہی۔ ضروری ہو گیا کہ اب حقیقت براہ راست اپنا جلوہ دکھلا دے!

تورات اور قرآن کے جو مقامات مشترک ہیں دقت نظر کے ساتھ ان کا مطالعہ کرو، تورات میں جہاں کہیں خدا کی براہ راست نمود کا ذکر کیا گیا ہے قرآن وہاں خدا کی تجلی کا ذکر کرتا ہے۔ تورات میں جہاں یہ پاؤ گے کہ خدا متشکل ہو کر اترا، قرآن اس موقع کی یوں تعبیر کرے گا کہ خدا کا فرشتہ متشکل ہو کر نمودار ہوا۔ بطور مثال کے صرف ایک مقام پر نظر ڈالی جائے۔ تورات میں ہے:

خداوند نے کہا: اے موسیٰ! دیکھ یہ جگہ میرے پاس ہے، تو اس چٹان پر کھڑا رہ اور یوں ہوگا کہ جب میرے جلال کا گزر ہوگا تو میں تجھے اس چٹان کی دراڑ میں رکھوں گا اور جب تک نہ گزر لوں گا، تجھے اپنی ہتھیلی سے ڈھانپے رہوں گا۔ پھر ایسا ہوگا کہ میں ہتھیلی اٹھالوں گا اور تو میرا پیچھا دیکھ لے گا، لیکن تو میرا چہرہ نہیں دیکھ سکتا (خروج ۳۳:۲۰)

تب خداوند بدلی کے ستون میں ہو کر اترا اور خیمے کے دروازے پر کھڑا رہا۔۔ اس نے کہا: ''میرا بندہ موسیٰ اپنے خداوند کی شبیہ دیکھے گا'' (گنتی ۱۲:۵) اس معاملے کی تعبیر قرآن نے یوں کی ہے۔

قَالَ رَبِّ اَرِنِیْٓ اَنْظُرْ اِلَیْکَ۔ قَالَ لَنْ تَرٰىنِیْ وَلٰکِنِ انْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ (۷:۱۴۳)

موسیٰ نے کہا: اے پروردگار! مجھے اپنا جلوہ دکھا تاکہ میں تیری طرف نگاہ کر سکوں فرمایا: نہیں، تو کبھی نہیں دیکھے گا۔ لیکن ہاں! اس پہاڑ کی طرف دیکھ۔

البتہ یاد رہے کہ تنزیہ اور تعطیل میں فرق ہے۔ تنزیہ سے مقصود یہ ہے کہ جہاں تک عقل بشری کی پہنچ ہے صفات الٰہی کو مخلوقات کی مشابہت سے پاک اور بلند رکھا جائے۔ تعطیل کے معنی یہ ہیں کہ تنزیہ کے منع ونفی کو اس حد تک پہنچا دیا جائے کہ فکر انسانی کے تصور کے لئے کوئی بات باقی ہی نہ رہے۔ قرآن کا تصور تنزیہ کی تکمیل ہے، تعطیل کی ابتدا نہیں ہے۔

اگر خدا کے تصور کے لیے صفات و اعمال کی کوئی ایسی صورت باقی ہی نہ رہے جس کا فکر انسانی ادراک کر سکتی ہے تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ تنزیہ کے معنی نفی وجود کے ہو جائیں گے۔ مثلاً اگر کہا جائے کہ خدا کے لئے کوئی صفت نہیں قرار دی جا سکتی، اس لئے کہ جو صفت بھی قرار دی جائے گی اس میں مخلوقات کے اوصاف سے مشابہت پیدا ہو جائے گی تو ظاہر ہے کہ عقل انسانی کسی ایسی ذات کا تصور ہی نہیں کر سکتی، یا مثلاً اگر نفی مماثلت میں اس درجہ غلو کیا جائے کہ خدا کی ہستی اثبات کی جگہ سر تا سر نفی ہو جائے تو عقل انسانی کے لئے بجز اس کے کیا رہ جائے گا کہ وجود کی جگہ عدم کا تصور کرے۔ پس قرآن نے تنزیہ کا جو مرتبہ قرار دیا ہے وہ یہ ہے کہ فرداً فرداً تمام صفات و افعال کا اثبات کرتا ہے، مگر ساتھ ہی اصلاً مماثلت کی نفی بھی کر دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے: خدا خوبی و جمال کی تمام صفتوں سے متصف ہے۔ وہ زندہ ہے، قادر ہے، پرورش کنندہ ہے، رحیم ہے، سننے والا ہے، دیکھنے والا ہے، سب کچھ جاننے والا ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ انسان کی بول چال میں قدرت و اختیار اور ارادہ و فعل کی جتنی شائستہ تعبیرات ہیں انہیں بھی بلا تامل استعمال کرتا ہے۔ مثلاً کہتا ہے: خدا کے ہاتھ کشادہ ہیں "بَلْ يَدٰهُ مَبْسُوْطَتٰنِ" (۵:۶۴) اس کے تخت حکومت کے تصرف سے کوئی گوشہ باہر نہیں "وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ" (۲:۲۵۵) وہ اپنے عرش جلال پر متمکن ہے "اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى" (۲۰:۵) لیکن ساتھ ہی یہ واضح کر دیتا ہے کہ جتنی چیزیں کائنات ہستی میں موجود ہیں یا جتنی چیزوں کا بھی تم تصور کر سکتے ہو ان میں سے کوئی چیز نہیں جو اس کے مثل ہو "لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ" (۴۲:۱۱) تمہاری نگاہ اسے پا ہی نہیں سکتی "لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ" (۶:۱۰۳) پس ظاہر ہے کہ اس کا زندہ ہونا ہمارے زندہ ہونے کی طرح نہیں ہو سکتا، اس کی ربوبیت ہماری ربوبیت کی سی نہیں ہو سکتی، اس کا جاننا، دیکھنا سننا ویسا نہیں ہو سکتا جیسا ہمارا جاننا، دیکھنا اور سننا ہے۔ اس کی قدرت و بخشش کا ہاتھ اور کبریائی و جلال کا عرش ضرور ہے، لیکن یقیناً ان کا مطلب وہ نہیں ہو سکتا جو ان الفاظ سے ہمارے ذہن میں متشکل ہو جاتا ہے۔ اسلامی فرقوں میں سے جہمیہ اور باطنیہ نے جو صفات کی نفی کی تھی تو وہ اسی غلطی کے مرتکب

ہوئے تھے۔ وہ تنزیہ اور تعطیل میں فرق نہ کر سکے۔ [ے]

ثانیاً، تنزیہ کی طرح صفات رحمت و جمال کے لحاظ سے بھی قرآن کے تصور پر نظر ڈالی جائے تو اس کی شان تکمیل نمایاں ہے۔ نزول قرآن کے وقت یہودی تصور میں قہر و غضب کا عنصر غالب تھا۔ مجوسی تصور نے نور و ظلمت کی دو مساویانہ قوتیں الگ الگ بنالی تھیں۔ مسیحی تصور نے رحم و محبت پر زور دیا، عدالت پر اس کی نظر نہیں پڑی۔ گویا جہاں تک رحمت و جمال کا تعلق ہے یا قہر و غضب کا عنصر غالب تھا یا مساوی تھا، یا پھر رحمت و محبت آئی تھی تو اس طرح آئی تھی کہ عدالت کے لئے کوئی جگہ باقی نہیں رہتی ہے۔

لیکن قرآن نے ایک طرف تو رحمت و جمال کا ایسا کامل تصور پیدا کر دیا کہ قہر و غضب کے لئے کوئی جگہ نہ رہی، دوسری طرف جزا و سزا کا سررشتہ بھی ہاتھ سے نہیں دیا۔ کیونکہ جزا و سزا کا اعتقاد قہر وغضب کی بناء پر نہیں، بلکہ عدالت کی بناء پر قائم کر دیا۔ چنانچہ صفات الٰہی کے بارے میں اس کا عام اعلان یہ ہے۔

قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ۔ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى (۱۷:۱۱۰) اے پیغمبر! ان سے کہہ دو تم خدا کو اللہ کے نام سے پکارو یا رحمٰن کہہ کر پکارو ، جس صفت سے بھی پکارو اس کی ساری صفتیں حسن و خوبی کی صفتیں ہیں

یعنی خدا کی تمام صفتوں کو ''اسماء حسنیٰ'' قرار دیتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ خدا کی کوئی صفت نہیں جو حسن و خوبی کی صفت نہ ہو۔ یہ صفتیں کیا کیا ہیں؟ قرآن نے پوری وسعت کے ساتھ انہیں جا بجا بیان کیا ہے۔ ان میں ایسی صفتیں بھی ہیں جو قہر و جلال کی صفتیں ہیں، مثلاً جبار، قہار ، لیکن قرآن کہتا ہے وہ بھی ''اسماء حسنیٰ'' ہیں۔ کیونکہ ان میں عدالت الٰہی کا ظہور ہے اور عدالت حسن و خوبی ہے، خوں خواری و خوفناکی نہیں ہے۔ چنانچہ سورہ حشر میں صفات رحمت و جلال کے ساتھ قہر و جلال کا بھی ذکر کیا ہے اور پھر متصلاً سب کو ''اسماء حسنیٰ'' قرار دیا ہے:

ے مسئلہ صفات میں محدثین و سلفیہ کا متکلمین سے اختلاف بھی دراصل اسی اصل پر مبنی تھا یہ بات نہ تھی کہ وہ تجسیم کی طرف مائل تھے جیسا کہ ان کے متعصب مخالفوں نے مشہور کیا۔ متاخرین میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے اس مسئلے پر نہایت دقت نظر کے ساتھ بحث کی ہے۔ ان کے شاگرد امام ابن قیم کی ''اجتماع جیوش اسلامیہ'' بھی اسی موضوع پر ہے اور اس باب میں کفایت کرتی ہے

هُوَاللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ۔ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَO هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى يُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُO (۵۹: ۲۳۔۲۴)

وہ اللہ ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ الملک ہے، القدوس ہے، السلام ہے، المومن ہے، المہیمن ہے، العزیز ہے، الجبار ہے، المتکبر ہے اور اس ساجھے سے پاک ہے جو لوگوں نے اس کی معبودیت میں بنا رکھے ہیں وہ الخالق ہے، الباری ہے، المصور ہے، (غرض کہ) اس کے لئے حسن وخوبی کی صفتیں ہیں۔ آسمان وزمین میں جتنی بھی مخلوقات ہیں سب اس کی پاکی اور عظمت کی شہادت دے رہی ہیں اور بلاشبہ وہی ہے جو حکمت کے ساتھ غلبہ و توانائی بھی رکھنے والا ہے۔

اسی طرح سورہ اعراف میں ہے:

وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا وَذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِیْٓ اَسْمَآئِهٖ [۵] (۷: ۱۸۰)

اور اللہ کے لئے حسن وخوبی کی صفتیں ہیں سو چاہیے کہ ان صفتوں سے اسے پکارو۔ اور جن لوگوں کا شیوہ یہ ہے کہ اس کی صفتوں میں کج اندیشیاں کرتے ہیں سو انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو۔

چنانچہ اسی لئے سورہ فاتحہ میں صرف تین صفتیں نمایاں ہوئیں: ربوبیت، رحمت اور عدالت، اور قہر وغضب کی کسی صفت کو یہاں جگہ نہیں دی گئی۔ اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کا تصور الٰہی سرتا سر رحمت وجمال کا تصور ہے۔ قہر وخوف ناکی کی اس میں کوئی گنجائش نہیں۔

---

[۵] اس آیت میں ''الحاد فی الاسماء'' سے مقصود کیا ہے؟ ''الحاد'' لحد سے ہے، ''لحد'' کے معنی ''میلان عن الوسط'' کے ہیں یعنی درمیان سے کسی ایک طرف کو ہٹا ہوا ہونا۔ ایسی قبر کو جس میں نعش کی جگہ ایک طرف کو ہٹی ہوئی ہوتی ہے لحد کہتے ہیں۔ جب یہ لفظ انسانی افعال کے لیے بولا جاتا ہے تو اس کے معنی راہ حق سے ہٹ جانے کے ہوتے ہیں۔ کیونکہ ''وسط'' حق ہے اور جو اس سے منحرف ہو باطل ہے۔ الحد فلان ای مال عن الحق. پس یہاں الحاد فی الاسماء کا مطلب یہ ہوا کہ خدا کی صفات کے بارے میں جو راہ حق ہے اس سے منحرف ہو جانا۔ امام راغب اصفہانی نے اس کی تشریح حسب ذیل لفظوں میں کی ہے:
" ان یوصف بما لا یصح وصفه به او ان یتاول اوصافه علی مالا یلیق به" (مفردات۔ ص۔۴۶۴)
یعنی خدا کے لیے کوئی ایسا وصف قرار دینا جو اس کا وصف نہیں ہونا چاہیے یا اس کی صفتوں کا ایسا مطلب ٹھہرانا جو اس کی شان کے لائق نہیں۔

ثالثاً، جہاں تک توحید واشراک کا تعلق ہے قرآن کا تصور اس درجہ کامل اور بے لچک ہے کہ اس کی کوئی نظیر پچھلے تصورات میں نہیں مل سکتی۔

اگر خدا اپنی ذات میں یگانہ ہے تو ضروری ہے کہ وہ اپنی صفات میں بھی یگانہ ہو، کیونکہ اس کی یگانگت کی عظمت قائم نہیں رہ سکتی اگر دوسری ہستی اس کے صفات میں شریک وسہیم مان لی جائے۔ قرآن سے پہلے توحید کے ایجابی پہلو پر تو تمام مذاہب نے زور دیا تھا لیکن سلبی پہلو نمایاں نہ ہو سکا تھا۔ ایجابی پہلو یہ ہے خدا ایک ہے، سلبی یہ ہے کہ اس کی طرح کوئی نہیں اور جب اس کی طرح کوئی نہیں تو ضروری ہے کہ جو صفتیں اس کے لئے ٹھہرا دی گئی ہیں ان میں کوئی دوسری ہستی شریک نہ ہو۔ پہلی بات توحید فی الذات سے دوسری توحید فی الصفات سے تعبیر کی گئی ہے۔ قرآن سے پہلے فکر انسانی کی استعداد اس درجہ بلند نہیں ہوئی تھی کہ توحید فی الصفات کی نزاکتوں اور بندشوں کی متحمل ہو سکتی، اس لئے مذاہب نے تمام تر زور توحید فی الذات ہی پر دیا، توحید فی الصفات اپنی ابتدائی اور سادہ حالت میں چھوڑ دی گئی۔

چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں باوجودیکہ تمام مذاہب قبل از قرآن میں عقیدہ توحید کی تعلیم موجود تھی، لیکن کسی نہ کسی صورت میں شخصیت پرستی، عظمت پرستی اور اصنام پرستی نمودار ہوتی رہی اور رہنمایان مذاہب اس کا دروازہ بند نہ کر سکے۔ ہندوستان میں تو غالباً اول دن ہی سے یہ بات تسلیم کر لی گئی تھی کہ عوام کی تشفی کے لئے دیوتاؤں اور انسانی عظمتوں کی پرستاری ناگزیر ہے۔ اور اس لئے توحید کا مقام صرف خواص کے لئے مخصوص ہونا چاہیے۔ فلاسفہ یونان کا بھی یہی خیال تھا۔ یقیناً وہ اس بات سے بے خبر نہ تھے کہ کوہ اولیمپس کے دیوتاؤں کی کوئی اصلیت نہیں۔ تاہم سقراط کے علاوہ کسی نے بھی اس کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ عوام کے اصنامی عقائد میں خلل انداز ہو۔ وہ کہتے تھے: اگر دیوتاؤں کی پرستش کا نظام قائم نہ رہا تو عوام کی مذہبی زندگی درہم برہم ہو جائے گی''۔ فیثا غورث کی نسبت بیان کیا گیا ہے کہ جب اس نے اپنا مشہور حسابی قاعدہ معلوم کیا تھا تو اس کے شکرانے میں سو بچھڑوں کی قربانی دیوتاؤں کے نذر کی تھی۔ اس بارے میں سب سے زیادہ نازک معاملہ معلم ورہنما کی شخصیت کا تھا۔ یہ ظاہر ہے

کہ کوئی تعلیم عظمت و رفعت حاصل نہیں کر سکتی جب تک معلم کی شخصیت میں بھی عظمت کی شان پیدا نہ ہو جائے۔ لیکن شخصیت کی عظمت کے حدود کیا ہیں؟ یہیں آ کر سب کے قدموں نے ٹھوکر کھائی۔ وہ اس کی ٹھیک ٹھیک حد بندی نہ کر سکے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ کبھی شخصیت کو خدا کا اوتار بنا لیا، کبھی ابن اللہ سمجھ لیا، کبھی شریک و سہیم ٹھہرا دیا۔ اور اگر یہ نہیں کیا تو کم از کم اس کی تعظیم میں بندگی و نیاز کی سی شان پیدا کر دی۔ یہودیوں نے اپنے ابتدائی عہد کی گمراہیوں کے بعد کبھی ایسا نہیں کیا کہ پتھر کے بت تراش کر ان کی پوجا کی ہو۔ لیکن اس بات سے وہ بھی نہ بچ سکے کہ اپنے نبیوں کی قبروں پر ہیکل تعمیر کر کے انہیں عبادت گاہوں کی سی شان و تقدیس دے دیتے تھے۔ گوتم بدھ کی نسبت معلوم ہے کہ اس کی تعلیم میں اصنام پرستی کے لئے کوئی جگہ نہ تھی۔ اس کی آخری وصیت جو ہم تک پہنچی ہے یہ ہے: ''ایسا نہ کرنا کہ میری نعش کی راکھ کی پوجا شروع کر دو۔ اگر تم نے ایسا کیا تو یقین کرو نجات کی راہ تم پر بند ہو جائے گی''[9] لیکن اس وصیت پر جیسا کچھ عمل کیا گیا وہ دنیا کے سامنے ہے۔ نہ صرف بدھ کی خاک اور یادگاروں پر معبد تعمیر کئے گئے، بلکہ مذہب کی اشاعت کا ذریعہ ہی یہ سمجھا گیا کہ اس کے مجسموں سے زمین کا کوئی گوشہ خالی نہ رہے۔ یہ واقعہ ہے کہ دنیا میں کسی معبود کے اتنے مجسمے نہیں بنائے گئے جتنے گوتم بدھ کے بنائے گئے ہیں۔ حد ہو گئی کہ فارسی زبان میں بدھ (بت) کا لفظ ہی صنم کے معنوں میں بولا جانے لگا۔ اسی طرح ہمیں معلوم ہے کہ مسیحیت کی حقیقی تعلیم سرتا سر توحید کی تعلیم تھی، لیکن ابھی اس کے ظہور پر پورے سو برس بھی نہیں گزر رہے تھے کہ الوہیت مسیح کا عقیدہ نشو و نما پا چکا تھا۔

لیکن قرآن نے توحید فی الصفات کا ایسا کامل نقشہ کھینچ دیا کہ اس طرح کی لغزشوں کے تمام دروازے بند ہو گئے۔ اس نے توحید ہی پر زور نہیں دیا، بلکہ شرک کی بھی راہیں مسدود کر دیں اور یہی اس باب میں اس کی خصوصیت ہے۔

---

[9] ارلی بدھ ازم (Early Buddhism)

وہ کہتا ہے: ہر طرح کی عبادت اور نیاز کی مستحق صرف خدا ہی کی ذات ہے۔ پس اگر تم نے عابدانہ عجز و نیاز کے ساتھ کسی دوسری ہستی کے سامنے سر جھکایا تو توحید الٰہی کا اعتقاد باقی نہ رہا۔
وہ کہتا ہے:

یہ اسی کی ذات ہے جو انسانوں کی پکار سنتی ہے اور ان کی دعائیں قبول کرتی ہے۔ پس اگر تم نے اپنی دعاؤں اور طلب گاریوں میں کسی دوسری ہستی کو بھی شریک کر لیا تو گویا تم نے اسے خدا کی خدائی میں شریک کر لیا۔ وہ کہتا ہے:

دعا و استعانت، رکوع و سجود، عجز و نیاز، اعتماد و توکل اور اس طرح کے تمام عبادت گزارانہ اور نیاز مندانہ اعمال وہ اعمال ہیں جو خدا اور اس کے بندوں کا باہمی رشتہ قائم کرتے ہیں پس اگر ان اعمال میں تم نے کسی دوسری ہستی کو بھی شریک کر لیا تو خدا کے رشتہ معبودیت کی یگانگی باقی نہ رہی اسی طرح عظمتوں، کبریاؤں، کارسازیوں اور بے نیازیوں کا جو اعتقاد تمہارے اندر خدا کی ہستی کا تصور پیدا کرتا ہے وہ صرف خدا ہی کے لئے مخصوص ہونا چاہئے۔ اگر تم نے ویسا ہی اعتقاد کسی دوسری ہستی کے لئے بھی پیدا کر لیا تو تم نے اسے خدا کا شریک ٹھہرا لیا اور توحید کا اعتقاد درہم برہم ہو گیا۔

یہی وجہ ہے کہ سورہ فاتحہ میں "اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ" کی تلقین کی گئی۔ اس میں اول تو عبادت کے ساتھ استعانت کا بھی ذکر کیا گیا۔ پھر دونوں جگہ مفعول کو مقدم کیا جو مفید اختصاص ہے، یعنی صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور صرف تجھی سے مدد طلب کرتے ہیں۔
اس کے علاوہ تمام قرآن میں اس کثرت کے ساتھ توحید فی الصفات اور رد اشراک پر زور دیا گیا ہے کہ شاید ہی کوئی سورت بلکہ کوئی صفحہ اس سے خالی ہو۔

سب سے زیادہ اہم مسئلہ مقام نبوت کی حد بندی کا تھا، یعنی معلم کی شخصیت کو اس کی اصلی جگہ میں محدود کر دینا، تاکہ شخصیت پرستی کا ہمیشہ کے لئے سد باب ہو جائے۔ اس بارے میں قرآن نے صاف اور قطعی لفظوں میں جا بجا پیغمبر اسلام کی بشریت اور بندگی پر زور دیا ہے محتاج بیان نہیں۔ ہم یہاں صرف ایک بات کی طرف توجہ دلائیں گے۔ اسلام نے اپنی تعلیم کا بنیادی کلمہ

جو قرار دیا ہے وہ سب کو معلوم ہے: "اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ" یعنی میں اقرار کرتا ہوں کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں اقرار کرتا ہوں کہ محمد (ﷺ) خدا کے بندے اور رسول ہیں۔ اس اقرار میں جس طرح خدا کی توحید کا اعتراف کیا گیا ہے ٹھیک اسی طرح پیغمبر اسلام کی بندگی اور درجہ رسالت کا بھی اعتراف ہے۔ غور کرنا چاہئے کہ ایسا کیوں کیا گیا۔ صرف اس لئے کہ پیغمبر اسلام کی بندگی اور درجہ رسالت کا اعتقاد اسلام کی اصل واساس بن جائے اور اس کا کوئی موقع باقی نہ رہے کہ عبدیت کی جگہ معبودیت کا اور رسالت کی جگہ اوتار کا تخیل پیدا ہو۔ ظاہر ہے کہ اس سے زیادہ اس معاملے کا تحفظ کیا کیا جاسکتا تھا۔ کوئی شخص دائرہ اسلام میں داخل ہی نہیں ہوسکتا جب کہ وہ خدا کی توحید کی طرح پیغمبر اسلام کی بندگی کا بھی اقرار نہ کرلے۔

یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں پیغمبر اسلام (ﷺ) کی وفات کے بعد مسلمانوں میں بہت سے اختلافات پیدا ہوئے لیکن ان کی شخصیت کے بارے میں کوئی سوال پیدا نہیں ہوا۔ ابھی ان کی وفات پر چند گھنٹے بھی نہیں گزرے تھے کہ حضرت ابوبکرؓ نے برسر منبر اعلان کردیا تھا:

من كان منكم يعبد محمدا فان محمدا قد مات، ومن كان منكم يعبد الله فان الله حي لا يموت (بخاری) جو کوئی تم میں محمد (ﷺ) کی پرستش کرتا تھا سو اسے معلوم ہونا چاہئے کہ محمد نے وفات پائی۔ اور جو کوئی تم میں سے اللہ کی پرستش کرتا تھا تو اسے معلوم ہونا چاہئے کہ اللہ کی ذات ہمیشہ زندہ ہے، اس کے لئے موت نہیں۔

رابعاً۔ قرآن سے پہلے علوم وفنون کی طرح مذہبی عقائد میں خاص وعام کا امتیاز ملحوظ رکھا جاتا تھا اور خیال کیا جاتا تھا کہ خدا کا تصور تو حقیقی ہے اور خواص کے لئے ہے۔ ایک تصور عملی ہے اور عوام کے لئے ہے۔ چنانچہ ہندوستان میں خداشناسی کے تین درجے قرار دیئے گئے تھے۔ عوام کے لئے دیوتاؤں کی پرستش، خواص کے لئے براہ راست خدا کی پرستش، اخص الخواص کے لئے وحدۃ الوجود کا مشاہدہ۔ یہی حال فلاسفہ یونان کا تھا۔ وہ خیال کرتے تھے کہ ایک غیر مرئی اور غیر مجسم خدا کا تصور صرف اہل علم وحکمت ہی کرسکتے ہیں۔ عوام کے لئے اسی میں امن ہے

کہ دیوتاؤں کی پرستاری میں مشغول رہیں۔

لیکن قرآن نے حقیقت وعمل یا خاص وعام کا کوئی امتیاز باقی نہ رکھا۔ اس نے سب کو خدا پرستی کی ایک ہی راہ دکھائی اور سب کے لئے صفات الٰہی کا ایک ہی تصور پیدا کیا۔ وہ حکماء وعرفاء سے لے کر جہال واعوام تک سب کو حقیقت کا ایک ہی جلوہ دکھاتا ہے اور سب پر اعتقاد وایمان کا ایک ہی دروازہ کھولتا ہے۔ اس کا تصور جس طرح ایک حکیم وعارف کے لئے سرمایہ تفکر ہے، اسی طرح ایک چرواہے اور دھقان کے لئے سرمایہ تسکین۔

خامساً، قرآن نے تصور الٰہی کی بنیاد نوع انسانی کے عالم گیر وجدانی احساس پر رکھی ہے۔ یہ نہیں کیا ہے کہ اسے نظر وفکر کی کاوشوں کا ایک معمہ بنا دیا ہو جسے کسی خاص گروہ اور طبقے کا ذہن ہی حل کر سکے۔ انسان کا عالمگیر وجدانی احساس کیا ہے؟ یہ ہے کہ کائنات ہستی خود بخود پیدا نہیں ہوگئی، پیدا کی گئی ہے اور اس لئے ضروری ہے کہ ایک صانع ہستی موجود ہو۔ پس قرآن بھی اس بارے میں جو کچھ بتلاتا ہے صرف اتنا ہی ہے۔ وہ نہ تو توحید وجودی کا ذکر کرتا ہے نہ توحید شہودی کا۔[1] وہ صرف ایک خالق کائنات ہستی کا ذکر کرتا ہے جو خوبی وکمال کی تمام صفتوں سے متصف اور نقص وزوال کی تمام باتوں سے منزہ ہے اور اس سے زیادہ فکر انسانی پر کوئی بوجھ نہیں ڈالتا۔

---

[1] توحیدی وجود سے مقصود "وحدۃ الوجود" کا عقیدہ ہے، یعنی خدا کی ہستی کے سوا کوئی ہستی وجود نہیں رکھتی۔ وجود ایک ہی ہے، باقی جو کچھ ہے تعینات کا فریب ہے۔

مگو کہ کثرت اشیا نقیض وحدت ہست
تو در حقیقت اشیا نظر فگن ہمہ اوست

توحید شہودی یہ ہے کہ موجودات خلقت کو بحیثیت موجودات تسلیم کرتے ہیں، لیکن کہتے ہیں جب انہیں وجود الٰہی کی نمود میں دیکھا جاتا ہے تو ان کی ہستی یک قلم ناپید ہو جاتی ہے۔ اس لیے نہیں کہ وہ غیر موجود ہیں، اس لیے کہ سورج نکل آیا اور اس کی سلطان تجلی میں ستارے ناپید ہو گئے۔

فلما استبان الصبح ادرج ضوؤہ
باسفارہ لضواء نور الکواکب

سادساً، جس ترتیب کے ساتھ سورہ فاتحہ میں یہ تینوں صفتیں بیان کی گئی ہیں دراصل فکر انسانی کی طلب و معرفت کی قدرتی منزلیں ہیں، اور اگر غور کیا جائے تو اسی ترتیب سے پیش آتی ہیں۔ سب سے پہلے ربوبیت کا ذکر کیا گیا، کیونکہ کائنات ہستی میں سب سے زیادہ ظاہر نمود اسی صفت کی ہے اور ہر موجود کو سب سے زیادہ اسی کی احتیاج ہے۔ ربوبیت کے بعد رحمت کا ذکر کیا گیا، کیونکہ اس کی حقیقت بمقابلہ ربوبیت کے مطالعہ و تفکر کی محتاج ہے اور ربوبیت کے مشاہدات سے جب نظر آگے بڑھتی ہے تب رحمت کا جلوہ نمودار ہوتا ہے۔ رحمت کے بعد عدالت کی صفت بیان کی گئی ہے، کیونکہ یہ اس سفر کی آخری منزل ہے۔ رحمت کے مشاہدات سے جب نظر آگے بڑھتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہاں عدالت کی بھی نمود ہر جگہ موجود ہے اور اس لئے موجود ہے کہ ربوبیت اور رحمت کا مقتضٰی یہی ہے۔

۶۷۔ ''کنگ فوزی'' فارسی تلفظ ہے، صحیح چینی تلفظ ''کونگ۔فو۔ی'' ہے۔ ایرانیوں نے اسے زیادہ صحت کے ساتھ نقل کیا، یعنی صرف اتنی تبدیلی کی کہ ''فوسی'' کو ''فوزی'' کردیا۔ لیکن یورپ کی زبانوں نے اسے یک قلم مسخ کرکے کنفوشس (Confucius) بنادیا اور اس کی آواز اصل آواز سے اس درجہ مختلف ہوگئی کہ ایک چینی سن کر حیران رہ جاتا ہے کہ یہ کس چیز کا نام ہے اور کس ملک کی بولی ہے۔

۶۸۔ سنسکرت میں ''شمن'' زاہد اور تارک الدنیا کو کہتے ہیں۔ بدھ مذہب کے تارک الدنیا بھکشو اس لقب سے پکارے جاتے تھے۔ رفتہ رفتہ تمام پیروان بدھ کو ''شمنی'' کہنے لگے اس شمنی کو عربوں نے ''سمنی'' بنالیا اور وسط ایشیا کے باشندوں نے ''شامانی'' چنانچہ زکریا رازی، البیرونی اور ابن الندیم وغیرہم نے بدھ مذہب کا ذکر سمنیہ ہی کے نام سے کیا البیرونی بدھ مذہب کی عالم گیر اشاعت کی تاریخ کی خبر رکھتا تھا۔ چنانچہ کتاب الہند کی پہلی فصل میں اس طرف اشارات کیے ہیں۔

چنگیز خان کی نسبت یہ تصریح ملتی ہے کہ وہ شامانی مذہب کا پیرو تھا۔ یعنی بدھ مذہب کا۔ چونکہ شامانی اور بدھ مذہب کا ترادف واضح نہیں ہوا تھا اس لئے انیسویں صدی کے بعض یورپی

مورخوں کو طرح طرح کی غلط فہمیاں ہوئیں اور اس کا صحیح مفہوم متعین نہ کر سکے۔ یہ غلط فہمی یورپ کے اہل قلم میں آج بھی موجود ہے۔ شالی سائبیریا اور چینی ترکستان کے ہمسایہ علاقوں کے تورانی قبائل اپنے مذہبی پیشواؤں کو (جو تبت کے لاماؤں کی طرح ملکی پیشوائی بھی رکھتے ہیں) ''شامان'' کہتے ہیں۔ سویت روس کی حکومت آج کل ان کی تعلیم و تربیت کا سروسامان کر رہی ہے۔ یہ لوگ بھی بلا شبہ بدھ مذہب کے پیرو ہیں، لیکن ان کا بدھ مذہب منگولیوں کے محرف مذہب کی بھی مسخ شدہ صورت ہے، اس لئے اصلیت کی بہت کم جھلک باقی رہ گئی ہے اور اسی لئے ان کی مذہبی اصلیت کے بارے میں آج کل کے مصنف حیرانی ظاہر کر رہے ہیں۔ انگیریزی میں انہیں تورانی قبائل کے مذہب کی نسبت شے منزم (Shamanism) کی ترکیب رائج ہو گئی ہے اور جادوگری کے اعمال و اثرات کو (Shamanism) اور (Shamanistic) وغیرہ سے تعبیر کرنے لگے ہیں۔ یہ ''شیمن'' بھی وہی ''شامانی'' اور ''شمنی'' ہی کی ایک محرف صورت ہے۔ چونکہ ان قبائل میں جادوگری کا اعتقاد عام ہے اور وہ اپنے شامانوں سے بیماری میں جادو کے ٹوٹکے کراتے ہیں، اس لئے جادوگری کے لئے یہ لفظ مستعمل ہو گیا ہے۔

۶۹ے رگ وید۔ حصہ سوم، ص ۹۰۹

۷۰ے رب الارباب تصور سے مقصود تصور کی وہ نوعیت ہے جب خیال کیا جاتا ہے کہ بہت سے خداؤں میں ایک خدا سب سے بڑا ہے اور چھوٹے خداؤں کو اس کے ماتحت رہنا پڑتا ہے، جیسا کہ یونانیوں کا عقیدہ مشتری کی نسبت تھا۔

۷۱ے رگ وید اور اپنشد کے مطالب کے لئے ہم نے حسب ذیل مصادر سے مدد لی ہے

Max-Muller: دی ویدک ہیمز The Vedic Hymns

Bloomfield: دی رلیجن آف دی وید The Religion of the ved

Kaegi: دی رگ وید The Rig Veb

Ghate: لیکچرز آن دی رگ وید Lectures on the Rigved

Deussen: دی فلاسفی آف دی اپنشدس The Philosophy of the Upnishads

Hume: دی تھرٹین پرنسپل اپنشدس The Thirteen Principal Upnishads

۲؎ ہمارے صوفیائے کرام نے اسی صورت حال کو یوں تعبیر کیا ہے کہ ''احدیت ، نے مرتبہ ''واحدیت'' کی تجلی میں نزول کیا۔''احدیت'' یعنی یگانہ ہونا، ''واحدیت'' یعنی اول ہونا۔ یگانہ ہستی کو ہم اول نہیں کہہ سکتے، کیونکہ اول جبھی ہوگا جب دوسرا، تیسرا اور چوتھا بھی ہو، اور یگانگی بحث کے مرتبے میں دوسرے اور تیسرے کی گنجائش ہی نہیں۔ لیکن جب ''احدیت'' نے ''واحدیت'' کے مرتبے میں نزول کیا تو اب ''ھوالاول'' کا مرتبہ ظہور میں آ گیا۔ اور جب اول ہوتو دوسرے، تیسرے اور چوتھے کے تعینات بھی ظہور میں آنے لگے۔ وما املح قول الشاعر العارف

دریای کہن چو بر زند موجہ تو
موجش خوانند و فی الحقیقت دریاست

۳؎ پروفیسر اس۔ رادھا کرشنن، انڈین فلاسفی (Indian Philosophy) جلد اول صفحہ ۱۴۴۔ طبع ثانی

۴؎ اگر اپنشد کی اشراکی تِلک کے دوسرے صریح شواہد موجود نہ ہوتے تو اس طرح کی تصریحات بہ آسانی مجازات پر محمول کی جاسکتی تھیں، چنانچہ دارا شکوہ نے انہیں استعارات ہی پر محمول کیا ہے۔ یہ بات پیش نظر رکھنی چاہئے کہ اپنشد ایک سو ساٹھ ہیں اور مختلف عہدوں میں مرتب ہوئے ہیں۔ ہر اپنشد اپنے عہد کے تدریجی تصورات ومباحث کے اثرات پیش کرتا ہے اور یہاں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ ان نتائج پر مبنی ہے جو مجموعی حیثیت سے نکالے گئے ہیں۔

۵؎ ویدانت پاری جات۔ سور بھ، جلد سوم صفحہ ۲۵۔

اس کا انگریزی ترجمہ مترجمہ ڈاکٹر روما بوس (Dr.Roma Bose) رائل ایشیا سوسائٹی بنگال نے حال میں شائع کیا ہے۔

۶؎ البیرونی نے کتاب الہند میں بعض سنسکرت کتابوں سے بتوں کے بنانے کے احکام وقواعد نقل

کیے ہیں۔اس کے بعد لکھتا ہے:

" وکان الغرض فی حکایۃ ھذالھذ یان ان تعرف الصورۃ من صنمھا اذا شوھد ۔ ولیتحقق ما قلنا من ان ھذہ الا صنام منصوبۃ العوام الذین سفلت مراتبھم و قصرت معارفھم ۔ فما عمل صنم قط باسم من علا المادۃ فضلا عن اللہ تعالی ۔ ولیعرف کیف یعبد السفل بالتمویھات، ولذ لک قیل فی کتاب "گیتا" ان کثیرا من الناس یتقربون فی مبا غیھم الی بغیری ویتوسلون بالصدقات والتسبیح والصلاۃ لسوای فاقویھم علیھا واو فقھم لھا واوصلھم الی ارادا تھم لاستغنائی عنھم " (صفحہ ۹۳، ۹۴)

آج کل کے تمام ہندو اہل نظر جو ہندو عقائد و تصورات کی فلسفیانہ تعبیر کرنی چاہتے ہیں عموماً یہی توجیہ پیش کرتے ہیں جو البیرونی نے پیش کی تھی۔ ابوالفضل اور دارا شکوہ نے بھی یہی خیال ظاہر کیا ہے۔

۷۷ پروفیسر اس۔ رادھا کرشنن: انڈین فلاسفی، جلد اول ۴۵۳۔ طبع ثانی

۷۸ یہ قدیم کتاب جس کا صرف تبتی نسخہ دنیا کے علم میں آیا تھا، اب اصل سنسکرت میں نکل آئی ہے اور گائیکواڑ اورینٹل سیریز کے ادارے نے حال میں شائع کر دی ہے۔ میسور کا مشرقی کتب خانہ بھی اس کا ایک دوسرا نسخہ اشاعت کے لئے مرتب کر رہا ہے۔

۷۹ ''نیائے، یعنی منطق۔ ''ویشیشیک'' طریق نظر سے مقصود منطقی نقد و تحلیل کا ایک خاص مسلک ہے۔

۸۰ گوتم بدھ کی تعلیم میں ''اشٹانگ مارگ'' یعنی آٹھ باتوں کا طریقہ ایک بنیادی اصل ہے۔ آٹھ باتوں سے مقصود علم اور عمل کا تزکیہ و طہارت ہے۔ علم حق، رحم و شفقت، قربانی، ہوا و ہوس سے آزادی، خودی کو مٹانا وغیرہ۔

۸۱ میں تسلیم کرتا ہوں کہ یہ میرا ذاتی استنباط ہے اور مجھے حق نہیں کہ اپنی رائے کو وثوق کے ساتھ ان محققوں کے مقابلے میں پیش کروں جنہوں نے اس موضوع کے مطالعے میں زندگیاں بسر کر

دی ہیں۔ تاہم میں مجبور ہوں کہ اپنی محدود معلومات کی روشنی میں جن نتائج تک پہنچا ہوں ان سے دست بردار نہ ہوں۔ یورپ کے محققوں نے بدھ مذہب کے مصادر کی جستجو وفراہمی میں بڑی کدوکاوش کی ہے اور پالی زبان کے تمام اہم مصادر فرنچ یا انگریزی میں منتقل کر لئے ہیں۔ میں نے حتی الامکان اس تمام مواد کے مطالعے کی کوشش کی اور بالآخر اسی نتیجہ تک پہنچا۔

۸۲ ''ایران'' وہی لفظ ہے جو ہندوستان میں ''آریا'' ہو گیا ہے۔
اوستا میں چوبیس ملکوں کی پیدائش کا ذکر کیا گیا ہے جس میں سب سے پہلا اور سب سے بہتر ''ایریاناویج'' (Airyana Vej) ہے اور غالباً اس سے شمالی ایران مقصود ہے (وندیداد، فرگرہ اول، فقرہ ۲) ھرمزویشت کے فقرہ ۲۱ میں بھی ایریاناویج کا ذکر کیا ہے اور اس پر درود بھیجا ہے۔ ''ویج'' جرمن مستشرق اشپیگل Spiegel کی قراءت ہے، آنک تیل (Anquetil) نے اسے ویگو پڑھا تھا۔ ''ویج'' یا ''ویگو'' کے معنی پہلوی میں مبارک کے ہیں، یعنی مبارک ایریانا کی سرزمین۔

۸۳ عہد عتیق میں یشعیا نبی کی طرف جو کتاب منسوب ہے اس کی زبان اور مطالب کا آیت ۵۱ تک ایک خاص انداز ہے اور پھر اس کے بعد بالکل دوسرا ہو جاتا ہے۔ ابتدائی حصہ ایک ایسے شخص کا کلام معلوم ہوتا ہے جو قید بابل سے پہلے تھا، لیکن بعد کے حصے میں قید بابل کے زمانے کے اثرات صاف صاف نمایاں ہیں۔ اس لئے انیسویں صدی کے نقادوں نے اسے دو شخصوں کے کلام میں تقسیم کر دیا۔ ایک کو یشعیا اولا اور دوسرے کو دوم سے تعبیر کرتے ہیں۔

۸۴ اسی لئے ہندو تصور نے ماں کی تشبیہ سے کام لیا، کیونکہ ماں کی تشبیہ میں اگرچہ انسانیت آجاتی ہے، لیکن تشبیہ باپ سے بھی زیادہ پر اثر ہو جاتی ہے۔ باپ کی شفقت کبھی کبھی جواب دے دے گی، لیکن ماں کی محبت کی گہرائیوں کے لئے کوئی تھاہ نہیں۔

۸۵ ''ناؤس'' جس کا ''تلفظ ناوز'' کیا جاتا ہے عربی کے ''نفس سے اس درجہ صوتی مشابہت رکھتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے ''ناوز'' تعریب کا جامہ پہن کر ''نفس ہو گیا۔ اسی طرح نوئٹک (Noetic) اور ''ناطق اس درجہ قریب ہیں کہ دوسرے کو پہلے کی تعریف سمجھا جاسکتا ہے۔

چنانچہ رینان اور ڈوزی نے نفس ناطقہ کو ''نوئٹک ناوز'' کا معرب قرار دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں: یہ ''ناطق'' نطق سے نہیں ہے بلکہ ''نوئٹک کی تعریب ہے جس کے معنی ادراک کے ہیں۔ بعض عربی مصادر سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ اصل یونانی الفاظ پیش نظر رکھے گئے تھے۔ ''نفس'' عربی لغت میں ذات اور خود کے معنی میں بولا جاتا تھا اور ارسطو نے عاقلانہ نطق کو انسان کی فصل قرار دیا تھا۔ اس لئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عرب مترجموں نے یونانی تعبیر سامنے رکھ کر نفس ناطقہ کی ترکیب کر لی اور یہ تعریب خود عربی الفاظ کے مدلول سے بھی ملتی جلتی ہوئی بن گئی۔

۸۶ جمہوریت کے اشخاص مکالمہ میں اڈمنٹس (Adeimantus) اور گلوکن (Glaucon) افلاطون کے بھائی ہیں۔ چنانچہ افلاطون نے خود ایک جگہ اس کی تصریح کی ہے۔

افلاطون کی دوسری مصنفات کے ساتھ جمہوریت کا ترجمہ بھی عربی میں ہو گیا تھا۔ چنانچہ چھٹی صدی ہجری میں ابن رشد نے اس کی شرح لکھی۔ شرح کے دیباچہ میں لکھتا ہے کہ میں نے ارسطو کی ''کتاب السیاستہ'' کی شرح لکھنی چاہی تھی مگر اندلس میں اس کا کوئی نسخہ نہیں ملا، مجبوراً افلاطون کی کتاب اختیار کرنی پڑی۔ ابن رشد کی شرح کے عبرانی اور لاطینی تراجم یورپ میں موجود ہیں مگر اصل عربی ناپید ہے، یورپ کے موجودہ تراجم براہ راست یونانی سے ہوئے ہیں ہمارے پیش نظر اے۔ ٹیلر (Taylor) اور بی۔ جوویٹ (Jowett) کے انگریزی تراجم ہیں۔

۸۷ مشتری یعنی زیوس (Zeus) یونان کے اصنامی عقائد میں رب الارباب یعنی دیوتاؤں میں سب سے بڑا حکمران دیوتا تھا۔ ھومر (Homer) نے ایلیڈ (Iliad) دیوتاؤں کی جو مجلس آراستہ کی ہے اس میں تخت نشین ہستی مشتری ہی کی ہے۔

۸۸ یہ اشعار ایلیڈ کے ہیں۔ سلیمان بستانی نے اپنے بے نظیر ترجمہ عربی میں ان کا ترجمہ حسب ذیل شعروں میں کیا ہے۔

فبا عتاب زفس قارورتان
ذی لخیر و ذی لشر الھوان

فیهما کل قسمة الا نسان
فالذی متهما مزیجا انالا
زفس یلقی ،خیر او یلقی و بالا
والذی لا ینال من الشر
فتنتابه الخطوب انتیابا
بطواه یطوی البلاد کلیلا
تا ئها فی عرض الفلاة ذلیلا
من بنی الخلد و الوری مخذولا

الیاذۃ نشید ۲۴ ص ۱۱۳۱، مطبوعہ الہلال، مصر ۱۹۰۴ء

ان اشعار میں ''زفس'' یونانی ''زیوس'' کی تعریب ہے۔

۸۹ دی ری پبلک، ترجمہ ٹیلر، باب ۲

۹۰ Stephen Mackenna جلد ۲ صفحہ ۱۳۴

۹۱ ایضاً

۹۲ ایضاً

۹۳ ایضاً جلد اول صفحہ ۱۱۸ مذہب افلاطون جدید افلاطون کی طرف اس لئے منسوب ہوا کہ اس کی بنیاد بعض افلاطونی مبادیات پر رکھی گئی تھی، مگر پھر اپنی بحث ونظر میں اس نے جو راہ اختیار کی اور جن نتائج تک پہنچا انہیں افلاطون سے کوئی تعلق نہیں۔ لیکن عرب فلاسفہ کا ایک بڑا طبقہ اس غلط فہمی میں پڑ گیا کہ فی الحقیقت یہ افلاطون ہی کا مذہب ہے۔ اس مذہب کے بعض فلسفیوں مثلاً فور یوس نے ارسطو کی شرح کرتے ہوئے اس کے مذہب میں جو اضافے کئے تھے، اسے بھی عرب حکماء اصل سے ممتاز نہ کر سکے۔ چنانچہ ابو نصر فارابی نے ''الجمع بین الرایین'' میں ارسطو کا جو مذہب ظاہر کیا ہے اس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔ ابن رشد پہلا عرب فلسفی ہے جس نے غلط فہمی محسوس کی اور ارسطو کے مذہب کو شارحوں کے اضافے سے خالص کر کے دیکھنا چاہا۔

سنہ ۵۲۹م جب شہنشاہ جسٹینین (Justinian) کے حکم سے اسکندریہ کے فلاسفہ جلاوطن کیے گئے تو ان میں سے بعض نے ایران میں پناہ لی۔ چنانچہ سمپلیسیس (Simplicius) اور ڈیماسیس (Damasess) خسرو کے دربار میں معزز جگہ رکھتے تھے۔ ان فلاسفہ کی وجہ سے پہلوی زبان بھی مذہب افلاطون جدید سے آشنا ہوگئی اور ایرانی حکماء نے اسے قومی رنگ دینے کے لئے زردشت اور جاماسپ کی طرف منسوب کر دیا۔ عربی میں جب پہلوی ادبیات منتقل ہوئیں تو یہ فلسفیانہ مقالات بھی ترجمہ ہوئے اور عام طور یہ خیال پیدا ہو گیا کہ یہ زردشت اور جاماسپ کا ایک پراسرار فلسفہ ہے۔ چنانچہ شیخ شہاب الدین نے ''حکمۃ الاشراق'' میں اور شیرازی نے اس کی شرح میں دونوں غلطیاں جمع کر دی ہیں۔ وہ مذہب افلاطون جدید کو افلاطون کا مذہب سمجھتے ہیں اور زردشت اور جاماسپ کا بھی حوالہ دیتے ہیں۔

۹۴ ''وھواللطیف الخبیر'' کا ترجمہ چھوٹ گیا تھا جو قوسین میں لکھ دیا گیا۔م

۹۵ ''نیتی'' یعنی کلمہ نفی۔ وہ ایسا بھی نہیں ہے، ایسا بھی نہیں ہے۔ برھدرنیاک اپنشد میں یہ نفی دور تک چلی گئی ہے۔ وہ کثیف ہے؟ نہیں۔ وہ لطیف ہے؟ نہیں۔ وہ کوتاہ ہے؟ نہیں۔ وہ دراز ہے؟ نہیں۔ غرضیکہ ہر مشابہت کے جواب میں ''نہیں'' دہرایا جاتا ہے۔ نہ وہ ایسا ہے نہ وہ ویسا ہے، نہ یہ ہے نہ وہ ہے۔

اے بروں از وھم وقال و قیل من
خاک بر فرق و تمثیل من

۹۶ یقیناً تمہارا پروردگار تمہیں گھات لگائے تاک رہا ہے۔

۹۷ اور جب میرا بندہ تجھ سے میری نسبت سوال کرتا ہے تو اس سے کہہ دے کہ میں اس سے دور کب ہوں؟ میں تو بالکل اس کے پاس ہوں۔

[اور جب وہ پکارنے والا مجھے پکارتا ہے تو میں اس کی پکار سنتا ہوں۔][1]

---

[1] ترجمہ چھوٹ گیا تھا جو قوسین میں لکھ دیا گیا ہے

۹۸ تفویض کے مسلک سے مقصود یہ ہے کہ جو حقائق ہمارے دائرہ علم و ادراک سے باہر ہیں ان میں ردوکد اور باریک بینی نہ کرنا اور اپنے عجز و نارسائی کا اعتراف کر لینا۔

۹۹ شنکر بھاشیا: ۲ اور چھندوگیہ اپنشد قسم۔۸۔

۱۰۰ اس آیت میں "الحادفی الاسماء" سے مقصود کیا ہے؟ الحاد "لحد" سے ہے، لحد کے معنی "میلان عن الوسط" کے ہیں، یعنی درمیان سے کسی ایک طرف کو ہٹا ہوا ہونا۔ اسی لئے ایسی قبر کو جس میں نعش کی جگہ ایک طرف کو ہٹی ہوئی ہوتی ہے "لحد" کہتے ہیں۔ جب یہ لفظ انسانی افعال کے لئے بولا جاتا ہے تو اس کے معنی راہ حق سے ہٹ جانے کے ہوتے ہیں۔ کیونکہ وسط حق ہے اور جو اس سے منحرف ہو باطل ہے۔ الحد فلان، ای مال عن الحق۔ پس یہاں الحادالاسماء کا مطلب یہ ہوا کہ خدا کی صفات کے بارے میں جو راہ حق ہے اس سے منحرف ہو جانا امام راغب اصفہانی نے اس کی تشریح حسب ذیل لفظوں میں ادا کی ہے۔ **ان یوصف بما لا یصح وصفه به، او ان یتاول اوصافه علی مالا یلیق به** "(مفرادت ۴۶۴) یعنی خدا کے لئے کوئی ایسا وصف قرار دینا جو اس کا وصف نہیں ہونا چاہئے یا اس کی صفتوں کا ایسا مطلب ٹھہرانا جو اس کی شان کے لائق نہیں۔

۱۰۱ ارلی بدھ ازم (Early Buddhism)

۱۰۲ باب مرض النبی و وفاتہ۔م

۱۰۳ گرشیم کے قانون سے مقصود اقتصادیات کی یہ اصل ہے کہ اگر کھرے سکوں کے ساتھ کھوٹے سکے ملا دیے جائیں گے تو کھرے سکوں کی قیمت باقی نہیں رہے گی۔

۱۰۴ پروفیسر ایس۔ رادھا کرشنن، انڈین فلاسفی، جلد اول صفحہ ۱۱۹، طبع ثانی

۱۰۵ پہلے ایڈیشن ص ۱۲۶ میں یہ عبارت " اگر اس نے..........اور فیصلہ کن ہوتا" موجود نہیں ہے۔

۱۰۶ یاد رہے کہ عربی میں قلب اور فواد کے معنی محض اس عضو ہی کے نہیں ہیں جسے اردو میں دل کہتے ہیں، بلکہ اس کا اطلاق عقل و فکر پر بھی ہوتا ہے۔ قرآن میں جہاں کہیں سمع و بصر وغیرہ کے ساتھ

قلب اور فواد کہا گیا ہے اس سے مقصود جوہر عقل ہے۔

۱۰۷ پہلے ایڈیشن میں قوسین میں یہ جملے زیادہ ہیں (پس جو کوئی سیدھی راہ چلے گا، اس کے لئے دونوں جگہ کامیابی ہے اور جو منحرف ہوگا اس کے لئے دونوں جگہ نامرادی)

۱۰۸ پہلے ایڈیشن میں ص ۱۲۷ پر قوسین میں یہ عبارت زیادہ ہے (پس تمہاری مذہبی گروہ بندیوں کی ملتوں کی میں کیوں پیروی کر سکتا ہوں! میری راہ تمہاری خود ساختہ ملتوں کی راہ نہیں ہے اللہ کی عالمگیر ہدایت کی راہ ہے)(م)

۱۰۹ پہلے ایڈیشن میں ص ۱۳۰ پر قوسین میں یہ عبارت زیادہ ہے (یعنی ہمارے قوانین کی رو سے وہی آبادی ہلاک ہوتی ہے جو ظلم و فساد میں غرق ہو جاتی ہے اور ہدایت الٰہی سے انکار کرتی ہے)(م)

۱۱۰ پہلے ایڈیشن میں ''قل'' کا ترجمہ چھوٹ گیا تھا جو قوسین میں لکھ دیا گیا ہے(م)

۱۱۱ سابقہ دونوں ایڈیشنوں میں یہ لفظ چھوٹ گیا تھا۔ حدیث ابن مسعود جو اسی صفحے میں درج ہے، اس سے اضافہ کیا گیا ہے(م)

۱۱۲ پہلے ایڈیشن میں یہ الفاظ زائد ہیں۔ یعنی خدا پرستی اور نیک عملی (م)

۱۱۳ پہلے ایڈیشن ص ۱۶۹ میں یہ فقرہ نہیں ہے۔ (م)

❁..❁..❁
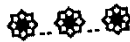
اشاریہ اسماء اشخاص وقبائل